شجرہ نسب خاندانِ اقبالؒ

عبدالرحمان — محمد رمضان

محمد حیات — احمد — عائشہ بی بی (م) — بیگم (م)

سراج دین (م) — تاج دین (م) — حاکم بی (م) — زینب (م) — احمد دین (م) — حیات (م)

اللہ دتہ (لاولد) — تین لڑکیاں (م) — عطا محمد — فاطمہ بی

فضل الٰہی — فضل حق (م)

برکت بی بی — اکبری بیگم — اعجاز احمد — امتیاز احمد — مختار احمد — عنائت بیگم — وسیمہ بیگم

آفتاب اقبال

شبنم اقبال — آزاد اقبال — وقار اقبال (ف) — نوید اقبال

یاسمین اقبال — ثانیہ اقبال — جہاد اقبال — جیہان اقبال — جہانگیر اقبال — فرح اقبال

بابا لول حاج (پندرہویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہوئے)

نا معلوم پشتوں کے بعد

شیخ اکبر

دو یا تین پشتوں کے بعد

جمال دین
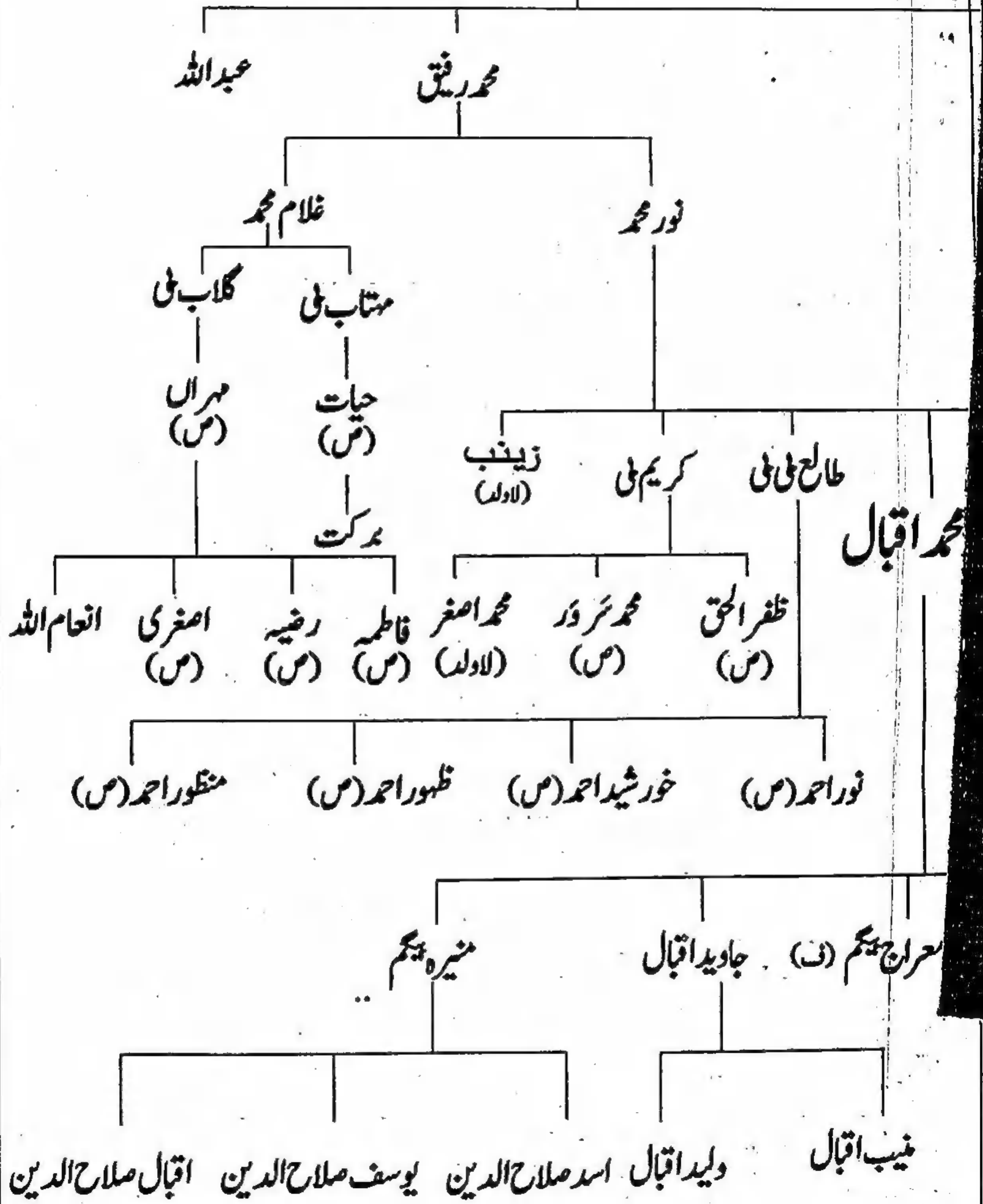
عبداللہ — محمد رفیق

محمد رفیق: غلام محمد — نور محمد

غلام محمد: گلاب بی بی — مہتاب بی بی

مہتاب بی بی: حیات (ص)
حیات: برکت

گلاب بی بی: مہراں (ص)

مہراں: انعام اللہ — اصغری (ص) — رضیہ (ص) — فاطمہ (ص)

نور محمد: زینب (لاولد) — کریم بی بی — طالع بی بی — محمد اقبال

کریم بی بی: محمد اصغر (لاولد) — محمد سرور (ص) — ظفر الحق (ص)

طالع بی بی: منظور احمد (ص) — ظہور احمد (ص) — خورشید احمد (ص) — نور احمد (ص)

محمد اقبال: منیرہ بیگم — جاوید اقبال — معراج بیگم (ف)

جاوید اقبال: ولید اقبال — منیب اقبال

منیرہ بیگم: اقبال صلاح الدین — یوسف صلاح الدین — اسد صلاح الدین

بیگم آفتاب اقبال

علامہ اقبال
اور ان کے
فرزند اکبر آفتاب اقبال

مصنفہ

رشیدہ بیگم (بڑی بہو علامہ اقبال)

انتساب

آزاد اقبال اور ڈاکٹر نوید اقبال کے نام

جن کی علمیت، شرافت اور جذبہ ایثار و اطاعت شاہد ہے کہ ان کے دادا علامہ اقبالؒ کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے

نام کتاب : علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال

بہ اہتمام : فیروز سنز پرنٹرز (پرائیوٹ) لمیٹڈ کراچی

اشاعت : اگست 1999ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : -/350 روپے

تقسیم کنندگان : (1) بیگم آفتاب اقبال۔ 33 ٹیپو سلطان، ماڈرن ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی

(2) ماسٹر محمد اکرام۔ مکان نمبر 209، نشتر چوک لیاقت اشرف کالونی نمبر1 محمود آباد۔ کراچی44۔

(3) چوہدری ریاست علی لائبریرین ۔ سیرت سٹڈی سینٹر خیابان اقبال۔ سیالکوٹ چھاؤنی

(4) وحیدہ روشن دارالقرآن ٹرسٹ

G-96، علامہ اقبال روڈ (گلی تکیہ سناراں) لاہور۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے

In The Name Of Allah
The Merciful
The Compassionate

دیباچہ

میرے ایک دوست نے جو مولانا ابوالکلام آزاد پر دو درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں، اپنی کتاب کے بارے میں میری رائے جاننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا تو میں نے عرض کیا: مولانا آزاد نے اگر کچھ سیاسی غلطیاں کی تھیں تو ان کی "سزا" انہیں اسی دنیا میں مل گئی کہ آپ نے ان پر دو درجن کتابیں لکھ دیں۔ یہ تو خیر ایک لطیفہ ہے مگر میں کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان ہوجاتا ہوں کہ اقبال کے حوالے سے جو ہزاروں کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اور آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں ان میں ایسی کتابیں کتنی ہیں جو ہمارے لئے اقبال کی شخصیت اور کمالات سے آگاہی کا وسیلہ بنتی ہیں؟ بمشکل 25۔30 کتابیں ایسی ہوں گی جو اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں ہماری معاون ہوسکیں، باقی سارا ذخیرہ ضائع بھی ہوجائے تو اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؟ سوائے ان اداروں اور افراد کے جو اقبال کا نام کاروباری مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اس مایوس کن صورتحال میں اگر کوئی ایسی کتاب نظر آجائے جس میں اقبال کے بارے میں دو چار نئی باتیں مل جائیں تو خوشی ہوتی ہے۔ کہ لکھنے والے نے

ہماری معلومات میں کچھ تو اضافہ کیا۔ زیر نظر کتاب بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے لیکن اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو معروف معتوں میں کسی مخصوص ترتیب و تنظیم کی حامل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کا نام کتاب کے تمام مطالب کا احاطہ نہیں کرتا کیونکہ یہ کتاب صرف آفتاب اقبال کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس میں متعدد ایسے موضوعات پر بھی لکھا گیا ہے جو ضمنی یا اضافی نوعیت کے ہیں۔ یہ مباحث اس کتاب میں شامل ہونے کی بجائے کسی الگ کتاب کی صورت میں شائع کر دیئے جاتے تو بھی بقیہ مطالب کتاب کی اہمیت کم نہ ہوتی۔ ترتیب و تنظیم کی اس مخصوص نوعیت کی وجہ یہ ہے کہ کتاب ایک ایسی شخصیت نے لکھی ہے جسے مصنفہ ہونے کا دعوی نہیں ہے۔ اور اس مقصد کے تحت لکھی ہے کہ بعض ایسے "حقائق" کو بیان کیا جائے جس سے عام لوگ تو کیا، اقبال شناس بھی آگاہ نہیں ہیں۔ یہ سارا لوازمہ اگر کسی تجربہ کار مصنف کی دسترس میں ہوتا تو ظاہر ہے کتاب کی وہ صورت نہ ہوتی جو اب نظر آتی ہے۔ نیز زبان و بیان کے معاملے میں صورت حال مختلف ہوتی ۔ بہرحال یہ باتیں ضمنی نوعیت کی ہیں، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا کہا گیا ہے نہ کہ کس پیرائے میں کہا گیا ہے۔

کسی بھی بڑی شخصیت کو خصوصاً بڑے شاعر کو سمجھنے کے لئے اس کی ذاتی زندگی کے ایک ایک پہلو کا نظر میں رہنا ضروری ہے تاکہ ان حالات سے آگاہی حاصل ہوسکے جن میں شاعر نے زندگی بسر کی۔ اقبال کے سوانح نگاروں اور بعض اہل قلم نے اقبال اور انکے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کو سمجھنے میں جو کوتاہیاں کی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلے میں ہر طرح کی افواہوں کو حقائق، کا درجہ دے دیا گیا۔

بیگم آفتاب اقبال نے انہیں افواہوں کے رد میں یہ کتاب لکھی ہے اور باپ

بیٹے کے تعلقات کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ اگر دونوں کے درمیان کوئی رنجش تھی بھی تو اس کی نشاندہی کرتے ہوئے تمام حالات کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اس قسم کی رنجشوں کا پایا جانا ہماری معاشرتی زندگی کے معمولات میں سے ہے اور ان سے غیر حقیقی نتائج اخذ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بعض اہل قلم نے اصل حقائق سے ناواقفیت کی وجہ سے رائی کا پہاڑ بنا کر باپ بیٹے کے تعلقات کو افسانہ وافسوں کی قبیل کی چیز بنا دیا ہے۔ اب بیگم آفتاب اقبال کے بیانات کی روشنی میں ہمیں اس معاملے کو ازسرنو دیکھنا ہوگا۔ بیگم صاحبہ نے اقبال کے خاندان کے سلسلے میں جو نئی معلومات پیش کی ہیں وہ اقبال کے خاندان میں ایک عمر گزارنے کا حاصل ہے۔ یہ وہ معلومات ہیں جو انہوں نے اہل خاندان سے حاصل کیں اور انہیں ایک عمر تک حافظے میں محفوظ رکھنے کے بعد صفحہ قرطاس پر منتقل کیا اور اس طرح ان قیمتی معلومات کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔

بیگم صاحبہ نے اپنی یادوں کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ کتاب کے کئی حصے آپ بیتی کی صورت اختیار کر گئے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کتاب کو آپ بیتی سمجھ کر ہی پڑھا جائے بیگم صاحبہ نے اپنے خاندان کے جو حالات لکھے ہیں وہ دراصل ان کی آپ بیتی ہی کا حصہ ہیں انہوں نے بعض ایسے افراد کا احوال سپرد قلم کیا ہے جو بوجوہ اہمیت رکھتے ہیں۔

بیگم صاحبہ نے اپنے بیٹے آزاد اقبال کے بارے میں بھی ایک باب لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی تیسری نسل بھی شعروادب کا اعلیٰ ذوق رکھتی ہے۔ آزاد اقبال کی شاعری کے جو نمونے اس باب میں پیش کئے گئے ہیں، ان میں ”بانگ درا“ کی نظموں کے انداز واسلوب کو باآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال کی اولاد میں شاعری کی وراثت صرف ان کے پوتے آزاد اقبال ہی کو ملی ہے۔

اس کتاب میں اقبال اور ان کے خاندان سے متعلق کچھ نوادر بھی شامل ہیں۔

کچھ تصویریں ہیں اور کچھ تحریریں ان میں سے بیشتر تصویریں اور تحریریں پہلی مرتبہ اسی کتاب میں شائع ہورہی ہیں۔ ان نوادرات کی شمولیت سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

ہمیں بیگم آفتاب اقبال کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک بے حد دلچسپ اور معلوماتی کتاب لکھی۔

مشفق خواجہ

پیش لفظ

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

اقبالیات ایک ایسا موضوع ہے جس میں جگہ پانا اعزاز کی بات ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تاہم جتنا لکھا گیا ہے اس سے زیادہ کی گنجائش اور ضرورت موجود ہے۔ اگر ہم اقبالیات کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو اس کی صورت یہ بنتی ہے کہ ایک حصہ ان کے فکر و فن اور فلسفے پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حصہ ان کے خاندانی پس منظر اور ذاتی حالات و واقعات سے متعلق ہے۔ دوسرے عنوان کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ شخصیتیں فضا میں نہیں بنتیں، نہ وہ ماحول سے کٹ کر نشو و نما پاتی ہیں، عبقری دل و دماغ قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں مگر انہیں جلا بخشنے، نکھارنے اور لائن پر چلانے کے لئے ماحول کا بڑا دخل ہے، کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں ہم اس کے گھریلو ماحول کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے والد شیخ نور محمد، والدہ امام بی بی اور ان کے استاد مولوی سید میر حسن کا جو حصہ ہے اس کا اعتراف نہ کرنا خود اقبال کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اسی طرح ان کی بلند شخصیت میں ان کے باقی خاندان کا بھی اپنا کردار ہے۔ سید نذیر نیازی، م ش، فقیر سید وحید الدین اور ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کے خاندان اساتذہ ان کے معمولات، مشاغل، عادات و اطوار اور شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ مگر یہ موضوع ابھی خاصا تشنہ ہے، انتہائی مسرت کی بات ہے کہ علامہ اقبال کی بہو بیگم رشیدہ اقبال صاحبہ نے علامہ کے بڑے صاحبزادے اور اپنے شریک حیات بیرسٹر آفتاب اقبال صاحب کے حوالے سے علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال کے نام سے انتہائی خوبصورت اور معلوماتی کتاب ترتیب دی ہے۔ ظاہر ہے کہ گھر کا ایک ایسا فرد جو بغیر کسی واسطے کے علامہ سے منسلک ہے سے

زیادہ وقیع اور صحیح معلومات اور کس کے پاس ہوں گی۔ صاحب البیت ادری بما فیھا ہمارے نزدیک بیگم صاحبہ کی یہ کتاب اقبالیات کے دوسرے عنوان پر یقیناً اہم ترین دستاویز ہے۔

اے گل بتو خورسندم کہ تو بوئے کسے داری

اقبال کے فکر و فلسفے پر تو شاید مدتوں خامہ فرسائی ہوتی رہے گی اس کی وجہ ہے کہ علامہ کا پیغام اتنا آفاقی اور ہمہ گیر ہے کہ بلا لحاظ مسلک و ملت ہر شخص اس کے اندر اپنی حیات نو اور اپنی امیدوں، آرزوؤں اور آدرشوں کی جھلک محسوس کرتا ہے۔ بلاشبہ اقبال مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور اسلام کے دور جدید کے سفیر ہیں مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ زندگی جرات، تپش، سوز دروں، ہلچل اور جدوجہد کے ایک ایسے منفرد مبلغ ہیں کہ ایک آدھ مثال چھوڑ کر شاعری کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نظیری اور بیدل کے ہاں جزوی طور پر یہ اجزاء پائے جاتے ہیں مگر ان کا علامہ سے کیا موازنہ ہو سکتا ہے جو سر تا پا قوموں کو آگے بڑھنے، زندہ رہنے اور انہیں قیادت اور پیشوائی کے اسرار و رموز سکھانے والے دانائے راز ہیں۔

ہر مفکر اور شاعر اپنے دور کی ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہوتا ہے جبکہ اقبال خود زمانہ گر ہیں "زمانہ با تو نسازد تو بہ زمانہ ستیز" اور "نئے صبح و شام" کے پیامبر ہیں ان کا نظریہ یہ ہے۔

مسلمانے کہ داند رمز دیں را
نساید پیش غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بکام او نہ گردد
بکام خود بہ گرداند زمیں را

ان کی ذہنی بلندیوں اور فکری رسائیوں کے سامنے یہ کرہ ارض انتہائی معمولی اور حقیر ہے ان کی جولانگاہ ہفت افلاک سے بھی آگے ہے ان کی علو ہمت کی ترجمانی کی۔

عربی شاعر نے نہایت عمدگی سے کی ہے۔

له صمیم لا منتهی لکبارها
وہمته الصغری اجل من الدهر

انہوں نے خود کئی مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے مثلاً

در دشت جنوں من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

یا جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

اسلام اور اقبالیات کا ایک معمولی طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں پورے شرح صدر اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس طرح علامہ نے اسلام کو پڑھا اور سمجھا ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ مسلمانوں کے من حیث القوم دوبارہ تشخص، بر صغیر میں ان کے لئے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت اور نظریہ وطنیت پر ان کے خیالات و نظریات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو منفرد مقام عطا کیا تھا اس سے اپنے دور کے بڑے بڑے علماء اور مفتی صاحبان بھی محروم رہے۔ بر صغیر میں ہندو ذہنیت کو انہوں نے جس باریک بینی سے سمجھا آج پچاس برس بعد ہمیں اس کی گہرائی، گیرائی اور پیش بینی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی یہ رباعی اس وقت جتنی بر محل تھی اس کی صداقت آج کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

نگہ دارد برہمن کار خود را
نمی گوید بہ کس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر
بدوش خود برد زنار خود را

سرور دو عالم ﷺ کے ساتھ اقبال کی محبت محض خوش عقیدگی یا روایتی گھٹی کا کرشمہ نہیں بلکہ وہ تہ دل سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ ہی انسانیت کے وہ مقتدا اور

نجات دہندہ ہیں کہ آپ ہی کے دامان رحمت میں انسانیت سکون وعافیت حاصل کر سکے گی، اقبال ایمان کی پختگی اور آنحضورﷺ سے کامل محبت کے راستے میں عشق کو علم پر، نظر کو کتابوں پر اور جذبے کو فکر پر ترجیح دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کو بے فائدہ کلامی بحثوں میں الجھادیا ہے اقبال انہیں امت مسلمہ کا بد خواہ سمجھتے ہیں فرماتے ہیں۔

مآل قوم از مے خواہم کشادے
فقیہش بے یقینے کم سوا دے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے

ہر چند بیگم رشیدہ صاحبہ کی یہ پہلی کتاب ہے تاہم یہ اپنے موضوع کا پورا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس میں ایک تحقیقی تخلیقی کتاب کا سارا حسن موجود ہے۔ بیگم صاحبہ کے بھائی اور مرحومہ بہن وحیدہ روشن صاحبہ شعر وادب کی دنیا سے متعلق تھے اسی طرح ان کے چچازاد بھائی محمود نظامی صاحب تو صاحب اسلوب ادیب تھے۔ اگر بیگم صاحبہ کے سسرال میں علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیت موجود ہے تو ان کا آبائی خاندان بھی اس نعمت سے محروم نہیں ہے۔ یوں وہ ہر لحاظ سے اس کی اہل ہیں کہ وہ اپنے نامور شوہر اور ہر اعتبار سے لائق فخر سسر پر قلم اٹھا سکیں۔

"آفتاب سورج کے ساتھ ساتھ" ایک ایسا مفصل اور معلوماتی مضمون ہے جس میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۸ء تک شائع ہونے والی تمام کتابوں سے آفتاب اقبال کے حوالے سے معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ "آفتاب اقبال ایک عظیم مسافر" بظاہر مختصر سا مضمون ہے مگر نہایت قیمتی اور مورخین کے لئے بے حد کار آمد معلومات کا حامل ہے۔

"نوادرات" میں عنوان کی طرح انتہائی نادر اور نئے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال کی وفات پر ریاست کپور تھلہ کے مہاراجہ کے بھتیجے اور آفتاب اقبال کے دوست سردار کرم سنگھ اہلو واہلیہ کا انگریزی خطاب بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء میں ایک بھارتی نژاد مسلمان فقیر محمد نے انگریزی زبان میں علامہ اقبال اور آفتاب اقبال کو جو خراج عقیدت پیش کیا وہ ظاہری اور معنوی ہر اعتبار سے منفرد نوعیت کا خراج ہے۔ مثلاً سر محمد اقبال کا پہلا حرف س ہے تو ان کی انگریزی نظم کا پہلا حرف بھی س اور مصرے کا آخری حرف بھی یہی ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر اس تاثر کی بھی نفی ہوتی ہے جو بعض حلقوں کی طرف سے آفتاب اقبال اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی روایتی کشیدگی کے سلسلے میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے چنانچہ کتاب میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا تعزیتی خط خود اس کی شہادت دے رہا ہے۔

اقبالیات میں جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں ان میں جدت اور ندرت کے ساتھ ساتھ ایسی نئی معلومات آگئی ہیں جو اقبال شناس حلقوں کے لئے بہت کار آمد ہیں۔ "علامہ اقبال اپنے فرزند آفتاب اقبال کی نظر میں" "اقبال کے معمولات" "سلسلہ قادریہ میں علامہ کی بیعت" " علامہ اقبال کی شادیاں" "اقبال کی پہلی شادی کا افسوس ناک انجام چند وجوہات کا جائزہ" "اقبال کی آل اولاد" "خفتگان خاندان اقبال" (علامہ اقبال کے دادا سے ۱۹۹۸ء تک انتقال کرنے والوں کا تذکرہ) اور "چراغ تلے اندھیرا" ایسے عنوانات میں جنہیں پڑھ کر کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ بے شمار نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اب گھر کے ایک معتبر فرد کی داخلی اور ثقہ شہادت نے کئی متنازعہ اور مشکوک مسائل حل کر دیئے ہیں۔

اسی طرح سوانح آفتاب اقبال کے حصے میں آفتاب اقبال کے بارے میں تفصیلی حالات سپرد قلم ہوئے ہیں۔ چونکہ آفتاب اقبال کا تذکرہ دراصل علامہ اقبال ہی کا تذکرہ ہے۔ اس لئے اس میں حضرت علامہ سے متعلق ساری معلومات بالکل نئی اور

تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔

بیگم رشیدہ صاحبہ مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے انتہائی محنت اور کوشش کے ساتھ علامہ اقبال کے محبوں کے لئے ایک ایسا ارمغان پیش کیا ہے جس کے ذریعے انہیں تازہ خوراک مہیا ہو گئی ہے۔ اس فقیر پر بیگم صاحبہ کی شفقت و عنایت زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔

راقم السطور سلسلہ عالیہ قادریہ کا ایک معمولی درویش اور طالب علم ہونے کی حیثیت سے اپنے سلسلے کے ایک لائق فخر سپوت حضرت علامہ اقبال اور آپ کے خاندان پر لکھی جانے والی اس نادر کتاب پر یہ چند حرف لکھتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہے اور اس موقع پر اپنے والد گرامی راس الاصفیا عالم ربانی حضرت سید سیف الدین مغفور القادری علیہ الرحمتہ (م/۱۹۷۰ء) کی بلند درجات کے لئے دعا طلب ہے۔ جنہیں سید علی ہجویری داتا گنج بخش علیہ الرحمتہ نے روحانی طور پر حضرت علامہ کے پاس جانے کے لئے حکم دیا اور حضرت علامہ آپ سے مثنوی اور حضرت سچل سرمست فاروقی کی کافیاں سن کر دیر تک روتے رہے۔ سارا کلام اقبال آپ کو زبانی یاد تھا اور آپ کی زندگی کی کوئی سحر ایسی نہ تھی جس میں رسیلی آواز میں روتے ہوئے علامہ مرحوم کا کلام آپ نے نہ پڑھا ہو سفر و حضر میں یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ راقم السطور بچپن سے یہ منظر دیکھتا آیا گویا اقبال کی محبت ایک لحاظ سے اس کی گھٹی میں شامل ہے۔ آپ اکثر عمر خیام کی یہ رباعی دہرایا کرتے تھے۔

شب خیز کہ عاشقاں بہ شب راز کنند
گرد درو بام دوست پرواز کنند
ہر جا کہ درے بود بہ شب در بندند
الا در دوست راکہ شب باز کنند

میں حضرت علامہ کے پیغام کا خلاصہ نظیری کی زبان میں پیش کرتے ہوئے

اجازت طلب ہوں

جز محبت ہرچہ بردم مسعود در محشر نہ داشت
دین و دانش عرض کر دم کس بہ چیزے بر نہ خواست
ہر عمل را اجر سنجید درمیز ان حشر
قیمت چشم پر آہم چشمہ کوثر نہ داشت

خاک راہ دردمندان طریق

فقیر سید محمد فاروق شاہ القادری ایم اے
سجادہ نشین خانقاہ قادریہ شاہ آباد شریف
گڑھی اختیار خان ضلع رحیم یار خان

تبصرہ

علامہ اقبال کے فرزند اکبر

آفتاب اقبال

مصنفہ

رشیدہ بیگم

بڑی بہو علامہ اقبال

برصغیر پاک وہند میں ہر ایک بچہ جب اسکول میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے گنگناتا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اور یوں علامہ اقبال سے متعارف ہوتا ہے پھر یہ تعارف وسعت اختیار کرتا جاتا ہے جوں جوں عمر کی منزلیں طے کرتا ہے علامہ اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلو اُبھر کر سامنے آتے جاتے ہیں۔ آپ کی قومی شاعری، نثر نگاری، حکمت و فلسفہ سے بھرے مقالات و مضامین اور پھر مصور پاکستان کی حیثیت نے آپ کو عظیم ہمہ جہت شخصیت کا درجہ عطا کیا ہے۔ آپ کے لئے عوام و خواص کے دلوں میں عقیدت اور محبت کے جو جذبات موجزن ہیں وہ آپ سے متعلق اشیاء اور شخصیات میں بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب زیر تبصرہ کتاب کی مصنفہ رشیدہ بیگم یعنی علامہ

اقبال کی بڑی بہو اور آفتاب اقبال کی بیگم سے جناب ماسٹر محمد اکرام صاحب کے ذریعے ٹیلی فون پر اور پھر بیگم آفتاب اقبال کے دولت خانہ پر براہ راست ملاقات کا موقع ملا۔ یقیناً میرے لئے یہ ایک سعادت تھی اور موصوفہ کی خواہش کہ ان کی کتاب پر تبصرہ تحریر کروں اپنے لئے ایک اعزاز سمجھ کر پوری کر رہی ہوں۔

زیر نظر کتاب علامہ اقبال کے فرزند اکبر جناب آفتاب اقبال کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے جن کا انتقال ۱۳ اگست ۱۹۷۹ء رات ساڑھے دس بجے لندن کلینک میں ہوا۔

مصنفہ کا تعلق یقیناً ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے اور وہ خود بھی بڑے اچھے ذوق کی مالک ہیں۔ بیگم آفتاب عمر کے جس حصہ میں ہیں خواتین عموماً بے بسی کا شکار نظر آتی ہیں لیکن آپ سے ملکر ایک نئی توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک عزم تازہ پیدا ہوتا ہے اور پھر خود بھی کچھ کرنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے یقیناً یہ فیضان اقبال ہی ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ۔

اقبالیات سے متعلق ہے اس میں علامہ اقبال سے متعلق مضامین شامل کئے گئے ہیں یہ مضامین زیادہ تر کتاب کی مصنفہ کی "قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جو یقیناً راز درون خانہ سے پردہ اٹھاتی ہیں تو کچھ خوشگوار اور کچھ تلخ حقائق پردہ سیمیں پر نمودار ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے ذریعہ خاندان علامہ اقبال کے بقید حیات افراد بھی اور راہی ملک عدم ہونے والے بھی اپنا مقام پاتے ہیں۔ چند اہم مضامین لیڈی اقبال، چراغ تلے اندھیرا، خاندان اقبال سے ایک تعارف، خفتگان خاندان اقبال ہیں، لیڈی اقبال بڑا جاندار مضمون ہے جو کہ مصنفہ کی خوشدامن تھیں۔ چراغ تلے اندھیرا میں عظیم

لوگوں کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے یہ سلسلہ درست معلومات حاصل کرنے کے لئے اہم ہو سکتا ہے۔

دوسرا حصہ۔

جناب آفتاب اقبال کی حیات تفصیل اور گہری نظر کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس میں آفتاب سورج کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مفصل مضمون ہے جس میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۸ء تک شائع ہونے والی کتب میں آفتاب اقبال پر چھپنے والے مضامین اور دیگر حالات و واقعات یکجا کئے گئے ہیں۔

تیسرا حصہ۔

نوادرات سے متعلق ہے اس میں نذرانہ عقیدت بحضور علامہ نادر تصاویر' ہائیڈل برگ میں علامہ اقبال کے گھر کی تصاویر شامل ہیں ان کے علاوہ اور کئی نادر معلومات شامل ہیں۔

یہ کتاب بنیادی طور پر تو حیات آفتاب اقبال کا احاطہ کرتی ہے لیکن آفتاب کی کرنوں کا منبع کہاں ہے اور کس طرح ان کرنوں سے روشنی پھیلی اس پر بھی بخوبی روشنی ڈالی گئی ہے علامہ اقبال بڑی بہو کی نظر میں عظیم قومی ہیرو صوفی قلندر معمار قوم قناعت پسند ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے علامہ اقبال کے معمولات زندگی کی جھلکیاں آفتاب اقبال کی زبانی سنائی گئی ہیں۔ حیات اقبال حیات آفتاب کے بغیر مکمل نہیں۔ ہر چند جاوید اقبال اور منیرہ اقبال نے علامہ اقبال کی اولاد کی حیثیت سے زیادہ شہرت پائی لیکن آفتاب اقبال کے ذکر کے بغیر علامہ اقبال کی زندگی کی کہانی ادھوری یا محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

خاندان کے مختلف افراد کے درمیان یہاں تک کہ ماں بیٹی، باپ بیٹے، بہن

بھائی، شوہر اور بیوی میں اختلافات ہر ایک معاشرہ کا ایک حصہ ہوتے ہیں لیکن معاشرہ کے عام لوگوں میں خاندانی اختلافات منظر عام پر لانا پسند نہیں کیا جاتا جبکہ قومی ہیروز کی نجی زندگی ان کا پیار محبت ان کے اختلافات سب قوم کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں قوم اپنے ہیروز کی زندگی کے ایک ایک پہلو سے واقفیت میں دلچسپی رکھتی ہے ان کی زندگی مکمل طور پر قوم کی امانت سمجھی جاتی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کی تصنیف و تالیف کی کئی وجوہات ہیں مثلاً علامہ اقبال کی نجی زندگی منظر عام پر لانا۔ آپ کی بیویوں کے متعلق مختلف النوع قسم کے خیالات واندازوں کا جواب دینا، بڑی بیگم اور ان کی اولاد (خصوصاً آفتاب اقبال) سے آپ کے تعلقات واختلافات میں مبالغہ آمیزی پر قابو پانا مثلاً آفتاب اقبال کے لئے حکیم احمد شجاع سے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

"ناراضگی نہیں بس حقیقت یہ ہے کہ نہ مجھ کو جھکنا آتا ہے نہ آفتاب کو جھکنا آتا ہے۔ آخر میرا ہی خون ہے۔"

آفتاب اقبال پر بعض لوگوں کے الزامات واعتراضات کے جولبات دیئے گئے ہیں خصوصاً قادیانی ہونے کا الزام وغیرہ۔ علامہ اقبال کے خاندانی اختلافات لوگوں کے اعتراضات، اپنوں کے دکھ، غیروں کے الزامات، پھر ان اختلافات کو خوبی سے بیان کرنا، اعتراضات والزامات کے جولبات نہ صرف بھرپور انداز میں دینا بلکہ عموماً ثبوت کے ساتھ حقائق کا انکشاف، بے بنیاد الزامات کی واضح اور بھرپور تردید اس سب کے لئے قوم یقیناً رشیدہ آفتاب صاحبہ کی ممنون ہوگی یہ انہی کی شخصیت ہے جو حقائق سے آگاہ کر سکتی ہے۔ کسی اور کی جرات اور علمیت اس تقاضہ کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ قاری اندازہ لگا سکتا ہے کہ مصنفہ میں حق بات کہنے اور سچ سننے کا حوصلہ ہے اور اسی

حوصلہ کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ مصنفہ کا قیام عموماً کراچی میں رہا ہے لیکن کتاب کے لئے معلومات حاصل کرنے کیلئے موصوفہ نے ۱۹۹۷ء میں سیالکوٹ کا دورہ کیا اور وہاں موجود لوگوں سے براہ راست ملاقات کر کے درست معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

مصنفہ نے حیات آفتاب کا ایک ایک گوشہ واضح کیا ہے، علامہ کے ساتھ مراسلت، صحبت رکھنے والے لوگوں سے معلومات، دوست احباب، اساتذہ کی رائے، ان کے اپنے ایک مضمون اور تحریری انٹرویو کو بھی بنیاد بنایا گیا ہے، ان کی تخلیقات، سماجی و ثقافتی مصروفیات، نجی زندگی کے خوشگوار اور تلخ لمحات، انداز گفتگو، ان کی نشست و برخاست سب ہی کچھ اس کتاب کی زینت ہے۔ بقول رشیدہ آفتاب صاحبہ انہوں نے علامہ اقبال کو کبھی نہیں دیکھا لیکن انہوں نے علامہ اقبال کا عکس آفتاب اقبال میں ضرور دیکھا اور پھر ان کی اولاد کو اسی شخصیت کا آئینہ دار بنانے کی سعی پیہم کی۔ جیسا کہ سید حامد جلالی کی کتاب علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی پر تبصرہ کرتے ہوئے منور ہاشمی صاحب نے لکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آفتاب صاحب سے ملاقات کرنے والے انہیں دیکھ کر بغیر کسی تعارف کے ہی پکار اٹھتے تھے کہ یہ حکیم الامت کے فرزند ارجمند ہیں۔ ان کی والدہ نے انہیں اپنے شوہر نامدار کی تعلیم کی روشنی میں جس طرح بنایا یہ انہیں کا حصہ ہے اور آگے ان کی اولاد بھی اپنے کردار اور اطوار سے ظاہر کرتی ہے کہ وہ خانوادہ اقبال سے تعلق رکھتی ہے۔ ص ۳۹

منور ہاشمی

انچارج شعبہ ادبیات

ریڈیو پاکستان اسلام آباد

قطع نظر اس سے کہ آفتاب اقبال ایک عظیم قومی ہیرو، عظیم شاعر، فلسفی، حکیم الامت، مصور پاکستان کے فرزند اکبر تھے، آپ خود بھی ایک عظیم ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ عظیم باپ کے عظیم سپوت کی حیات کے پوشیدہ گوشے عیاں ہوں گے تو یقیناً قوم استفادہ کرے گی۔

بہر حال مصنفہ نے حق قلم ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اس میں نہ تو کسی کا مقام کم کرنا مقصود نظر آتا ہے اور نہ ہی کہیں مبالغہ آمیزی ہے۔ یہ قائدین ملت کی زندگی، نظریات وخیالات افکار واعمال کھل کر بیان کرنے کی کامیاب کوشش ہے یہ کتاب اس سلسلہ کی ایک کڑی ثابت ہو تو بہتر ہے ایسی کوششیں انفرادی واجتماعی سطح پر ہونی چاہئیں۔ اقبالیات کے اداروں کو بھی ایسے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ آفتاب اقبال کی شخصیت تقاضا کرتی ہے کہ ان پر مزید تحقیقی کتب شائع کی جائیں۔ رشیدہ آفتاب صاحبہ نے یہ ضخیم کتاب لکھ کر جراتِ مندانہ قدم اٹھایا ہے اور امید ہے کہ یہ کاوش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

سلطان جہاں
پروفیسر (ر) ایجوکیشن
سرسید گرلز کالج کراچی

حرف آغاز

یہ دعویٰ کہ میں ادیب ہوں، نقاد ہوں اور مورخ ہوں بہت مشکل کام ہے۔ برسوں کتابوں کی ورق گردانی کرو تو پھر کچھ کہنے کی ہمت ہوتی ہے اور ایک دم اسلوب اختیار کرنا خاصا دشوار کام ہے۔ آہستہ آہستہ قلم میں روانی پیدا ہوتی ہے اور پھر کہنے کا ڈھنگ آجاتا ہے۔

میں ایک لاشئی اور حقیر سی بندہ ہوں۔ زندگی میں کتب بینی کا شوق رہا، گھر کا ماحول ادبی تھا۔ بڑے بھائی مرزا افضل بیگ مولانا عبدالمجید سالک کے روزنامے "انقلاب" سے منسلک تھے۔ شعر و شاعری کے شائق تھے، جناب ضیاء جالندھری ان کے دوستوں میں سے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے شعر و شاعری ہمارے بھائی بہنوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ سبھی شاعر تھے۔ میری مرحومہ بہن وحیدہ روشن ایک ماہر تعلیم، سماجی کارکن، سیاسی رہنما، شاعرہ، ادیبہ اور حاجیہ تھیں۔

اس ماحول میں میرا رجحان بھی مجھے شاعری کے میدان میں لے گیا اور میں اپنے بھائی مرزا اختر بیگ کی شاگردی کی بدولت اشعار کہنے کے قابل ہوگئی اور پھر نوعمری میں میری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اور جب ۱۹۴۳ء میں شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال ؒ کے فرزند اکبر جناب آفتاب اقبال صاحب کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی تو شاعری کا نشہ کافور ہوا اور اپنا کلام ردی کی ٹوکری کی نذر ہوگیا۔ ازدواجی زندگی کا آغاز جس انداز میں ہوا وہ میرے لئے سوہان روح تھا۔ ایک فرسودہ رسم کو توڑنے کی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ ایک مغل زادی کا ایک شیخ گھرانے میں جانا خاندان کو ایک نظر نہ بھایا اور خاندان کے سرکردہ افراد نے شادی میں شرکت سے انکار کردیا اور بہت کم افراد تقریب سعید میں شریک تھے۔

بہرکیف ایک مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا تو دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ میرے کانوں میں بھنک پڑنے لگی کہ آفتاب اقبال صاحب اور علامہ اقبال کے مابین کچھ مغائرت تھی۔ اس مغائرت کو آڑ بنا کر بھی عزیزان نے مجھے برگشتہ کرنا چاہا لیکن میرے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ مانا کہ آفتاب اقبال صاحب عمر کے لحاظ سے مجھ سے کافی بڑے تھے لیکن جب ہم آہنگی ہوجائے تو سب کانٹے راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ میں نے اپنی حیات مستعار کے چھتیس سال ان کی رفاقت میں گزارے اور ان کی عادات نے مجھے بڑا متاثر کیا اور اب وقت کے دھارے کے ساتھ میرا خیال تھا کہ کچھ حاسد اور مطلب پرست لوگوں کے اذہان میں راسخ باتیں خود بخود دم توڑ دیں گی لیکن وائے افسوس کہ آفتاب اقبال صاحب کی وفات کے بعد لوگوں نے اس طرح پینترا بدلا کہ میں پریشان ہوگئی۔ ان کی زندگی میں کسی کو جرات نہ ہوئی کہ وہ انہیں کسی مخصوص فرقے سے وابستہ کرکے بلاوجہ اپنی توانائیوں کے ضیاع کا سامان کرے۔

مقام افسوس ہے کہ ایک اچھے خاصے معزز اور محترم پروفیسر نجانے کس مقصد کی تکمیل کی خاطر آفتاب اقبال کو قادیانی ثابت کرنے پر تل گئے۔ مرحوم سید نور محمد قادریؒ نے ان حضرت کی خوب خبر لی لیکن پروفیسر صاحب سید نور محمد قادریؒ کی حق گوئی کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر اس منزل پر رواں دواں ہیں اور میں مجبور ہوکر اپنی کتاب میں "چراغ تلے اندھیرا" کے باب میں اپنی بساط کے مطابق کچھ حق باتیں کہنے کی جسارت کررہی ہوں اور اس صدی کے ان محققین کرام کی ہٹ دھرمی اور حقائق سے چشم پوشی کا بھانڈا پھوڑنے کی مرتکب ہورہی ہوں۔ میں نے اس کتاب میں آفتاب اقبال کی زندگی کا پورا احاطہ کیا ہے۔ ان کی تخلیقات، سماجی اور ثقافتی مصروفیات اور علامہؒ کی صحبت میں بیٹھنے والوں سے مراسلت کے

ضمن میں قارئین بہت کچھ حاصل کریں گے۔ مولانا حامد جلالی صاحب نے اپنی کتاب میں کافی معلومات فراہم کی تھیں لیکن ان کی زندگی کے بہت سے گوشے تشنہ رہے۔ میں نے آفتاب اقبال کے دوست احباب اور ان کے ایک تحریری انٹرویو اور مضمون کو پیش کیا ہے تاکہ ان کی زندگی کے سبھی گوشے عام لوگوں کے سامنے آئیں اور اور وہ ان کے صحیح مقام سے واقف ہو سکیں۔

حامد جلالی صاحب کی کتاب میں آپ سو عیب نکالیں لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر ان کی کتاب معرض وجود میں نہ آتی تو 1967ء کے بعد کتابوں میں آفتاب اقبال کا ذکر نہ ملتا۔ میں نے اس تناظر میں چند کتابوں سے آفتاب اقبال صاحب کے سوانح کا حال دیا ہے اور اس طرح تقریباً بیس سال کے دوران ان کی زندگی پر لکھنے والوں میں 1998ء میں ڈاکٹر منیر احمد سلیچ واحد ادیب ہیں جنھوں نے مختلف طریقے سے بڑے صاف ستھرے انداز میں قلم اٹھایا ہے اور ان کی کوشش قابل ستائش ہے۔

یہ کتاب بظاہر ایک آدھ سال سے ترتیب دی جارہی تھی لیکن اگر ذرا غور کریں تو یہ تقریباً بیس سالہ مراسلت کا ثمر ہے۔

ابھی آفتاب اقبال صاحب حیات تھے کہ مولانا حامد جلالی کی کتاب کی اشاعت کے بعد انہیں مختلف حضرات نے آمادہ کیا کہ وہ اپنی یاداشتوں پر مشتمل کوئی کتاب ترتیب دیں تاکہ محبان اقبال اس سے استفادہ کر سکیں اور اس طرح وہ علامہ اقبالؒ کی حیات کے مختلف گوشوں سے متعارف ہوں اور انہیں باپ بیٹے کے مابین مغائرت اور کشیدگی کا سبب معلوم ہوسکے آفتاب اقبال صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے کیونکہ سیدھے ہاتھ سے لکھنا انہیں آزار پہنچاتا تھا اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گھر میں بیٹھ کر آرام سے لکھنے پڑھنے کا کام کر سکیں۔

دو اقبال شناسوں نے انہیں اس بات پر ابھارا کہ وہ کچھ لکھیں۔ پھر تقریباً" ایک سال بعد ہی وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی وفات کے بعد مختلف لوگوں نے آفتاب اقبال کی حیات اور افکار پر قلم اٹھانے کا عندیہ دیا اور کچھ اہل قلم حضرات نے آفتاب اقبال صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے مراسلت کا ڈول ڈالا اور مجھے بھی احساس تھا کہ ان معلومات سے آفتاب اقبال صاحب کی حیات کے سبھی پہلو آشکار نہیں ہوسکتے۔ بعض لوگوں کے استفسارات ان کے نھیال کے متعلق تھے بعض نے آفتاب اقبال صاحب کی اولاد کے بارے میں مفصل معلومات مانگیں۔ اپنی دانست کے مطابق استفسارات کا جواب دیتی رہی اور میں چاہتی تھی کہ کچھ اقبال شناسوں کے خیالات سے بھی آگاہی حاصل کی جائے۔ عورت کے ناطے یہ بات عجیب سی تھی اور ویسے بھی ماہرین اقبالیات سے میرا تعارف نہ تھا۔ میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد تہیہ کیا کہ میں خود سیالکوٹ جاؤں اور وہاں کے بڑے بوڑھوں سے اقبال اور آفتاب اقبال کے حالات معلوم کروں۔ میں ۱۷ نومبر ۱۹۹۷ء کو اپنے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر نوید اقبال کے ہمراہ سیالکوٹ پہنچی۔

دورہ سیالکوٹ کی تفصیل اگلے صفحہ پر دے رہی ہوں۔ اب ذرا کچھ اکابرین اقبالیات کے خطوط کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔ ہر ماہر نے آفتاب اقبال کے سوانح کو اقبالیات کا ایک اہم باب گردانا ہے۔ ان خطوط نے مجھے ابھارا اور جناب مظفر حسین برنی صاحب نے کتاب لکھنے کا راستہ بتایا۔

دورہ سیالکوٹ

۷ نومبر بروز پیر میری زندگی کا ایک یادگار دن ہے۔ میں اپنے بیٹے ڈاکٹر نوید اقبال کی ہمراہی میں پہلی مرتبہ سیالکوٹ پہنچی۔ اس سے پہلے اس دلنواز شہر کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سیالکوٹ میں ہماری قیام گاہ شہر کے رئیس خواجہ حاکم دین مرحوم کے فرزند خواجہ محمد انور کی رہائش گاہ تھی۔ وہ کھاتے پیتے صنعتکار ہیں۔

ہمارے دورے کی اطلاع علامہ اقبال لائبریری سیالکوٹ کے ناظم کتب خانہ چودھری ریاست علی صاحب نے شہر کے اہل ذوق اور محبان اقبال کے کان میں ڈال دی تھی۔ سیالکوٹ میں ہمارا بوا فقید المثال استقبال ہوا۔ شہر اقبال کے لوگ علامہ اقبال کی بڑی بہو اور پوتے ڈاکٹر نوید اقبال کو دیکھنے جمع ہو گئے۔

جب ہم میزبان کی ہمراہی میں اقبال منزل پہنچے تو وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اقبال منزل کے انچارج جناب ریاض شاہ صاحب بڑے عمدہ اخلاق کے حامل ہیں اور بڑے محنتی اور متحرک انسان ہیں۔ اقبال منزل کی دیکھ بھال کا انتظام احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ اقبال منزل سہ منزلہ عمارت ہے۔ اسی عمارت میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے آنکھ کھولی تھی۔ پوری عمارت کا چپہ چپہ دیکھا۔ ایک کمرے میں مہمانوں کے لئے ایک کتاب رکھی ہے۔ اس کتاب میں میں نے اور ڈاکٹر نوید اقبال نے اپنے تاثرات لکھے۔ بعد ازاں خواجہ راشد جاوید (خواجہ محمد انور کے چھوٹے بھائی) ہمیں اپنے دولت کدے پر لے گئے۔ ان کا دولت کدہ اقبال منزل سے ملا ہوا ہے۔ انہوں نے بڑی پر تکلف چائے سے تواضع کی اور ان کے ہاں عمائدین شہر بھی مدعو تھے پھر باتوں کا دور چلتا رہا۔

کچھ دیر بعد خاندان اقبال کی کچھ بزرگ خواتین مجھے ملنے آئیں۔ وہ علامہ اقبال

آفتاب اقبال اور پھوپھی کریم بی بی سے خوب واقف تھیں۔ خواجہ راشد جاوید کے دولت کدے سے کوئی رات آٹھ بجے واپس قیام گاہ پر پہنچے۔ واپسی پر ہمارے ساتھ چوہدری ریاست علی صاحب، اقبال منزل کے انچارج ریاض شاہ اور ماسٹر محمد اکرام کے عزیز اختر بھٹی (نواب دین قلفی ہاؤس) کے علاوہ اور بھی لوگ تھے۔

دوسرے روز یعنی ۱۸ نومبر کو صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر علامہ اقبال لائبریری پہنچے یہ لائبریری ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس لائبریری سے علامہ اقبال آفتاب اقبال اور فیض احمد فیض نے استفادہ کیا۔ نامور محققین یہاں تشریف لائے۔ اس لائبریری میں چوہدری ریاست علی صاحب کے استاد اور آفتاب اقبال صاحب کے بچپن کے دوست حاجی عبدالسلام قریشی بطور ناظم کتب خانہ وابستہ رہے۔ تقریباً چالیس سال تک چوہدری ریاست علی صاحب بطور ناظم کتب خانہ خدمات انجام دیتے رہے۔

یہ لائبریری اوائل میں قلعہ پر قائم تھی۔ بعد ازاں اور جگہوں پر منتقل ہوتے ہوئے اب ایک عظیم الشان عمارت میں واقع ہے۔ سیالکوٹ ریلوے اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر پیرس روڈ پر واقع ہے۔

دوسری بڑی لائبریری سیالکوٹ چھاؤنی میں خیابان اقبال میں سیرت اسٹڈی سینٹر کے نام سے سابق کمپنی باغ کے ایک کونے پر ایک پروقار عمارت میں واقع ہے سیرت کے موضوع پر کتابیں وافر تعداد میں دستیاب ہیں اور ایک شعبہ اقبالیات کے لئے وقف ہے۔ لائبریری کے افسر اعلیٰ شیخ عبدالجبار صاحب ہیں جو سیرت کے موضوع پر ایک بڑی معیاری اور منفرد کتاب کے مصنف ہیں۔ آج کل چوہدری ریاست علی صاحب اس لائبریری سے وابستہ ہیں۔

اس لائبریری کی عمارت تقریباً دوڈھائی کروڑ روپے میں تیار ہوئی ہے۔ کئی ایکڑ پر پھیلے کمپنی باغ کے ایک کنارے پر دو منزلہ عمارت ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ شہر کے تنگ و تاریک کوچوں سے میلوں دور چھاؤنی کے صاف ستھرے علاقے میں ماحولیاتی آلودگی سے پاک فضا میں ایک معیاری کتب خانے کا قیام اہلیان سیالکوٹ کے لئے ایک نعمت خداوندی ہے۔

سیرت اسٹڈی سینٹر کے دورے کے بعد ہم امام علی الحق شہید کے مزار سے ملحق قبرستان میں پہنچے اور علامہ اقبال کے والدین کی قبور پر فاتحہ خوانی کی۔ مجھے اس قبرستان کو دیکھنے کی برسوں سے خواہش تھی اور آج اس قبرستان میں پہنچ کر میری خواہش پوری ہوئی۔ ایک چار دیواری میں علامہ اقبال کے والد، والدہ اور ان کی بیٹی معراج بیگم محو استراحت ہیں۔ آفتاب اقبال صاحب کو اپنے بزرگوں کی قبروں کی دیکھ بھال کا خیال رہتا تھا اور وہ قبور کو اچھی حالت میں رکھنے کے قائل تھے۔ اب ان کے اس مشن کو میں جاری رکھے ہوں۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جناب پرویز بخاری صاحب کے والد اور آفتاب اقبال صاحب کے خالو جناب سید سجاد بخاری کے چہلم پر لاہور پہنچے اور چہلم کے بعد آفتاب اقبال صاحب کی ایک خالہ زاد بہن نجمہ کے ہاں گجرات ،دو دن ٹھہرے اور آفتاب اقبال صاحب کے ہمراہ قبور پر فاتحہ خوانی کے لئے قبرستان جانا ہوا لیکن افسوس ایک عرصہ تک قبور کی نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے قبور زمین میں دب گئی تھیں اور نشاندہی بڑی مشکل تھی۔

۱۹۹۰ء میں لیہ کے ایک محبّ اقبال محمد انور بودلہ نے گجرات، فیصل آباد، سیالکوٹ اور لاہور کے دورے کے بعد ہمیں گجرات میں آفتاب اقبال صاحب کے

ننھیال کی قبور کی خستہ حالی کا حال لکھ بھیجا۔ انور بودلہ نے یہ سفر آفتاب اقبال صاحب کے بارے میں ایک کتاب کی تدوین کے سلسلے میں اختیار کیا تاکہ ثقہ معلومات حاصل کر سکے۔ اس کو قبور کی مرمت کا کام سونپا گیا۔ انور بودلہ نے سید نور محمد قادریؒ کے بھائی خلیل قادری صاحب کے ہمراہ مرمت کے کام کی نگرانی کی۔

بہر کیف سیالکوٹ میں بھی میرے پیش نظر اپنے بزرگوں کے بارے میں ثقہ معلومات اور بزرگوں کی قبور کی مرمت کا کام تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ سیالکوٹ کارپوریشن علامہ کے والدین کی قبور کی مناسب دیکھ بھال کا کام بطریق احسن انجام دے رہی ہے۔ قبور پر فاتحہ خوانی کی تصاویر اتاریں اور بعد ازاں شیخ عطا محمد اور پھوپھی کریم بی بی کی قبور پر گئی جو علامہ کے والدین کی قبور سے ذرا تھوڑے فاصلے پر قبرستان کشمیریاں میں مدفون ہیں۔ فاتحہ خوانی کی اور پھر مجاوروں کو بخشش دی اور فقراء میں خیرات تقسیم کی۔

واپسی پر خواجہ محمد انور کے گھر پہنچے انہوں نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے میں بہت سے لوگ مدعو تھے۔ مدعوئین میں چوہدری ریاست علی صاحب، اختر بھٹی اور راشد جاوید نمایاں تھے اوروں سے ہم نا آشنا تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد علامہ کے بزرگوں اور شہر سیالکوٹ کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا اور اس محفل میں بڑی نادر معلومات حاصل ہوئیں۔ محفل میں بہت سے لوگ آفتاب اقبال صاحب سے متعارف تھے اور مجھے ڈھیر ساری معلومات حاصل ہوئیں اور اس کتاب میں ساری معلومات کو سمونا میرے بس کا کام نہیں۔

اس سال (۹۹) نومبر کے مہینے میں میرے بڑے صاحبزادے آزاد اقبال میرے ہمراہ سیالکوٹ آئیں گے تو سیالکوٹ میں کم از کم چند دن قیام کا ارادہ ہے۔ اپنے قیام کے

دوران ایک جلسے اور محفل موسیقی کا اہتمام ہوگا۔ اللہ نے آزاد اقبال کو شاعری کا ملکہ ودیعت کیا ہے اور ان کے کلام میں علامہ کے کلام کی جھلک ملتی ہے۔ آزاد اقبال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ گائیگی کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں اور علامہ کا کلام بڑا ڈوب کر پیش کرتے ہیں۔
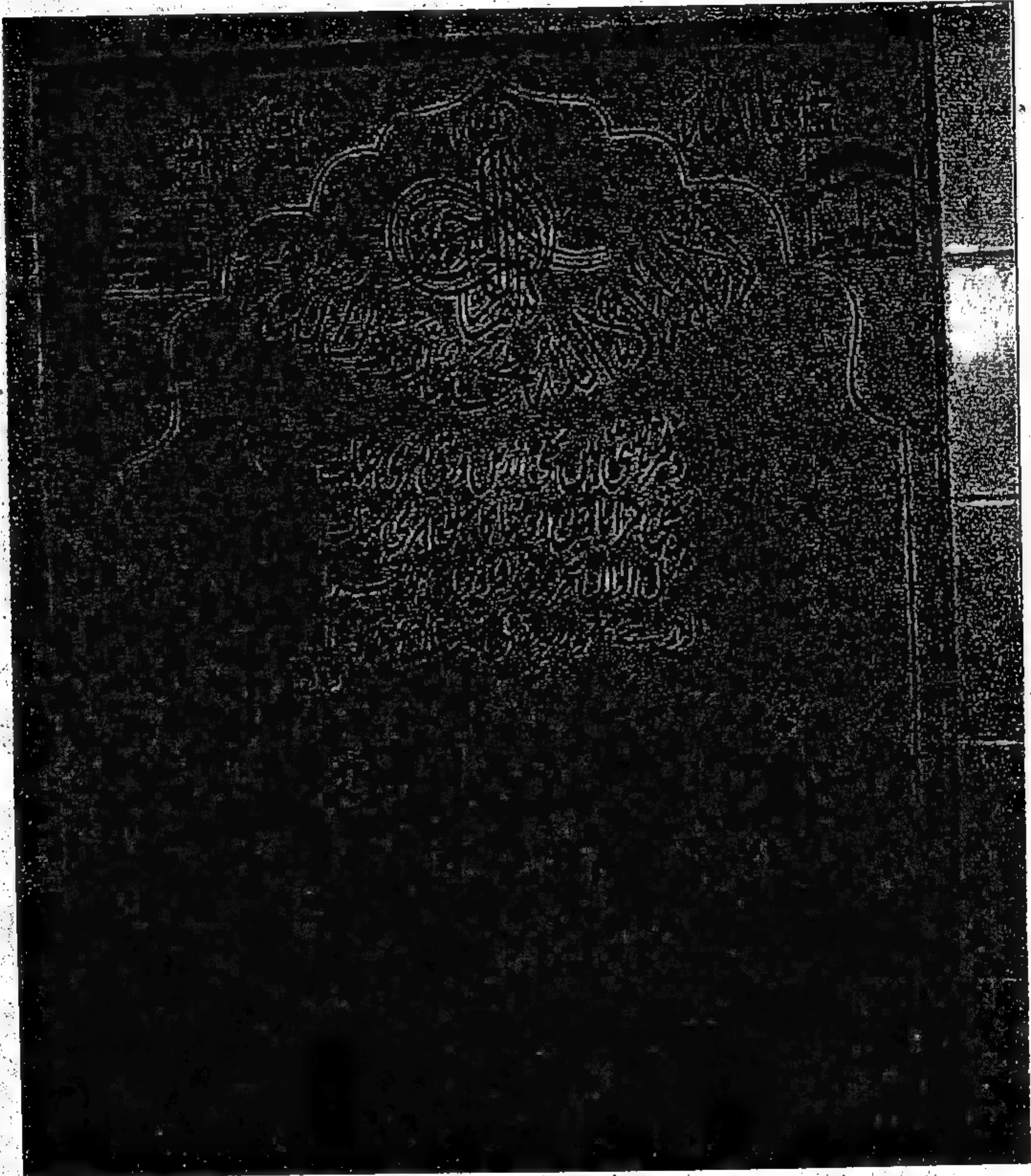
علامہ کی والدہ محترمہ کی قبر کا کتبہ

محلہ کھٹیکاں سیالکوٹ میں۔ وہ مکان جہاں علامہ اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد نے آنکھ کھولی

علامہ اقبال کے آبائی گھر "اقبال منزل" کا چوبی دروازہ۔ اقبال اس گھر میں پیدا ہوئے

۱۹۹۷ء میں دورہ سیالکوٹ میں ڈاکٹر نوید اقبال "آقبال منزل" میں مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات رقم فرما رہے ہیں

آزاد اقبال کی تصویر اقبال منزل میں آویزاں

"اقبال منزل" میں خواجہ محمد انور اور دوسرے مداحین کے ساتھ گروپ فوٹو
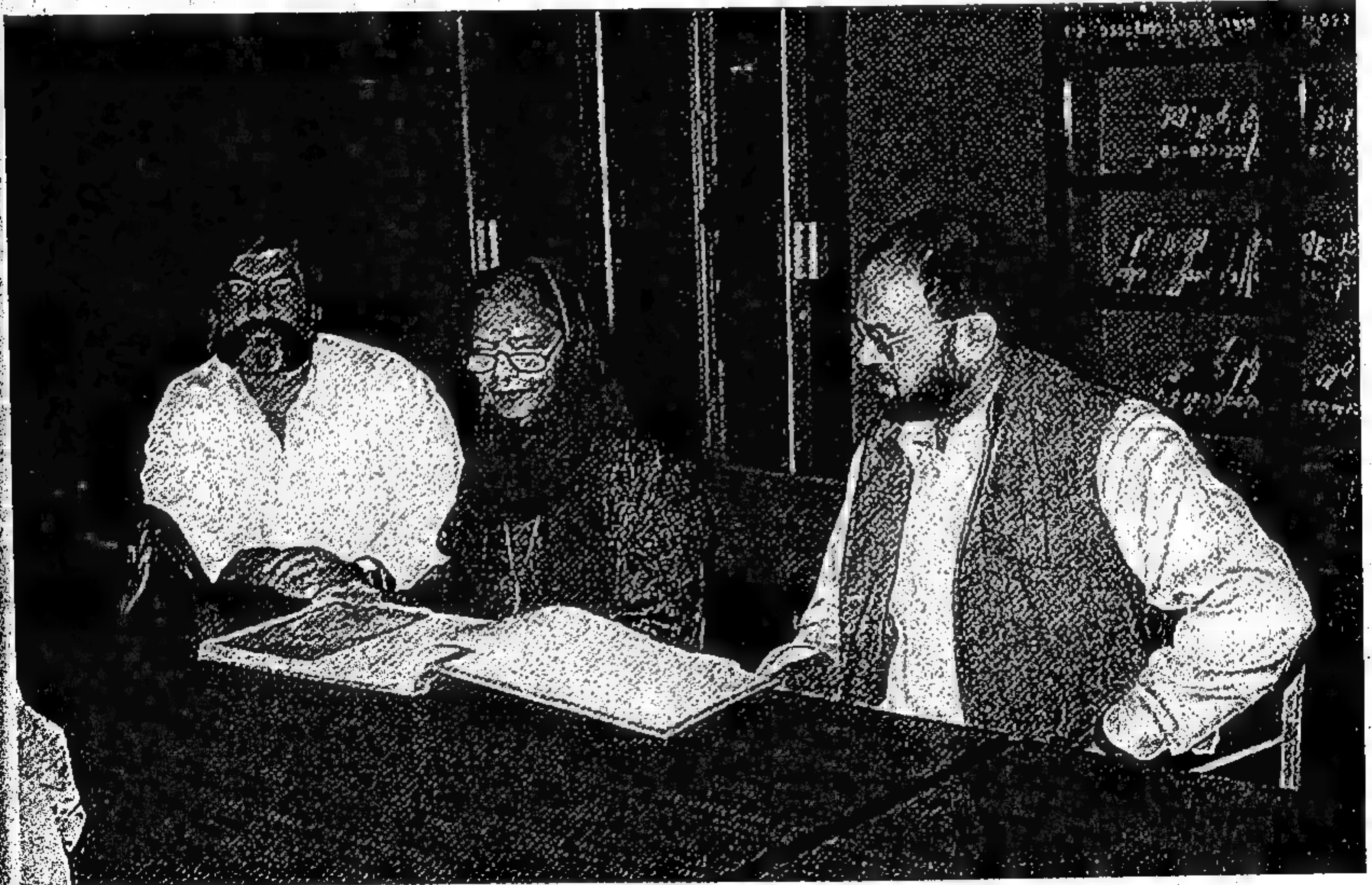
سیرت سٹڈی سینٹر خیابان اقبال میں ایک مقامی راہنما کے ساتھ

محترم بندہ

رجسٹرڈ گرامی نامہ مل گیا۔

فی الوقت مضمون کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس نے میری تشنگی اور بڑھادی۔ پاکستان میں علامہ اقبالؒ پر کام کرنے والوں کی بد نصیبی ہے کہ وہ آپ کی معلومات سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ کاش مجھے ایک بار آپ کو انٹرویو کرنے کا موقع مل جاتا آپ کی عنایات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ رسمی شکریئے سے بہت بالا ہیں۔

دعا ہے کہ آپ تادیر سلامت اور تندرست رہیں اور آپ سے استفادے کی توفیق وہاں کے لوگوں کو ہو۔

مضمون مکمل کرنے کے بعد انشاء اللہ پھر بعض سوالات کے لئے زحمت دوں گا۔

اتنا عرض کرنا اس وقت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ علامہ مرحوم کی گھریلو زندگی، معمولات، مزاجی کیفیت ہی نہیں بلکہ ان کی آخری زندگی کی دلچسپیاں وغیرہ بھی شامل کر کے آپ اپنے تاثرات Dictate کرانا شروع کر دیجئے۔ یہ نہایت بیش قیمت دستاویز ہوگی اور آئندہ نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں گی۔

کیا یہ کم نصیبی نہیں ہے کہ جاوید اقبال صاحب سے تو لوگ انٹرویو لے رہے ہیں جو انتقال کے وقت ۱۳۔۱۴ برس کے تھے اور آپ کی طرف کسی کی توجہ نہیں جو ۳۸۔۳۹ سال کے بالغ باہوش اور ہر لحاظ سے معاملات کو سمجھنے والے پختہ عمر کے مالک تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ شیدائیان اقبال پر یہ احسان ضرور فرمائیں گے۔ آپ کا دم غنیمت ہے۔ درخواست ہے کہ میرا عریضہ ملتے ہی روزانہ کسی اردو دان کو Dictate کرانا شروع فرما دیجئے۔ اللہ مددگار ہوگا۔ ایک بار پھر دلی جذبہ احسان مندی کو قبول کیجئے۔

(۱۹۷۸ء کے ایک ایروگرام کی نقل)

والسلام

عرشی زادہ

اکبر علی خان عرشی زادہ

ایڈیشنل ڈائریکٹر رام پور رضا لائبریری

رام پور (یوپی) بھارت 244901

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فضیلت مآب محترمہ رشیدہ بیگم آفتاب اقبال صاحبہ

اسلام علیکم،

جناب ملک محمد انور بودلہ صاحب کا میرے نام ایک خط دو روز قبل آیا۔ جس کے ساتھ مرحوم آفتاب اقبال کے ایم۔ اے کے تھیس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تھی۔ ملک صاحب نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں اس کی تدوین دیباچہ اور اشاعت کا اہتمام کروں۔ میرے لئے اس سے بڑی سعادت کوئی نہ ہو گی کہ میں خاندان اقبال کی کوئی خدمت کروں۔ پھر جب یہ خدمت علمی اور خالصتاً فلسفیانہ ہو۔ آفتاب اقبال مرحوم ایک بلند مرتبہ عالم، معروف استاد اور گہری بصیرت رکھنے والے انسان تھے۔ میرا ذاتی یقین ہے کہ علامہ اقبالؒ کا جتنا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ ان کا تھا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ علامہ اقبال کی پہلی اولاد ہونے کی حیثیت سے وہ اقبال کے عروج کے بہترین زمانے میں خود جوان تھے اور اپنی الگ علمی اور فکری پہچان رکھتے تھے۔ علامہ اقبال اور آفتاب اقبال کے درمیان جو کچھ بھی معاملہ تھا میری نظر میں وہ باپ بیٹے کا آپس کا معاملہ تھا۔ ہمارے معاشرے میں ایسی بدمزگیاں عام ہیں۔ لیکن ظلم یہ ہوا کہ اس معاملے کی آڑ میں ان سے ان کے بیٹے ہونے اور ممتاز اسکالر ہونے کا حق بھی چھین لیا گیا اور وہ گوشہ گمنامی میں الگ تھلگ پڑے رہے۔ حالانکہ علمی دنیا ان سے استفادہ کر سکتی تھی۔ پچھلے دنوں بمبئی سے نکلنے والے رسالہ "شاعر" کے "اقبال نمبر" میں میں نے عرشی زادہ کا لکھا ہوا ایک تحریری انٹرویو پڑھا جو انہوں نے آفتاب اقبال سے لیا تھا جن میں اقبال اور قائداعظم کے حوالے سے بعض بڑے اہم اور قومی نکتہ نظر سے دوررس نتائج کے

انکشافات تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں آپ سے رابطہ کرتا مگر پتہ معلوم نہ تھا پھر مجھے یہ پتہ بھی چلا کہ ملک صاحب کو آپ نے غالباً بیٹا بنایا ہوا ہے مگر ملک صاحب سے خط و کتابت کم تھی اور پھر معلوم نہ تھا کہ ملک صاحب مجھ سے کس قدر تعاون کریں گے۔ بہر حال میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ آفتاب اقبال نے علامہ اقبال کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ رکھا ہوگا۔ اگر میرا یقین درست ہے تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمام مواد آپ مجھے عطا فرمادیں جو یادداشتوں، تصاویر، خطوط اور بعض دوسری صورتوں میں آپ کی تحویل میں ہوگا۔ میں ان کی مدد سے تدوین کر کے آفتاب اقبال مرحوم کے نام سے وہ سب کچھ شائع کروادوں تا کہ یہ سب تاریخ کا حصہ بن جائے اور ضائع ہونے سے بچ جائے اور پھر آپ کی اجازت ہو تو وہ تمام مواد اقبال اکادمی میں یا جاوید منزل کے میوزیم میں محفوظ کروادوں۔ اس سلسلے میں آپ چاہیں تو میں کراچی بھی آسکتا ہوں۔ اس بارے میں مجھے آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

جہاں تک ملک محمد انور صاحب بودلہ کے بھجوائے ہوئے مواد کا تعلق ہے میری گزارش یہ ہے کہ اسے ضرور شائع ہونا چاہئے میں اپنے ادارے پاکستان فلسفہ اکادمی کی معرفت شائع کرنے کے لئے بسر و چشم تیار ہوں۔ میں ہر طرح کی تدوین اور کہیں ضروری ہوا تو حواشی بھی لکھ دوں گا۔ دیباچہ کے لئے آپ مجھے آفتاب اقبال مرحوم کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کر دیجئے گا۔ آفتاب اقبال مرحوم کی اپنی تصاویر اور ان کے خاندان کی تصاویر بھی کتاب میں آسکتی ہیں۔

میرے خیال میں یہ کتاب کوئی ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اس عام کمپوزنگ، اشاعت، کاغذ کی خریداری اور بائینڈنگ وغیرہ پر کم از کم خرچ پندرہ ہزار روپے آئے گا تاہم اگر کاغذ اور بائنڈنگ بہت عمدہ اور معیاری ہو تو ۲۵ ہزار روپے سے کم خرچ نہ ہوں

گے۔ اس میں سے جو بھی معیار چاہیں وہ بتا دیجئے اس کے مطابق کام کا آغاز کر دیا جائے گا۔ آپ چاہیں تو چھاپنے کے بعد کتاب آپ کو روانہ کر دوں گا اور اگر چاہیں تو دنیا کے تمام بڑے بڑے علمی اداروں، لائبریریوں اور اسکالروں کو یہ کتاب بھجوا دوں گا۔ ان کے نام اور پتے بھی آپ کو روانہ کر دوں گا۔ تاہم ان پچیس ہزار روپے میں یہ ڈاک کا خرچ شامل نہیں۔

میرے خیال میں اس کتاب کی اشاعت ممکن ہی نہیں بلکہ احسن ہے۔ ایک تو اس کتاب سے ان کا پایہ علمی متعین ہو گا دوسرے خود آفتاب اقبال علمی دنیا میں زندہ رہیں گے۔ بلکہ اگر آپ استطاعت رکھتی ہوں تو آفتاب اقبال کا تمام علمی کام تدوین کے بعد شائع ہو سکتا ہے بلکہ میری خواہش ہے کہ خود آفتاب اقبال پر ایک کتاب ہو۔ دنیائے علم ان کا ضرور خیر مقدم کرے گی۔ آپ کے لئے اور دیگر اہل خانہ کے لئے سلام و آداب۔

وحید عشرت

۲۳ مئی ۱۹۹۰ء

میرا پتہ ڈاکٹر وحید عشرت

۹۲ ۔ ایم بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور

مکرمی جناب محمد اکرم صاحب

سلام مسنون۔ ۔ ۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، آپ نے چند سوالات اٹھائے ہیں۔

۱۔ علامہ اقبال اور آفتاب اقبال کے مابین کشیدگی کا سبب، موخر الذکر کے قادیانی عقائد تھے یا کچھ اور وجوہ؟

۲۔ "سوانحی کتب میں آپ (یعنی راقم الحروف) بھی نجانے کیوں تحقیق ادا کرنے سے قاصر نظر آئے ؟"

۳۔ "کم از کم اس (آفتاب اقبال) کی تاریخ پیدائش ہی معلوم کرتے۔ آپ کو کیا دشمنی تھی؟"

جواباً عرض ہے کہ میں اقبالیات کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میں نے کچھ تحقیقی کام کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ مگر "حق" کون ادا کر سکتا ہے؟ مجھے تو اس کا دعویٰ نہیں۔ . . سوال ۲۔ اول تو میں نے اقبال پر "سوانحی کتب" لکھی ہی نہیں، اگر اکا دکا مضمون لکھا ہے تو یہ میری بے بضاعتی ہے کہ حق ادا نہیں کر سکا۔
میں بہت سی باتیں نہیں جانتا۔ نہ جان سکا یا تحقیق کر سکا جب میں نے اقبال کے کوائف حیات مرتب کیے۔ (نقوش اقبال نمبر) تو مجھے آفتاب اقبال کی تاریخ ولادت معلوم نہ تھی، نہ مجھے ان کا پتہ میسر تھا مجھے بہت سے دیگر کوائف بھی معلوم نہ تھے۔ اس سے یہ کیسے نتیجہ نکلا کہ مجھے آفتاب اقبال سے "دشمنی" تھی؟

ہر شخص اپنی پسند کے موضوعات تحقیق پر کام کرنے میں آزاد ہے۔ ہم کسی کو پابند نہیں کر سکتے کہ تم یہ اور یہ کرو، نہ کسی کو روک سکتے ہیں کہ تم یہ کام نہ کرو۔ . . آفتاب اقبال، بلاشبہ اقبالیات کا ایک اہم موضوع تحقیق ہے۔ آپ سے عرض ہے کہ کیوں نہیں آپ ہی قلم اٹھاتے؟ آپ کو یہ سہولت بھی میسر ہے کہ آپ اس خاندان کے قریب ہیں۔ آپ کو ان کے ہاں مجالس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں آپ کی کچھ مدد کر سکا تو دریغ نہیں کروں گا انشاء اللہ۔

بالغرض آپ کچھ نہ لکھ سکے تو میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کو ان لوگوں سے "دشمنی" ہے۔

جواب کا منتظر ہوں۔

خیر اندیش

رفیع الدین ہاشمی

محترم محمد اکرم صاحب

السلام علیکم،

آپ کا خط موصول ہوا۔ یاد آوری کا بے حد شکریہ بعض کمینہ فطرت لوگ مسلمانوں کو خواہ مخواہ قادیانی بنا کر ان کی تعداد میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کسی شخص کے عقیدے کے بارے میں پوری تحقیق سے بات کرنی چاہئے۔

میں شیخ اعجاز احمد صاحب سے ملا تھا اس ضمن میں ان سے گفتگو ہوئی تھی وہ کہتے تھے کہ میں اور میرے والد (شیخ عطا محمد) قادیانی تھے۔ باقی ہمارے خاندان میں کوئی بھی قادیانی نہیں ہے۔

آفتاب اقبال کے بارے میں ایسی کوئی روایت یا ثبوت میرے علم میں نہیں ہے جس سے ان کا قادیانی ہونا ثابت ہو۔ ویسے تو لوگوں نے اقبال کو بھی قادیانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا حامد جلالی کی کتاب "اقبال کی پہلی بیوی" کوئی تحقیقی کتاب نہیں ہے لہذا ان کے تمام بیانات کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے شائستہ زبان استعمال نہیں کی ہے۔

جہاں تک اقبال کی ازدواجی زندگی کا تعلق ہے اقبال کے تعلقات پہلی بیوی سے اچھے نہ تھے اور فطری طور پر آفتاب اقبال ماں کی طرف تھا جس سے اقبال کو دکھ تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اس کی عادتیں خاص طور پر اقبال کا نام استعمال کر کے ان کے دوستوں کی مدد کا طالب ہونا اقبال کو پسند نہ تھا اور قدرے عیاشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ (دیکھئے حیدر آباد دکن کے آرکائیوز سے ملنے والے خطوط) اقبال اپنے خطوط میں اس کے لئے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں (یہ کم بخت۔ ۔ ۔) (مظلوم اقبال) حذف شدہ خط ("شاعر"۔ اقبال نمبر انڈیا)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اقبال کو بہت دکھ پہنچائے لیکن میرے نزدیک آفتاب اقبال کی شادی کے بعد کی زندگی صاف ستھری ہے۔ زندگی کے تجربات نے اسے پختہ کار بنادیا۔ اس دور میں وہ زبردست کیریکٹر کا مالک نظر آتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شیخ عطا محمد کے ورغلانے کے باوجود نہ تو اقبال کے دوسرے وارثوں (جاوید اقبال وغیرہ) سے جھگڑتا ہے نہ مقدمہ کرتا ہے بلکہ ایک پیسے کی لالچ نہیں رکھتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال نے اسے عاق کر دیا تھا۔ مجھے اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملا۔ اس دور میں اقبال کے بڑے بھائی کا رویہ اور کردار بڑا گھناؤنہ ہے۔ وہ آفتاب اقبال کو مقدمہ لڑنے کی ترغیب دیتا ہے لیکن آفتاب پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ اس دور میں جب بھی وہ اقبال کے بارے میں بات کرتا ہے اچھے لفظوں میں کرتا ہے اور اقبال کے نام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔

اگر آپ اس خاندان پر کام کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں لیکن رشیدہ آفتاب کے گھر میں سربمہر صندوق کو بھی کھلوانے کی کوشش کریں تاکہ کئی سربستہ راز فاش ہوسکیں۔ گاہے گاہے رابطہ قائم رکھیں۔

فقط والسلام

ڈاکٹر صابر کلوروی

محترمہ و مکرمہ بیگم صاحبہ زاد شرفہم

سلام مسنون۔ مزاج گرامی، کل آپ کے ایک معتمد کا خط مجھے ملا ہے انہوں نے اپنا نام نہیں لکھا تاہم میں ان کا اور آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ سے رابطہ کیا۔

بیرسٹر آفتاب اقبال کا نام عرصے سے سن رہے ہیں۔ انتہائی اشتیاق کے باوجود ان کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میرا خیال ہے بوجوہ انہیں پس منظر میں کر دیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے حق رفاقت کے علاوہ خاندانی قرض ہے جو آپ چکا رہی ہیں۔ ایسی جو بھی چیزیں چھپی ہوں یا چھپیں مجھے ضرور بھجوائیں۔

میرے والد علیہ الرحمتہ نامور عالم دین، شاعر اور بہت بڑے شیخ طریقت تھے۔ آپ کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا آپ کو علامہ کا تقریباً سارا کلام زبانی یاد تھا اور علامہ سے بہت گہرا فکری اور نسبتی تعلق تھا۔ میں "حیات مغفور" بھجوا رہا ہوں اس کے خاص صفحات نمبر ۵۵، ۵۷، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۸۷، ۹۷، ۹۸، ۹۹ آپ ضرور مطالعہ فرمائیں بلکہ ساری کتاب دیکھ لیں علامہ سے ان کی ملاقات کی ساری تفصیل اس میں موجود ہے۔

ہمیں خاندانی طور پر مفکر اقبال، عالم اقبال، عاشق رسول اقبال، اور ملت اسلامیہ کے درد مند اقبال سے تعلق اور واقفیت ہے ذاتی طور پر خاندانی اعتبار سے وہ کیسے تھے ہم نہیں جانتے اور میرے خیال میں تاریخ عالم میں یہ انفرادیت صرف محبوب خدا ﷺ کو حاصل ہے کہ آپ نے نجی اور ذاتی زندگی کو بھی کھول کر بیان کر دینے کے لئے اپنے اہل خانہ کو حکم دیا۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ سب کچھ لکھیں مگر خدا کے لئے قدیم خیالات اور اعتقادیت پر سختی سے قائم، انتہائی راسخ العقیدہ مسلمان، عاشق رسول،

صوفیاء و مشائخ کے عقید تمند اور انسان ہی میں خدا کے جلوے دیکھنے والے اقبال کو
ایک جدیدیت زدہ اباحت پسند' مرعوب مغرب' منکر روحانیت' اور دشمن علماء بنانے
کا کام نہ کیجئے یہ کار بے خیر کرنے کے لئے ڈاکٹر جاوید اقبال کافی ہیں۔

محترمہ! دنیائے اسلام میں اسلام کے ترجمان اور نمائندہ علماء اور صوفیا ہی ہیں ان میں
کچھ لوگ جاہل، کچھ غلط ہو سکتے ہیں مگر فی الجملہ سب کو گالی دینے کا مقصد نعوذ باللہ
اسلام پر حملہ آور ہونا ہے۔ یہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ جب ڈاکٹر جاوید اقبال ایسے
لوگوں کو ملت اسلامیہ اپنا ترجمان، نمائندہ یا سمبل تسلیم کرلے۔

سمہ سٹہ کے کسی بزرگ جناب اللہ چایا کا ذکر آپ کے سیکرٹری نے کیا ہے آپ ان کا
کچھ اتہ پتہ گاؤں وغیرہ کا بھجوا دیں میں ان کے بارے میں معلومات اور مضمون بھجوا دوں
گا۔

اقبال کے نام پر جو رطب و یابس چھپا ہے اور چھپ رہا ہے آپ کو اس میں سے جواہرات
تلاش کرنے پڑیں گے اور کچھ نئی معلومات بھی ہوں گی آپ عجلت نہ کریں کتاب
وقیع، معلوماتی اور مسلمانوں کے ترجمان اور مفکر اقبال کی نمائندہ ہو۔

بحمد اللہ میری بیس سے زیادہ کتابیں مختلف علمی و دینی موضوعات پر کچھ اندرون ملک کچھ
باہر چھپی ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے کافی تراجم بھی میں نے کئے ہیں۔

میں اپنے گاؤں میں مختصر بلکہ بہت ہی مختصر زرعی زمین پر گزارہ کرتا ہوں والد علیہ اللہ
کے روضہ عالیہ کی جاروب کشی کرتا ہوں اور کچھ نہ کچھ لکھتا پڑھتا رہتا ہوں۔ اگر پسند
فرمائیں گی تو میں آپ کی کتاب پر جامع پیش لفظ لکھوں گا۔ گاہے گاہے یاد فرمالیا کریں
مجھے ہر وقت نیاز مند اور علمی خدمت گزار سمجھیں۔

حیات مغفور بذریعہ رجسٹرڈ ساتھ ہی روانہ کر رہا ہوں۔

پیر سید محمد فاروق القادری ایم۔ اے ایک بزرگ ہستی کے فرزند ارجمند ہیں۔ پاکستان کے مختلف سجادہ نشینوں کا اوڑھنا' بچھونا صرف تصوف ہے لیکن پیر سید محمد فاروق صاحب علوم جدیدہ سے کماحقہ آگاہ ہیں اور ان کے قلم سے درجنوں کتابیں نکلی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں قادری سلسلہ کے ایک بزرگ جناب مغفور القادری رحیم یار خان ایسے دور افتادہ مقام سے علامہ اقبال سے ملنے لاہور تشریف لائے اور ان کی یہ ملاقات ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ ان کے قابل اور لائق فرزند سجادہ نشین سید محمد فاروق القادری کا خط میرے نام آیا ہے' انہوں نے آفتاب اقبال صاحب کے بارے میں کوائف جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ اور اپنے خط میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے بارے میں ان کے ارشادات ان کی ذاتی رائے ہے۔

رئیس امروہوی مرحوم کے ماموں زاد بھائی جناب پروفیسر خیال امروہوی صاحب نے میرے بیٹے آزاد اقبال کو تعزیتی خط روانہ کیا تھا اور آفتاب اقبال صاحب کے حالات زندگی سے شناسا ہونے کی' ان کی تمنا بھی ہے۔ فارسی ادب کی ایک قد آور شخصیت ہیں اور پنجاب کے دور افتادہ علاقے لیہ میں بستے ہیں۔ اللہ انہیں سلامت باکرامت رکھے۔

پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو میرے سیکریٹری ماسٹر اکرام نے اپنے طور پر ایک مکتوب روانہ کیا تھا۔

اور ان کی نظر میں آفتاب اقبال کے مستند اور جامع سوانح "اقبالیات" میں اہم موضوع تحقیق تھے۔ بیشتر متفرق اور ضروری معلومات کو یکجا کیا ہے۔ بہت سی قیمتی دستاویزات تلف اور گم ہو چکی ہیں جو کچھ بن پڑا ہے اسے پیش کر دیا ہے۔ اب آفتاب اقبال کی زندگی کا اہم دور تاریکی میں نہیں رہے گا۔

پروفیسر ایوب صابر صاحب کے شاگرد رشید ڈاکٹر صابر کلوروی صاحب کو بھی ماسٹر اکرام نے ایک مکتوب روانہ کیا تھا اور ان کی طرف سے ایک مفصل خط موصول ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش کے مطابق میں نے اپنے صندوق سے اپنے مملوکہ کاغذات سے کافی دستاویزات کو اس کتاب کی زینت بنایا ہے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس صندوق میں معراج بیگم اور اماں یعنی کریم بی بی زوجہ اولی علامہ اقبال کے خطوط بنام ڈاکٹر اقبال تھے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیٹی معراج بیگم اور بیوی کو لکھے تھے۔ وہ سب خطوط لاہور سے کلکتہ جاتے وقت خالہ حمیدہ کے گھر ایک بکس میں رہ گئے تھے اور واپسی پر نادانی اور ناسمجھی کی بنا پر انہیں معمولی کاغذات سمجھ کر کبھی بکس کی تلاش کا خیال نہ آیا۔ آج ان خطوط کی روشنی میں نہ جانے محققین کو کتنی کام کی باتیں ہاتھ لگتیں۔

ڈاکٹر وحید عشرت صاحب (نائب صدر اقبال اکیڈمی لاہور) نے بڑا مفصل خط میرے نام تحریر فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی علامہ اقبالؒ کے ضلع کے باسی ہیں (اب ان کی تحصیل ماشاء اللہ ضلع کا روپ دھار چکی ہے) انہیں علامہ اقبالؒ سے ہی عقیدت نہیں بلکہ ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال صاحب کے علمی کام، ایم اے فلسفہ کے مقالہ کو شائع کرنے کے محرک ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حیات آفتاب اقبال کی تدوین کے خواہاں ہیں۔ سالوں پہلے یہ خط آیا تھا اب اسے یہاں جگہ دے کر اس کی

افادیت سے عوام الناس کو بھی روشناس کرانا ضروری خیال کرتی ہوں۔

ان ماہرین کی تحریک نے مجھے اکسایا کہ میں اپنے طور پر علامہ اقبالؒ کی زندگی کے چند مخفی گوشوں سے پردہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ آفتاب اقبال کی حیات کے بارے میں حقائق کا انکشاف کروں اور جو خطوط حیدر آباد دکن کے آرکائیوز میں پڑے ہیں ان سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف آفتاب اقبال کی زندگی کے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء کے واقعات پیش کروں۔ بہت کم لوگ ان کے آخری دور حیات سے واقف ہیں۔ اب خطوط خود پڑھیے اور اندازہ کیجیے کتنے سخت الفاظ کو بھی قلم زد کرنے کی بجائے من و عن پیش کر رہی ہوں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ میں کتربیونت کے فن سے ناآشنا ہوں۔ خود بھی حق بات کی مناد ہوں اور حق بات کہنے والوں کی بات کو سننے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔

اب ذرا تھوڑا اساذکر مندرجات کتاب کا بھی ہو جائے۔

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں "اقبالیات" سے متعلق مضامین ہیں۔ زیادہ تر مضامین مرے قلم سے نکلے ہیں اور چند مضامین سید نور محمد قادری اور مشہور مصنف و صحافی سید قاسم محمود کے ایک نایاب رسالے صادق "مطبوعہ ۱۹۵۶ء سے ایک مضمون "لیڈی اقبال" سید قاسم محمود صاحب کے شکریئے کے ساتھ دیا جارہا ہے۔ علامہ اقبال کے مرشد گرامی کے بارے میں بہت سے لوگوں نے تحقیق فرمائی لیکن اس سلسلے میں سید نور محمد قادری صاحب سر خیل کارواں تھے۔ ان کی تحقیق کی کہانی نوع بہ نوع حالات کی روشنی میں دی جارہی ہے۔

علامہؒ کے مرشد گرامی قاضی سلطان محمود قادریؒ ۱۹۱۹ء میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے اور تقریباً اسی سال پہلے کی ایک عکسی تصویر سید عبداللہ قادری کی وساطت سے ملی ہے اور ان کے شکریئے کے ساتھ اسے چھاپا جارہا ہے۔

۱۹۶۷ء میں حکیم احمد شجاع (م ۱۹۶۸ء) سے آفتاب اقبال نے استدعا کی کہ وہ علامہؒ اور آفتاب اقبال کے بارے میں اپنے زریں خیالات سپرد قلم فرمائیں۔ حکیم احمد شجاع صاحب علامہؒ کو جوانی سے بڑھاپے تک دیکھے ہوئے تھے اور علامہؒ کی صحبت میں بیٹھے اور استفادہ کی سعادت انہیں حاصل تھی۔ حکیم احمد شجاع کے باپ اور بھائی کی بیٹھکوں ہی سے علامہؒ کی شاعری پروان چڑھی۔ حکیم صاحب علامہؒ سے سولہ سال چھوٹے اور آفتاب اقبال صاحب سے ۵ سال بڑے تھے۔ اپنے مکتوب محررہ ۱۹۶۷ء میں حکیم احمد شجاع نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ علامہؒ اور آفتاب اقبال کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں سے کامل طور پر آگاہ ہیں۔ لہٰذا وہ موقر جرائد میں مضامین کا ایک ایسا سلسلہ شروع کریں گے جس سے حقائق کا علم ہو سکے گا۔ لیکن افسوس کہ حکیم احمد شجاع انتقال فرماگئے۔

"لیڈی اقبال" بڑا ہی جاندار مضمون ہے۔ مضمون نگار لاکھ قرابت دار سہی لیکن مرحومہ لیڈی اقبال میری خوشدامن تھیں اور میں نے ان کی زندگی کے آخری دو سالوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور لاہور میں باغبانپورے کی ایک کوٹھی "لالہ زار" میں وہ ہمارے ساتھ تھیں۔ مجھے ان کی خدمت بجالانے اور ان کی زبانی باتیں سننے کا اتفاق ہوا لیکن علامہؒ سے ان کی جدائی کے واقعہ سے میں متفق نہیں ہوں۔ میری شنید کے مطابق لاہور کے ایک مکان میں علامہؒ کی تینوں بیویاں ایک ساتھ رہ رہی تھیں۔ دو اولاد سے محروم تھیں اور میری خوشدامن صاحبہ ماشاء اللہ دو بچوں کی ماں تھیں۔

علامہؒ کی ساس لیڈی زینب صاحبہ لاہور اپنی بیٹی کے ہاں آئیں۔ ایک گھر میں تین بیویوں کو رہتے دیکھ کر وہ بڑی کبیدہ خاطر ہوئیں۔ اور اپنی بیٹی کو گجرات لے گئیں۔ دوبارہ علامہ اپنی بیوی کو لینے گجرات نہ گئے اور ان کی بیوی لاہور نہ آئیں۔ یہی بات مجھے میری خوشدامن صاحبہ نے بتائی تھی۔ اس مضمون میں "حق مہر" کے مسئلے پر کافی روشنی پڑتی ہے اور علامہؒ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سیالکوٹ میں رہائش پذیر تھے اور لاہور سے ان کا رابطہ ڈاک کے ذریعے تھا۔ لیکن مضمون نگار بیگم بلقیس کے بھائی بخاری صاحب علامہؒ کے گھر کے برابر میں رہائش پذیر تھے اور اماں اپنی بہن شہزادہ بیگم کے ہاں آتی رہتی تھیں اور یوں حق مہر کا مسئلہ احسن طریقے سے حل ہو گیا لیکن دوری کی وجہ سے اور مناسب رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے شیخ عطا محمد صاحب اس سے بے خبر تھے۔

اے کاش بلقیس صاحبہ کا یہ مضمون حق مہر کی ادائیگی کے موقع پر ہی کسی رسالے کی زینت بنتا تو شیخ عطا محمد صاحب لاعلمی میں اس مسئلے کو اتنے بلند آہنگ میں نہ اٹھاتے۔

"چراغ تلے اندھیرا" میں بڑے عظیم لوگوں کی غلطیوں سے آگاہ کیا ہے اور اس طرح کا سلسلہ ہونا چاہیئے تاکہ لوگ غلط معلومات سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور صحیح معلومات کو اپنے ذہن میں بٹھائیں۔

میرے مضامین مختصر سہی لیکن ان میں بڑی چونکا دینے والی باتیں موجود ہیں۔ شاید ان رازوں سے میں واحد باخبر عورت ہوں اور میں نے اپنے خاندان کی باتوں کو اپنے طور پر از خود بیان کر دیا ہے ورنہ اب آثار نظر آ رہے ہیں کہ لوگ اپنی منفعت کی خاطر من گھڑت اور لایعنی باتوں کو پھیلانا مفید سمجھتے ہیں۔

"بڑی بہو کا" خاندان اقبال سے تعارف "ایک ایسا مضمون ہے جس میں تقریباً علامہؒ کے

سبھی قریبی عزیزوں سے میری وابستگی کے آغاز کا سراغ ملتا ہے اور میں نے اپنی بساط کے مطابق علامہؒ کے عزیزوں کو اپنا عزیز جانا ہے اور حق قرابت کی ادائیگی کو مقدم جانا ہے۔

"خفتگان خاندان اقبال" علامہؒ کے خاندان کے بچھڑے ہوئے افراد کے مدفن اور تاریخ وصال سے مکمل آگاہی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس مضمون کو ہر لحاظ سے مکمل کرنے کے لئے میں نے کافی ہاتھ پیر مارے لیکن پھر چند عزیزوں کی فوتیدگی کا صحیح علم نہ ہوسکا اور ایک صرف عنایت بیگم ہی زندہ ہیں جو اس عمر میں ہیں جہاں انسان اپنی شناخت سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ میری دانست میں یہ ایک بڑا منفرد اور معلوماتی مضمون ہے اور اتنے لوگوں کی فوتیدگیوں کا ایک جگہ اندراج کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان معلومات کے حاصل کرنے میں مجھے ماسٹر اکرام، چودھری ریاست علی، سروش عرفانی، خواجہ فاروق اور صفی اللہ کا تعاون حاصل رہا۔ اگر صرف معتبر کتب تک اسے محدود رکھتی تو کافی افراد کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکتیں۔

دوسرے حصے میں آفتاب اقبال کے حالات زندگی دیئے گئے ہیں۔ دراصل اس سے پہلے کتابی صورت میں آفتاب اقبال صاحب کے بارے میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اپنے طور پر میں نے اسے ترتیب دیا ہے اور میری خواہش ہے کہ اس سے استفادہ کرتے ہوئے آئندہ اور بہتر کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ اس حصے میں تقریباً آفتاب اقبال کی زندگی کے مختلف گوشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ صدر ایوب کے حوالے سے مولانا حامد جلالی کی کتاب کے ترمیم شدہ ایڈیشن میں ۱۹۹۶ء میں کافی خطوط نقول کے ساتھ دیئے ہیں لیکن اس کتاب میں اور زیادہ مواد کی وجہ سے پہلی

باتوں کو دہرانے کی کوشش نہیں کی۔

اس حصے میں آفتاب اقبال کی وفات، تدفین اور تعزیتی خطوط کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ آفتاب اقبال صاحب بیرون ممالک سے عموماً مجھے اردو میں خط لکھا کرتے تھے۔ چیدہ چیدہ خطوط کو اس کتاب میں شامل کر رہی ہوں۔

اس حصے میں ایک مضمون "آفتاب" سورج کے ساتھ ساتھ میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۸ء تک آفتاب اقبال پر چھپنے والے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے تاکہ ثابت کیا جاسکے کہ مولانا حامد جلالی مرحوم کی کتاب (علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی) لاکھ ناقص سہی لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد آفتاب اقبال کے بارے میں کافی مواد کتابوں کی زینت بنا۔ ان کتابوں میں "رجال اقبال" اور ڈاکٹر منیر احمد سلیچ کی کتاب "اقبال اور گجرات" سرفہرست ہیں۔

اس حصہ کا ایک دوسرا مضمون (اقبال کے چند عزیز) بڑا انوکھا مضمون ہے جس میں علامہ اقبال کی باقیات میں کچھ صاحب علم و فضل اور ماہرین فن حضرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ نوادرات سے متعلق ہے جس میں آہلووالیہ کا لاہور کے ٹاؤن ہال میں تعزیتی جلسے سے خطاب، جناب فقیر محمدؒ بھارتی نژاد مسلمان کا نذرانہ عقیدت بزبان انگریزی، شجرہ خاندان اقبال، شجرہ خاندان اقبال (بھارت سے ارسال کردہ)۔ ہائیڈرل برگ میں علامہ اقبالؒ جس گھر میں مقیم رہے اس کے مختلف پوز، آزاد اقبال کے حالات زندگی پر قلم اٹھاتے ہوئے ان کی شاعری کے مختلف شاہکار بھی شامل کتاب ہیں۔ آزاد اقبال کی اہلیہ فریدہ دراصل چاہ رہی ہیں کہ ان کا مجموعہ کلام شائع ہو اور اس سے قبل ان کا کلام کہیں اور نہ چھپے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ میری زندگی میں لوگ میرے بیٹے کے کلام سے متعارف ہو سکیں۔ میرا پوتا جہاد اقبال اس وقت انگلستان میں زیر تعلیم ہے، جدہ میں ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں اس نے ۱۹۹۴ء میں کچھ انگریزی نظمیں کہی ہیں۔ اس کی تصویر کے ساتھ نظمیں دے رہی ہوں۔

رشیدہ بیگم
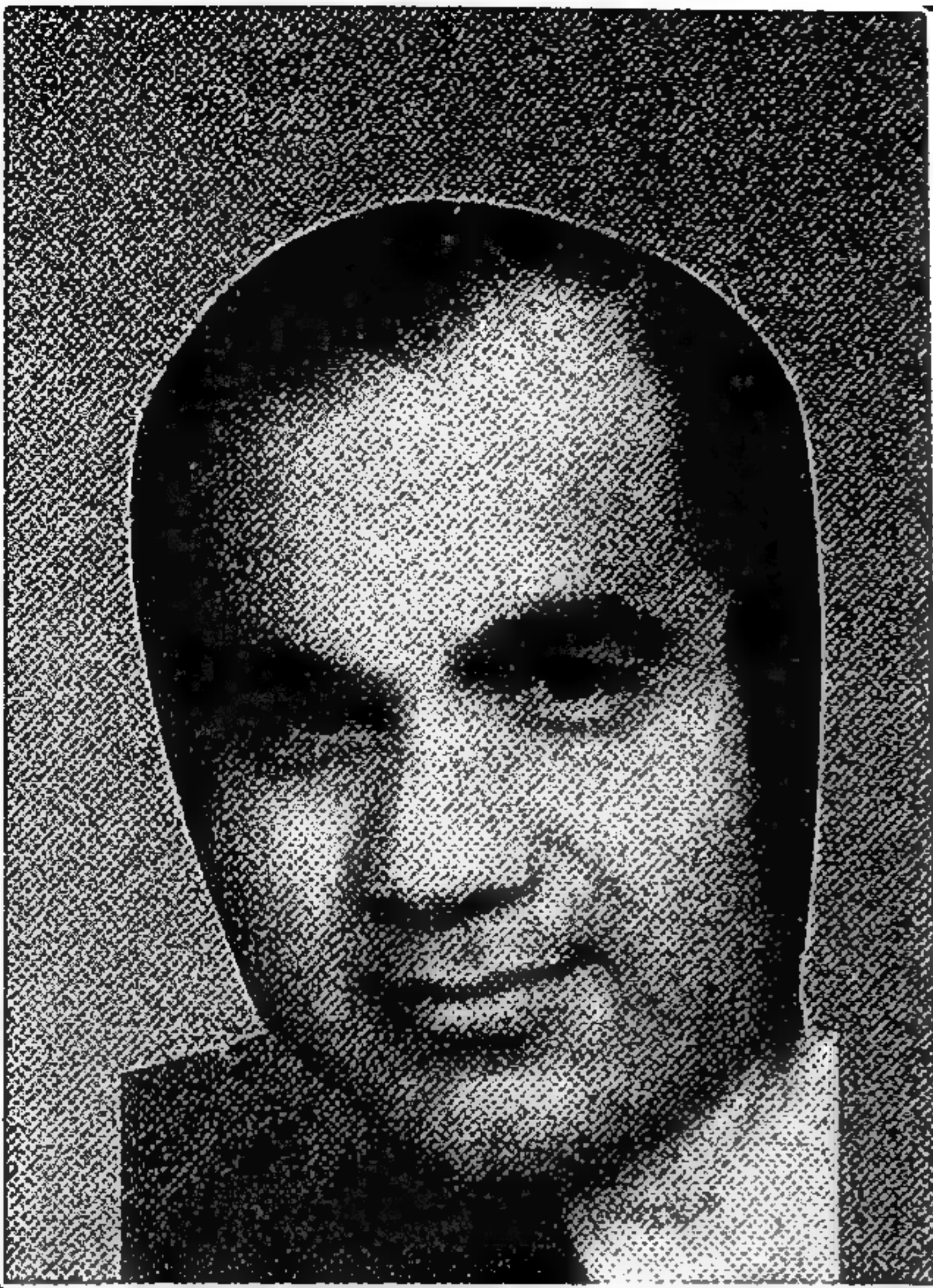
بچپن (1913)

جوانی (1938)

آفتاب اقبال---- تصاویر کے آئینے میں

ادھیڑ عمر (1943)

بڑھاپا (1979)
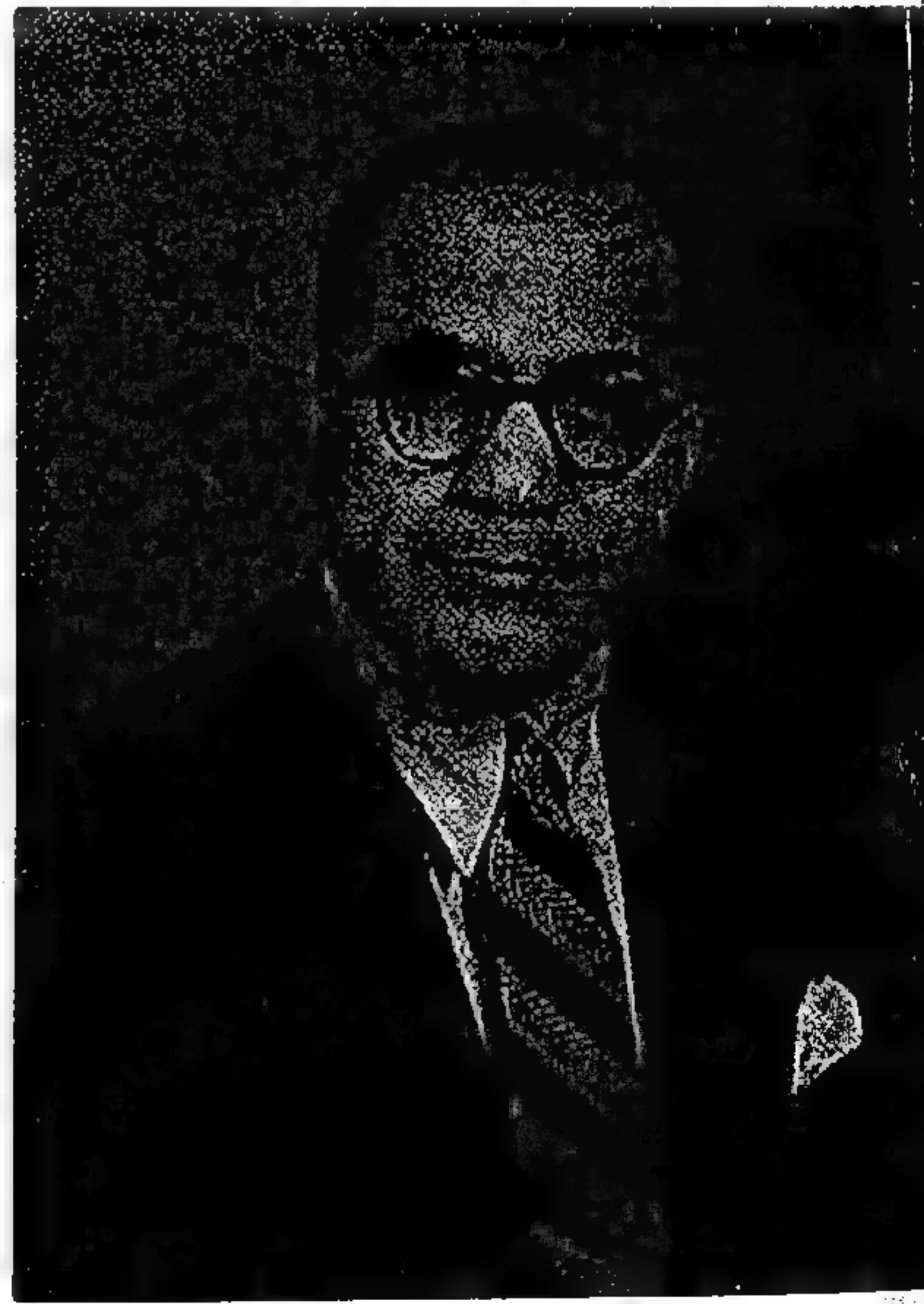
علامہ اقبال اپنے فرزند آفتاب اقبال کی نظر میں

مرحوم ڈاکٹر سر محمد اقبال ان عظیم انسانوں میں سے ایک تھے جن کی عظمت گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ مزید ظاہر ہو رہی ہے۔ اس بلند وبالا پہاڑ کی طرح جو اپنے دامن کی پہاڑیوں کے سبب ابتدا" غیر واضح ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ پہاڑیاں سمٹتی اور پیچھے ہٹتی جاتی ہیں پہاڑ کی بلندی نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ برصغیر ہندوپاک کی آنے والی نسلیں انہیں اس سے بہتر انداز میں دیکھیں گی جس میں آج ہم دیکھتے ہیں۔ ان کی باکمال اور غیر معمولی تخلیقی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کے لئے ایک طویل اور صبر آزما تحقیق اور ان اخلاقی سیاسی اور معاشرتی حالات کے بغور مطالعے کی ضرورت ہے جن میں انہوں نے اپنی زندگی گزاری۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے اور ایسے وقت میں انتقال کر گئے جب ان جیسے وسیع العلم بلند تخیل اور اعلیٰ کردار شخصیت کی اشد ضرورت تھی جو اپنی قوم کی قسمت سنوارنے میں رہنمائی کرتا۔ وہ ایک عظیم مفکر اور جری وبے باک انسان تھے۔ جنہوں نے مذہبی ،سیاسی اور سماجی اصلاح کے محاذ پر نہ صرف اپنے دشمنوں کی مخالفتوں کا سامنا کیا بلکہ ان لوگوں کی مخالفتوں کا بھی سامنا کیا۔ جن سے انہوں نے مدد طلب کی اور جن کی حمایت پر ان کو بھروسہ تھا۔ دنیا کے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اقبال کی برتری سے انکار ناممکن ہے۔ لیکن انسانی تاریخ میں انہیں شہرت وو قار دینے اور زندہ جاوید شخصیت بنانے والی چیز صرف ان کی شاعری ہی نہیں جسے انہوں نے اپنے کارنامہ حیات میں خود ثانوی حیثیت دی بلکہ ان کی وسیع علمیت اعلیٰ فہم وفراست ،فکر کی گہرائی اور مصورانہ تخیل بھی ہے لیکن ان سب سے بڑھ کر جس چیز نے انہیں فکر انسانی کی تاریخ میں ایک مستقل مقام عطا کیا ہے وہ سچائی سے محبت ،اپنے نظریئے کا پرجوش پرچار اور اس پر عمل ،مسلمانان ہند کی سیاسی وسماجی حقوق کی بے خوف وکالت اور دنیا کے سامنے اسلام کو جدید فکر کے انداز میں پیش کرنے کی بے مثال خدمت ہے۔ بیسویں صدی میں مغربی دنیا کے لئے اسلام کو قابل فہم بنانے کے اہم کام کو ایسے صاحب علم کے ذریعے ہی مکمل کیا جا سکتا ہے جو اعلیٰ اسلامی علوم کے علاوہ مغربی فلسفے کا گہرا مطالعہ اور جدید سائنس کا شعور بھی رکھتا ہو۔ یہ اسلام کے مقدس نبی

سے اقبال کی بے پناہ محبت ہی تھی جس نے انہیں معبد شہرت کا ایک طاقچہ بنادیا۔ انسان کی صورت میں وہ ایک شعلہ جوالہ تھے جو ۶۱ سال تک غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ جگمگاتا اور برصغیر ہندوپاک کے اربوں مردوزن کے دلوں کو گرماتا رہا۔ ان کا جسم راکھ اور مٹی کا ڈھیر بن چکا ہوگا، لیکن ان کی روح زندہ ہے اور ان کی شاعری بہت سی آنے والی نسلوں کے لئے تحریک پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی رہے گی۔

مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں کہ جب تعلیمی ترقی اور اقبال کی تصانیف کے ترجمے سے ان کے قارئین کا دائرہ آج سے زیادہ وسیع ہوگا۔ ان کی تعلیمات جب صحیح طور پر سمجھی، پرکھی اور جذب کی جائیں گی تب ہی کردار سازی پر اثرانداز ہوں گی۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن اس حقیقت کا زیادہ ادراک ہوگا کہ ان کا پیغام صرف ہندوستان یا محض مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام نسل انسانی کے لئے تھا۔ وہ نظریہ قومی وخود مختاری کی ان اعلیٰ قدروں پر یقین کامل رکھتے تھے جن کا مقصد نسل انسانی کی تمام شعبوں کی مشترکہ ترقی ہو۔

مسلمانان ہند کی اخلاقی، ذہنی، سیاسی اور معاشرتی سطح کو بلند کرنے کی کاوش میں جن بشری محرکات نے انہیں ابھارا اس کی توقع ایسے ہی شخص سے ہوسکتی تھی جو وسعت عقل و دانش اور آفاقی نظریہ بھی رکھتا ہو۔ اقبال جیسا بلند مرتبہ شاعر دوسرے مذہبی اور تہذیبی گروہوں کے خلاف نفرت کے جذبات نہیں رکھ سکتا۔ انہوں نے دیانت داری سے ہندوستانی مسلمانوں کے مقصد کی خدمت کی کیونکہ وہ خصوصی توجہ کے مستحق تھے۔ جب ایک طویل اور تلخ تجربے کے بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ (بحیثیت ایک چھوٹے قومی گروہ کے) ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنی مرضی کے مطابق قسمت بنانا ناممکن ہے تو انہوں نے بغیر کسی جھجک اور تامل کے برصغیر ہندوپاک سے تراشی ہوئی ایک علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ کردیا۔ آنے والی نسلیں ان کے سیاسی شعور کی قدر کریں گی جس نے ایشیا میں ایک عظیم مسلم جمہوریہ کی تخلیق کا سامان کیا۔ تاریخ میں ان کا نام نہ صرف بطور ایک عظیم المرتبت فلسفی شاعر کے بلکہ ایک مدبر سیاست دان اور نوع انسان کے معلم کی حیثیت سے بھی باقی رہے گا۔

علامہ اقبال بڑی بہو کی نظر میں

میری نظر میں اقبال صرف ایک عظیم شاعر، فلسفی اور بیرسٹر ہی نہیں تھے۔ بلکہ صوفی، قلندر اور، معمار قوم بھی تھے۔ ان کی شاعری میں تمام تر قرآن اور حدیث کا پیغام ہے۔ ان کے دل میں اسلام اور نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے عشق تھا۔ ان کا دل مسلمانوں کی بے راہروی پر روتا تھا۔ مسلمان جو اسلام سے تہذیب فرنگی کی وجہ سے دور ہوتے جارہے تھے ان کی دل آزاری ہوتی تھی۔ وہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے پھر ایک بار تمام مسلمان ایک ہو جائیں اور دنیا پر چھا جائیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

قوم نے ان کو حکیم الامت کا لقب دیا۔ انگریز بھی ان سے خوف زدہ تھے۔ اس کے لئے انگریز نے اپنی یونسیٹ پارٹی، جس میں عمر حیات، سکندر حیات، خضر حیات، میاں فضل حسین اور سر عبدالقادر اور کئی اپنے آقا انگریزوں کے پٹھو شامل تھے۔ حکم دے رکھا تھا۔ کہ اقبال کو اس کے مشن میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ یہ ہمارے لئے خطرہ ہے۔ پھر ان پٹھوؤں نے اپنے آقا کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اقبال کو بہت تنگ کیا۔ یہاں تک کہ ان کا بڑا بیٹا آفتاب اقبال لندن سے اعلیٰ تعلیم اور بیرسٹری کی ڈگری لے کر وطن واپس آیا تو اسے کوئی ملازمت نہ دی گئی۔ محض اقبال سے انتقام لینے کے لئے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں اقبال کے لئے کوئی چانس نکلتا تھا۔ وہاں بھی رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ ایک دفعہ صوبہ سرحد کی کابینہ میں جگہ خالی ہوئی۔ اس عہدے کے لئے اقبال موزوں ترین شخص تھے۔ لیکن پٹھوؤں نے جن میں سر فضل حسین بھی شامل تھے۔ سر ظفراللہ خان کو جس کا اقبال کے ساتھ کوئی مقابلہ

نہ تھا۔ متعین کروادیا۔ اس طرح کے اور بھی بہت واقعات ہیں۔ میں دہرانا نہیں چاہتی۔
سب جانتے ہیں آفتاب اقبال نے اپنے تحریری انٹرویو میں جو عرشی زادہ کو دیا تھا
بیان کئے ہیں، لیکن اقبال نے انگریز اور اس کے پٹھوؤں کی ذرا بھی پرواہ نہ کی،
وہ خدا پر بھروسہ رکھتے تھے۔ پھر آپ سب نے دیکھا۔ کون کامیاب ہوا۔ ان
پٹھوؤں کا نام کوئی بھی نہیں لیتا۔ اگر لیتا ہے تو غداروں کے زمرے میں۔

اقبال کا نام دنیا میں زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ اقبال کی وفات پر قوم کے مشورہ پر
اقبال کو دفن کے لئے سب سے موزوں جگہ ملی۔ سو آپ سب کو معلوم ہے کہ شاہی مسجد کی
سیڑھیوں کے پاس دفن ہیں۔ اور دن رات لوگ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ دوسری طرف پٹھوؤں
نے سمجھا کہ سکندر حیات نے انگریزوں کی خدمت کی ہے۔ اس کو بھی وہاں ہی جگہ ملنی چاہئے
جگہ تو مل گئی۔ لیکن اس کا حشر آپ کے سامنے ہے۔ علامہ کے مزار پر دن رات فاتحہ خوانی
کرنے والوں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ بڑے بڑے سربراہان مملکت لیڈر حاضری دیتے ہیں۔
پھول چڑھاتے ہیں۔ دسری طرف سر سکندر حیات کی قبر پر کوئی تھوکتا بھی نہیں ہے۔ فاتحہ
خوانی تو در کنار۔

اقبال اور سکندر حیات کا کیا مقابلہ تھا۔ اقبال ایک عظیم قومی ہیرو۔ مسلمانوں کے عظیم
رہنما تھے۔ اور سکندر حیات انگریز کا غلام اور قوم کا غدار۔ اس کی پارٹی نے اسے بادشاہی مسجد
میں دفن کر کے اس پر ظلم کیا۔ اس کی رسوائی کا سامان کیا۔ اس کو اگر اپنے گاؤں میں ہی دفن
کرتے تو بہتر تھا۔ کم از کم گاؤں کے لوگ تو فاتحہ پڑھتے۔ میری نظر میں اقبال بہت باہمت
انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر خاص رحمت تھی۔ ان پر اتنی تکلیفیں، بیماریاں، تنگ دستی،
دوستوں کی غداریاں و حسد اور اس پر گھریلو بدمزگیاں مستزاد تھیں۔ لیکن وہ چٹان کی طرح
ڈٹے رہے۔ اپنے مشن کو کامیاب کیا۔ انہوں نے شعروشاعری کی۔ بے شمار کتابیں لکھیں۔
ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے۔ بیرونی ملکوں کے دورے کئے۔ جناح صاحب کو پاکستان
حاصل کرنے کے لئے تیار کیا۔ مسلم لیگ کو متحرک کیا۔ مسلمانوں کے لئے بہت کام کئے۔

اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کی جگہ کوئی اور آدمی ہوتا تو وہ اتنی تکلیفوں میں شاید زندہ ہی نہ رہ سکتا۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

اقبال اور دولت: اقبال کسب حلال پر یقین رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے بغیر محنت کی دولت خودی کو مردہ کر دیتی ہے۔ اس سے بچنا چاہئے اور فرمایا۔

اے طاہر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اگر اقبال جاگیردار اور سرمایہ دار بنتا چاہتے۔ اگر اقبال سونے چاندی اور دنیا کی جاہ و جلال، چمک دمک چاہتے، کوٹھیاں بنگلے، بینک بیلنس چاہتے تو وہ ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن وہ خوددار تھے۔ کسب حلال پر یقین رکھتے تھے۔ فرمایا:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

وہ بیرسٹر تھے۔ حکیم الامت تھے۔ عظیم ترین حکیم و مدبر تھے۔ وہ دولت بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے تھے بڑے بڑے عہدے ان کو مل سکتے تھے۔ لیکن ان کی خودداری آڑے آتی تھی۔ ویسے بھی وہ قناعت پسند تھے۔ ظاہری نمود و نمائش اور چمک دمک کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بہت سادگی پسند تھے۔ وہ مشکل حالات میں صبر کرنا جانتے تھے۔ ان کو اللہ پر بھروسہ تھا۔ چند روزہ چمک دمک کی زندگی پر انہوں نے آخرت کے دائمی عیش و آرام کو ترجیح دی۔ فرمایا:

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

اقبال کے معمولات اور زندگی کی جھلکیاں

(آفتاب اقبال کی زبانی)

ابا جان رات کو بہت کم سوتے تھے۔ تہجد کے وقت بیدار ہو جایا کرتے تھے۔ پھر فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن کرتے تھے گلا خراب ہونے سے پہلے بہت دلکش آواز میں تلاوت کرتے تھے۔ پھر ناشتہ کرتے۔ اس کے بعد علی بخش حقہ لاتا تھا۔ حقہ پینے کے دوران سوچتے رہتے تھے۔ کبھی شعر کہتے تھے اور علی بخش سے پنسل کاغذ منگواتے ۔ اگر کسی مقدمہ پر جانا ہوتا تو مقدمے کے کاغذات دیکھتے اور پڑھتے تھے ۔کورٹ جانے کے لئے تیاری میں علی بخش کی مدد لیتے تھے۔ ان کو انگلش لباس بالکل پسند نہ تھا۔ مجبوراً پہنتے تھے۔ ایک دن میں بھی وہاں موجود تھا۔ (تایا جان ان دنوں لاہور میں نہ تھے ،ورنہ وہ مجھے گھر کے اندر جانے سے روک دیا کرتے تھے۔ کبھی کچھ بہانہ کر کے کبھی کچھ بہانہ کر کے) بہر حال انہوں نے سوٹ پہنا۔ ایک جراب کسی رنگ کی دوسری کسی رنگ کی میری نظر پڑ گئی۔ میں نے کہا ابا جان آپ نے دو مختلف رنگ کی جرابیں پہنی ہوئی ہیں دیکھا تو مسکرائے پھر میں نے ایک رنگ کا جوڑا تلاش کر کے دیا۔ جوں ہی کورٹ سے واپس آتے۔ پہلا کام اس لباس سے نجات حاصل کرنا تھا۔ ان کو باہر جانے کے لئے عوامی لباس شلوار قمیض پسند تھا۔ گھر میں دھوتی اور بنیان یا کرتا۔ کھانا بہت کم کھاتے تھے اکثر رات کا کھانا گول کر جاتے تھے ۔کھانا بھی بہت سادہ کھاتے تھے۔ ان کو پلاؤ ،دال ماش ،چاول اور شب دیگ (کشمیریوں کا خاص سالن شلجم گوشت جو رات بھر پکتا تھا ۔ اس لئے اس کو شب دیگ کہتے ہیں)۔ انگلش چائے کے بجائے وہ کشمیری چائے پسند کرتے تھے۔ صبح شام ۔شام کی چائے باہر صحن میں لیتے تھے جہاں ان کو لوگ ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک دن

میں گیا وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ اسی وقت علی بخش چائے کی پیالی لے آیا۔ اب ابا جان کشمکش میں، چائے کی پیالی ایک ہی تھی۔ میں سمجھ گیا میں نے کہا ابا جان آپ چائے پی لیجئے میں پی کر آیا ہوں۔ کشمیری چائے علی بخش خود بناتا تھا کم از کم ایک گھنٹہ پکانا پڑتا تھا۔ پھر اس کا رنگ گلابی ہو جاتا تھا۔ انگلش چائے کی طرح جلدی تیار نہیں ہو سکتی ہے۔

وکالت . . . وکالت کا کام زیادہ نہیں لیتے تھے۔ منشی طاہر دین کو کہا ہوا تھا کہ اتنے مقدمے لو کہ ایک ماہ کا گزارہ ہو جائے۔ یعنی ۵۰۰ روپیہ ان دنوں ۵۰۰ روپیہ کافی ہوتا ہوگا۔ نوکروں کی تنخواہیں گھر کا خرچہ، دوسرے اخراجات ویسے بھی وہ بہت سادگی پسند تھے۔ سادہ زندگی، سادہ کھانا، سادہ لباس ہر چیز میں سادگی۔ ان کو روپیہ کی لالچ بھی نہیں تھی۔ وہ قلندر اور قناعت پسند تھے وہ کہا کرتے تھے روپیہ کی لالچ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے لالچی آدمی کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوتی۔ لالچی آدمی کی مثال ایک کتے کی سی ہے جو پیٹ بھرا ہو تب بھی ہانپتا ہے نہ بھرا ہو تب بھی ہانپتا ہے۔

ان کو شوں شاں کی زندگی پسند نہ تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ کوئی اہم شخصیت شاید وہ انگریز آدمی جس نے سر کا خطاب دیا تھا۔ اس نے خواہش ظاہر کی ابا جان کو ملنے کی۔ ابا جان کسی کو ملنے نہیں جاتے تھے کہہ دیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ نہیں جا سکتے۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا وہ نہیں آسکتے تو میں ان کے پاس جا سکتا ہوں ایک دن مقرر ہوا۔ علی بخش نے کہا حضور ایک انگریز ملنے آرہے ہیں۔ کیا وہ قالین جو ایران کی طرف سے تحفہ ملا ہے وہ بچھا دوں۔ اس پر ابا جان نے کہا نہیں وہ مجھ سے ملنے آرہے ہیں قالین کو دیکھنے نہیں آرہے۔

جھوٹے مقدمے لینے سے منع کیا ہوا تھا۔ منشی کو کہا ہوا تھا کہ جب ایسے مقدمے آئیں جن میں جھوٹ بولنا پڑے وہ مقدمے مت لینا اگر اصرار کریں تو ان کو خان بہادر برکت علی یا چوہدری سر ظفر اللہ کو بھیج دو۔ میں روپیہ کی خاطر اپنا ضمیر نہیں بیچ سکتا۔ سب سے بڑا گناہ جھوٹ ہے انسان کو اس سے بچنا چاہئے۔ رزق حلال میں جو مزہ ہے وہ بغیر محنت کی کمائی یا دھوکہ یا فریب سے لی ہوئی دولت میں نہیں ہے۔

ورزش کا شوق تھا۔ پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ ڈنڈ پیلتے تھے۔ شروع شروع میں کبوتر بھی پالتے تھے۔ شام کو سیر کے لئے جانا ان کے لئے ناممکن تھا۔ کسی کے گھر بہت کم جاتے تھے۔ ہفتہ میں ایک آدھ دفعہ نواب ذوالفقار علی خان کے گھر۔ کبھی کبھی نواب مالیر کوٹلہ خود آکر ساتھ لے جاتے تھے۔ ابا جان کو بھی گانا پسند تھا۔ وہ خود بھی بہت اچھا ترنم سے اپنے شعر پڑھا کرتے تھے۔ میں نے ان کو کئی دفعہ اپنا کلام گنگناتے اور ترنم سے پڑھتے سنا۔ مثلاً

خودی کی شوخیوں میں تندی کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو تو بے لذت نیاز نہیں

اور یہ نظم بھی

سورج نے دیا اپنی شعاؤں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

اس طرح اور کئی اپنی نظمیں۔ ان کی آواز میں بہت سوز اور دلکشی تھی شروع شروع میں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں تحت اللفظ پڑھا کرتے تھے پھر بعد میں

ترنم سے اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔

ابا جان قدرتاً شرمیلے مزاج اور لحاظ پسند انسان تھے۔ میرے ساتھ کبھی کھل کر بات نہیں کرتے تھے اسی وجہ سے اپنے بھائی بابو عطا محمد سے بھی ان کی زیادتیوں پر بات نہیں کر سکتے تھے دل میں ہی ضبط کرتے رہتے اور کڑھتے رہتے۔ اسی لئے ان کو دل کی تکلیف بھی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اوروں کے ساتھ اگر کوئی آکر کہتا کہ فلاں آپ کو یہ کہتا ہے فلاں یہ کہتا ہے سن لیتے لیکن کچھ نہیں کرتے تھے۔ یہ لحاظ کی آخری شکل ہے۔ رحمدلی کا یہ عالم تھا کہ کسی پرندے کو زخمی حالت میں نہیں دیکھ سکتے تھے اور عید قربان پر بکرا ذبح ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میری عمر ۱۳-۱۴ سال کی ہوگی میری ناک میں کچھ تکلیف ہو گئی۔ ناک کی ہڈی غالباً بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ سے چیک اپ کرایا۔ انہوں نے چھوٹا سا آپریشن تجویز کیا۔ بہت گھبرا گئے۔ بڑی مشکل سے ڈاکٹر صاحب نے راضی کیا۔ یہ کہہ کر کہ معمولی آپریشن ہے اور یہ کہ میں یہ آپریشن آپ کے گھر پر ہی کروں گا ایک دن مقرر ہوا جس وقت آپریشن شروع ہوا بہت گھبرا گئے ادھر ادھر بے چینی سے ٹہل رہے تھے آخر وضو کر کے نفل وغیرہ پڑھنے شروع کر دیئے اور سجدے میں پڑ گئے۔ دعائیں کرتے رہے آپریشن کے کامیاب ہونے کی خیر آپریشن جب ختم ہو گیا تب وہ مصلے سے اٹھے۔

اس وقت ان کو میرے ساتھ بہت محبت تھی۔ ظاہر ہے کہ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور ۲۵ سال تک میں ہی ان کا اکلوتا بیٹا تھا یہ بھی بتادوں کہ وہ اپنی محبت بھی ظاہر نہیں کرتے تھے اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے ان کو میری بہن معراج سے بھی بے حد محبت تھی اس سے جب تک وہ زندہ رہی خط و کتابت کرتے رہے۔

شام کا معمول۔ . . صحن میں لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوتا تھا۔ خود سامنے آرام کرسی پر بیٹھتے تھے۔ ملاقاتی آتے محمدی فرش پر بیٹھتے جاتے (دری کے اوپر چادر) ملاقاتیوں میں چھوٹے سے لے کر بڑے آدمی سب شامل ہوتے تھے۔ سب کو بلا جھجک آنے کی اجازت تھی۔ ان کا دروازہ سب کے لئے کھلا رہتا تھا اور لباجان سے ملاقات کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ لباجان خاموش سوچوں میں غرق حقہ پیتے رہتے تھے ملاقاتی آتے سلام کرتے اور بیٹھ جاتے۔ لباجان کا اتنا رعب تھا کہ کوئی پہلے بات نہیں کر سکتا تھا۔ جب ان کا موڈ گفتگو کا ہوتا تو وہ خود بات شروع کر دیتے حیرت کی بات ہے کہ وہ ہر موضوع پر جس بات کا ان سے تعلق بھی نہ ہوتا تھا اس قدر گہری باتیں کرتے کہ آنے والا حیران رہ جاتا۔ لباجان کا علم اس قدر وسیع تھا کہ ہر آدمی کی تسلی کر دیتے۔ مثلاً اگر سنار آ گیا تو سونے کی قیمتوں سے لیکر زیورات کی بنوائی تک تمام مسئلے بیان کر دیتے۔

اگر کسی پہلوان نے گفتگو کی تو پہلوان کے گروں سے وہ واقف ہوتے تھے ویسے وہ پہلوانوں کو ملکر بہت خوش ہوتے تھے کیونکہ ان کو بھی کبھی یہ شوق تھا اگر کوئی کبوتر باز آ جاتا تو کبوتروں کی پوری نسلیں اور ان کے کارنامے بیان کر دیتے تھے۔ اگر کوئی عالم، ادیب، شاعر، فلاسفر آ جاتے تو ان کے ساتھ گھنٹوں گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ۔یہ سب لوگ لباجان سے کچھ سیکھ کر ہی جاتے تھے۔ میں بھی کئی مرتبہ وہاں موجود ہوتا تھا وہ نظارہ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا وہ بولتے اور سب محو حیرت سنتے اور محظوظ ہوتے - یوں لگتا تھا کہ ایک علم کا دریا بہہ رہا ہے اور لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں جب میں انگلینڈ سے بیرسٹری کر کے واپس آیا تو اکثر شام وہاں چلا جاتا تھا گفتگو اتنی طویل ہو جاتی میری بات ان سے کم ہی ہوتی تھی میں کچھ دیر بیٹھتا کہ وہ گفتگو میں اتنے محو ہیں

شاید ان کو معلوم بھی نہیں کہ میں آیا ہوا ہوں۔ ایک دن میں چپکے سے اٹھ کر جانے لگا تو لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے معلوم ہے یہ خوبصورت اسمارٹ نوجوان کون ہے۔ میرا بیٹا آفتاب ہے ابھی بیرسٹری کر کے لندن سے آیا ہے۔

بعض دفعہ رات کے ۲ بج جاتے تھے جو ان کی صحبت میں آتا اس کا جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا اور لوگوں کی خواہش بھی ہوتی تھی وہ بولتے جائیں اور لوگ دم بخود سنتے جائیں۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔ . . ان کے ایک دوست غلام قادر گرامی صاحب تھے (وفات ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء) جالندھر کے رہنے والے تھے بہت بڑے فارسی کے عالم تھے حیدر آباد دکن کے دربار سے وابستہ تھے اقبال ان کو اپنا کلام بھی نظر ثانی کے لئے بھیجتے تھے۔ ابا جان کو ملنے کبھی کبھار لاہور آیا کرتے تھے اور ابا جان کے ساتھ ہی قیام کرتے تھے ابا جان کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ جالندھر کا سفر کریں ۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی ویسے خط و کتابت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

جب وہ آتے بس پھر یہ عالم ہوتا کہ دونوں کمرے میں بند۔ دن رات علمی گفتگو اور دین و دنیا کا کوئی ہوش نہ رہتا۔ کھانا ، پینا ، چائے وغیرہ کمرے میں ہی جاتا تھا۔ جب کئی روز گزر جاتے تو گرامی صاحب علی بخش کو کہتے علی بخش آج ہم جا رہے ہیں سامان باندھ دو اور فلاں وقت تانگہ لے آؤ وقت مقررہ پر تانگہ آتا ان کو اطلاع دے دی جاتی جانے کے لئے اٹھتے پھر اچانک کہتے علی بخش کل جائیں گے آج بہت گرمی ہے۔ تیسرے دن پھر تانگہ آتا۔ گھر سے رخصت ہوتے۔ تانگے میں بیٹھتے پھر اچانک اٹھ جاتے۔ کہتے بھئی سیٹ بہت گرم ہے کل جائیں گے پھر واپس آجاتے ۔ دونوں کو اتنا لگاؤ تھا ایک دوسرے سے جدا ہونا مشکل تھا رکنے کا کوئی نہ کوئی

بہانہ ڈھونڈ لیتے جب زیادہ دن گزر جاتے اقبال بھی کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ صاحب مذاق سے کہتے علی بخش بیگمات سے کہہ دو مجھے اپنی سوت نہ سمجھ لینا بس اب جلدی چلا جاؤں گا۔

دوسرا واقعہ . . . ایک دفعہ حکیم احمد شجاع جو صحافی ' ادیب اور اسمبلی کے سیکرٹری بھی تھے نے ابا جان کو پوچھا لوگ مشہور کر رہے ہیں کہ اقبال آفتاب سے ناراض ہیں کیا یہ بات درست ہے۔ آپ آفتاب سے ناراض ہیں۔ ابا جان نے جواب دیا حقیقت یہ ہے کہ ناراضگی وغیرہ کچھ نہیں ہے سچی بات یہ ہے کہ نہ مجھ کو جھکنا آتا ہے نہ آفتاب کو جھکنا ہے۔ آخر میرا ہی خون ہے۔

آخری دنوں میں جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ اگر بابو عطا محمد وہاں ہوتے تو مجھے ملنے نہ دیتے۔ ایک دن علی بخش نے ابا جان کو بتا ہی دیا کہ میاں آفتاب آتے ہیں لیکن بابو عطا محمد آپ تک آنے نہیں دیتے۔ یہ سن کر ان کو بہت رنج ہوا اور فرمایا ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں کس جرم کی سزا مجھے دے رہے ہیں۔

حکیم قرشی بھی ان کے دوستوں میں سے تھے۔ آخری دن بھی ان کے پاس تھے ۔جب وہ آتے تھے تو ابا جان کے پاس کافی دیر تک ٹھہرتے تھے۔

ان سے میری ایک دن ان کے انتقال کے بعد ملاقات ہوئی۔ وہ ۲ دنوں سے بہت مضطرب تھے۔ کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خودی آڑے آجاتی اور کچھ کہتے کہتے رک جاتے تھے اور بے چینی میں کروٹیں بدلتے تھے۔ حکیم قرشی نے ابا جان سے درخواست کی کہ آپ کے دل میں جو بات ہے کہہ دیجئے۔ آپ کا دل ہلکا ہو جائے گا اور آپ کو سکون ہو جائے گا۔ قرشی صاحب نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ تمہارے

متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ جو تمہارے تایا اور اور مفاد پرستوں کے بھڑکانے سے تم پر زیادتیاں یا بے انصافیاں ان سے ہو گئی ہیں اس کے لئے پریشان تھے تم کو ظالم تایا نے نہ آنے دیا۔ اگر تمہاری آخری وقت ملاقات ہو جاتی تو تم سے معافی مانگ لیتے۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھتے تھے جیسے ان کو تمہارا انتظار ہو یہ انہوں نے ان کو بے چینی میں کہتے ہوئے سنا۔ اللہ میری توبہ میرے تایا کی زیادتیاں ابا جان کے فوت ہونے پر بھی ختم نہیں ہوئیں۔ انہوں نے تو بعض لوگوں کو کہا ہوا تھا کہ آفتاب کو جنازے کے نزدیک نہ آنے دیا جائے لیکن کسی کی جرات نہیں ہوئی مجھے ایسا کرنے سے روکے۔ میں نے کاندھا بھی دیا ان کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔

سب کو علم ہے کہ ابا جان نے کسی وصیت نامے میں نہیں لکھا تھا کہ میں آفتاب سے ناراض ہوں وہ میرے جنازے کو کاندھا نہ دے۔ نہ کسی کو زبانی کہا تھا جو لوگ ان کے ہر وقت قریب رہتے تھے۔ ان کو بھی معلوم ہے۔ چوہدری محمد حسین ہر روز ان کے ساتھ رات ۱۲ بجے تک رہتے تھے علی بخش چوبیس گھنٹے رہتا تھا ان کے دوست مرزا جلال الدین سے میرا ملنا جلنا تھا وہ بھی اکثر ابا جان سے ملتے تھے وہ میری بیوی کے رشتہ دار بھی تھے یعنی میری بیوی کے چچا کے سسر تھے۔ ان کی بیٹی کی شادی رشیدہ کے چچا احمد بیگ سے ہوئی تھی۔ جن کا بیٹا محمود نظامی تھا۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ یہ لوگ بالکل جھوٹی باتیں اڑا رہے ہیں اقبال نے کبھی تمہاری برائی نہیں کی بلکہ بعض دفعہ کہتے تھے (وہ ہمدردی کرتے تھے) آفتاب کے ننھیال والے امیر آدمی ہیں اس کو کھلا خرچ کرنے کی عادت ہے میں غریب آدمی ہوں مجھے افسوس ہے کہ اس کی مدد نہیں کر سکتا اور انہوں نے یہ بات کہ آفتاب میرے

جنازے کو کاندھا نہ دے بالکل غلط بات ہے اور یہ من گھڑت بات ہے۔ اسی طرح ابا جان کے دوسرے دوستوں نے بھی مجھے بتایا تھا۔

یہ سب قصہ کیا ہے میں بتاتا ہوں۔ یہ چال میرے تایا کی تھی۔ اس نے یہ بات مشہور کروائی تھی۔ اس بات کے پیچھے ایک بہت بڑا انتقام تھا وہ تھا مذہبی انتقام۔

تایا جان کی عمر بھر یہ خواہش رہی کہ اقبال احمدی مذہب قبول کرلے۔ لیکن وہ چال میں کامیاب نہ ہوسکے۔ انہوں نے میرے ساتھ بھی یہی کرنا چاہا میں بھی ان کے جال میں نہ پھنسا۔

اس لئے انہوں نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ میں بھی اقبال و آفتاب کو سکون کی زندگی گزارنے نہیں دوں گا۔ ان کو اذیت دوں گا۔ اسکے بیٹے کو اس سے جدا کر کے۔اس طرح وہ اپنی اس چال میں کامیاب ہوگئے کہ باپ بیٹے میں خلیج حائل کردی۔لیکن الحمد اللہ ہم دونوں اپنے مذہب پر قائم رہے اور مرتد نہیں ہوئے یہ ان کا مذہبی انتقام تھا۔

جو ان کی وفات کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ وفات کے بعد بھی اقبال کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہے مجھے بھڑکاتے رہے کہ تمہارے باپ نے تم سے اور تمہاری والدہ سے بے انصافی کی ہے اس پر مقدمہ کرو وصیت نامہ ٹھیک نہیں ہے اپنا حق مانگو۔ وغیرہ وغیرہ لیکن میری والدہ نے ان کی یہ چال بھی ناکارہ کردی۔

ابا جان جانتے تھے کہ ان کا بڑا بھائی موقع پرست اور مفاد پرست اور مطلب پرست اور مرتد ہے اس لئے ان کا نام وصیت نامے میں نہ لکھا۔ یہ دیکھتے ہی شیخ عطا محمد صاحب ابا جان کے دشمن بن گئے اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ قارئین حضرات کو اب ان کا اصلی چہرہ نظر آگیا ہوگا۔

ابا جان کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ نویں دسویں جماعت میں تھے تو باقاعدہ شعر کہنے شروع کئے اور ان کی نظمیں کئی رسالوں میں چھپنی شروع ہو گئی تھیں پھر علامہ کا کلام مخزن اور کئی رسالوں میں چھپنا شروع ہوا پھر زیادہ شہرت انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں سے ہوئی جہاں وہ اپنا کلام ترنم سے سناتے اور لوگ جوق در جوق سننے آتے تھے جن کو کلام سمجھ آتا تھا وہ بھی اور جن کو سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ بھی۔

اقبال اور انگریزیت۔۔۔ ابا جان کو اردو ،فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ انگلینڈ میں رہے وہاں کے طور طریقے ،کلچر ،رہن سہن تہذیب سب دیکھا اور فرماتے تھے۔ تہذیب فرنگ نے انسان کو خاص کر مسلمانوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ ان کی تمام روحانی واخلاقی قدروں کو تباہ کر دیا ہے۔ ایمان کمزور کر دیا ہے مسلمانوں کو اسلام سے دور کر دیا ہے۔

ابا جان کو انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔ لیکن وہ انگریزیت اور ان کے کلچر اور تہذیب کے قابو میں نہ آئے۔ وہ انگریز کو سمجھتے تھے اور انگریز ان کو سمجھتا تھا اسی لئے ان کو سر کا خطاب دیا۔ انگریز جانتا تھا کہ اقبال کو اس کے ارادوں اور عقیدوں سے کوئی نہیں روک سکتا اور یہ کہ اقبال کو اپنی قوم اور وطن سے عشق ہے انگریز میں یہ صفت ضرور ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اپنی فیلڈ میں ماہر ہے یا کوئی کارنامہ انجام دیتا ہے تو اس کی قدر کرتے ہیں اسی لئے ان کو سر کا خطاب ملا۔ ابا جان گول میز کانفرنس میں بھی گئے۔

ہندو بھی جانتا تھا کہ اقبال صاف گو ہے اور قابل ہے کہ اسے سوئی ہوئی قوم کو

جگانا آتا ہے اور اپنی شاعری سے لوگوں کے دلوں کو ہلا سکتا ہے اقبال سے خوف کھاتے تھے لیکن جب انہوں نے ہندی ترانا لکھا۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا وہ بہت خوش ہوئے کہ اقبال کے دل میں ہندوستان کی محبت ہے اور لگاؤ ہے اس کو سمجھا کر اس کے دل سے علیحدہ ملک کا خیال نکال سکتے ہیں۔

ایک دفعہ مسز سروجنی نائیڈو کسی نہ کسی طرح اقبال کو گاندھی کے پاس لے جانے میں کامیاب ہو گئیں اس کا خیال تھا کہ گاندھی جی بڑے پیار محبت سے اقبال کو اس کے خیال سے باز رکھ سکتے ہیں ۱۰ منٹ مقرر ہوئے تھے لیکن ان کی گفتگو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ مسز سروجنی نائیڈو کا خیال تھا کہ ایک گھنٹہ کی بات چیت سے گاندھی جی نے اقبال کو شیشے میں اتار لیا ہوگا۔ باہر آئے تو سروجنی نائیڈو نے پوچھا کیا بات چیت ہوئی بڑی لمبی گفتگو ہوئی ہے اقبال نے جواب دیا۔ گاندھی جی بہت شریف النفس انسان ہیں۔ ٹھیک شخص ہیں امور خوراک کے ماہر ہیں اس لئے ان کی صحت اچھی ہے۔ مجھے بھی انہوں نے بکری کا دودھ پینے کا مشورہ دیا ہے۔ یعنی اپنے مشن میں گاندھی کامیاب نہ ہو سکے۔

اقبال اور عورت کا مقام۔ . . اقبال کی نگاہ میں عورتوں کا مقام بہت بلند ہے وہ کہتے ہیں کہ ہماری عورتوں کو معلوم ہی نہیں کہ خدا نے ان کو کتنے حقوق دیئے ہیں اور وہ مردوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔ اس لئے عورتوں کو قرآن پڑھنا چاہئے سمجھ کر پھر ان کو پتہ چلے گا کہ مرد ان سے کتنی بے انصافیاں کرتے ہیں اور وہ اپنا حق مانگنے کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہیں۔ اسلام کے دائرے میں رہ کر۔ لیکن اقبال عورتوں کی آزادی کے خلاف تھے۔ عورتوں کا کھلم کھلا گھومنا پھرنا غیر مردوں

سے میل جول بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عورت کا مقام گھر ہے۔
خوبصورت ، صحت مند بچے پیدا کرے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح معنوں میں کرے
۔ان کو تیار کرے کہ وہ اسلام کی خدمت کریں اور مجاہد بنیں شہید بنیں۔

آزادیِ نسواں

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں نہیں کر سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش

مجبور ہیں معذور ہیں ، مردانِ خرد مند
نہ پردہ ، نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد

عورت اور تعلیم

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اس علم کو اربابِ نظر موت

عورت کی ان کے دل میں قدر و منزلت بھی بہت تھی کہتے ہیں

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اس کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

انہوں نے عورتوں پر اور بھی بہت اشعار کہے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی

قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ

لاجان عورتوں کی اعلیٰ تعلیم خاص کر انگریزی تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عورت کی شرم وحیا، گھر داری بچوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیتے تھے۔ اگر عورت مردوں کی طرح گھر سے باہر رہے گی تو گھر کا سکون اور چین بکھر جائے گا۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ کابل کے بادشاہ نادر شاہ نے علامہ اقبال، سرراس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ وہ ان سے اپنے ملک کی تعلیمی حالت جو اس وقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اصلاح کے لئے مشورہ وغیرہ لینا چاہتا تھا تاکہ افغانستان میں تعلیم کا نظام درست اور عام کیا جائے۔

افغانستان کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے سرراس مسعود کی بیوی نے بھی افغانستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر علامہ اقبال کا مشورہ ضروری تھا۔ علامہ نے فرمایا یہ ناممکن ہے۔ افغانستان کی حکومت نے اپنے ثقافتی اور تعلیمی نظام کی اصلاح کے لئے بلایا ہے۔ ہمارے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے پر جو اثر مرتب ہوگا وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے اس سے شاید مسلمان ماہرین تعلیم کے نظریات پر ان کا وہ اعتماد باقی نہ رہے جس کی بنا پر انہوں نے اس وفد کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو یہ تینوں حضرات کابل روانہ ہوئے۔ لاجان شاہ کے لئے قرآن مجید کا نسخہ ساتھ لے گئے تھے۔ پیش کرتے ہوئے فرمایا حضور آپ کے لائق

مجھے اور کوئی تحفہ مناسب نہ لگا اہل حق کی یہی دولت و ثروت ہے اسی میں قوم کی نجات ہے ۔ جب بادشاہ نے یہ تحفہ وصول کیا اس وقت اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا ان کے چہرے پر عجیب کیفیت تھی اور آنسو جاری ہو گئے تھے اور فرمایا یہی آسمانی کتاب میری ساتھی ، غمگسار ہے۔ میرے اچھے اور برے دنوں میں یہی میرے دل کو سکون دیتی ہے اس سے بڑا اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے! پھر مغرب کا وقت ہو گیا تو بادشاہ نے ابا جان سے امامت کرانے کے لئے کہا۔ اقبال نے کہا حضور میری عمر بھر یہی تمنا تھی کہ کسی عادل بادشاہ کی امامت میں نماز پڑھوں آپ آج مجھے اس خواہش سے محروم نہ کیجئے گا ۔ پھر بادشاہ کی امامت میں نماز ہوئی اس پر مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا ۔اعجاز احمد کی چھوٹی لڑکی آنسہ کی شادی اس وقت کے مشہور ڈینٹسٹ ولی محمد کے بیٹے سے ہوئی۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ شادی کے کچھ دنوں بعد میں لاہور کسی کام سے گیا اور معلوم ہوا کہ ولی معراج بھی آج کل لاہور میں ہیں۔ میں نے جاوید سے کہا جبکہ میری ملاقات شیزان ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی کہ آنسہ کا سسر لاہور آیا ہوا ہے میں اس کی اعجاز کے سمدھی ہونے کے لحاظ سے دعوت کرنا چاہتا ہوں کسی ہوٹل میں کروں گا۔ اس پر جاوید نے کہا میں یہ دعوت اپنے گھر پر کروں گا اور کچھ لوگوں کو مدعو کروں گا۔ میں نے کہا یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے لہذا یہ دعوت مقرر ہو گئی میں بھی پہنچ گیا اس میں چند دوستوں کے علاوہ گھر کے افراد اور رشتہ دار بھی شامل ہوئے ایک شخص جس کو باپ کا کینہ اور حسد ورثے میں ملا تھا بھی موجود تھا وہ تھا شیخ اعجاز کا چھوٹا بھائی مختار احمد اور شیخ عطا محمد کا لڑکا۔

جب کھانا وغیرہ ختم ہوا گپ شپ شروع ہوئی تو میں نے ابا جان کے افغانستان جانے کے اور قرآن پاک کا نسخہ تحفہ دینے کا اور بادشاہ کی امامت میں نماز پڑھنے کا قصہ

بیان کیا۔ تو اچانک مختار نے اپنی کمینے پن اور حسد کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا اور مجھ کو مہمانوں کے سامنے ذلیل یا بدنام کرنے کی کوشش کی۔

وہ اس بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اقبال کبھی بادشاہ کو امامت کی درخواست کر سکتا ہے۔ اقبال کی خودی اس وقت کدھر گئی تھی۔ تم اپنے باپ کو بدنام کر رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مختار اس قدر جاہل اور لاعلم انسان تھا ویسے بھی اس کی تعلیم وغیرہ کچھ نہیں تھی۔ وہ اپنے والد کا جانشین تھا۔ رشتہ داروں کو ملتے دیکھ کر جل کے خاک ہو گیا۔ خاص کر مجھ کو کہ میرے اور جاوید وغیرہ کے تعلقات اچھے نہ ہو جائیں پھر یہ کہ مفت خورے اور مفاد پرستوں کی چودھراہٹ ختم ہو جائے گی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ شیخ عطا محمد کی روح بول رہی ہے اور میں حسب معمول چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔ جاوید کو سب معلوم ہے کیوں کہ جاوید کے گھر میں یہ واقعہ ہوا اس لئے میں خاموش رہا۔

فیضان اقبال

رشیدہ بیگم

علامہ کا روحانی تصرف ہے کہ ہمیں ان کے طفیل موقعہ و محل کی مناسبت سے عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میں چند واقعات بیان کرنا چاہتی ہوں تاکہ علامہ کے فیضان کا سلسلہ آپ کی سمجھ میں آسکے۔

(ا) میرے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر نوید اقبال ۱۹۸۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد وطن واپس لوٹے اور وہ اپنا ذاتی دفتر کراچی میں قائم کرنے کے بعد اسے اسلام آباد منتقل کرنے کا ارادہ کرنے لگے اور اسلام آباد میں ایک کرایہ کی رہائش گاہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ ایک روز اپنے مالک مکان سے گفت و شنید میں مگن تھے کہ گفتگو نے کافی طول کھینچا اور باہمی جان پہچان کی خاطر آباؤ اجداد کے بارے میں پوچھنے لگے۔ نوید نے بتایا کہ میں علامہ اقبال کا پوتا ہوں۔ علامہ اقبال کا نام سنتے ہی وہ ایک دم چونکے اور چپ سادھ لی پھر ایک ثانئے کے وقفے کے بعد گویا ہوئے کہ خدا کی شان ہے کہ کچھ لوگ اپنے اجداد کا فخریہ انداز میں نام لیتے ہیں اور کچھ اپنے اجداد کا نام لیتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔

بعدہ انکشاف ہوا کہ موصوف سر سکندر حیات خان کے پوتے تھے۔ ان کے دادا جان نے بادشاہی مسجد کی مرمت کروائی تھی اور علامہ کے آخری لمحات میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور جب علامہ نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی تو اس وقت وہ وائسرائے ہند کے پاس کلکتہ میں موجود تھے اور عمائدین شہر نے علامہ کو بادشاہی مسجد کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے کلکتہ سے ہی نامنظوری دی اور پنجاب کے انگریز گورنر نے عوامی دباؤ اور خواہش کا احترام کرتے ہوئے اجازت دی اور اپنے اثر و رسوخ سے مرکز کی منظوری حاصل کرلی۔

علامہ کے آخری لمحات زندگی میں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کی آویزش

موجود تھی۔ علامہ اقبال کی رحلت کے دو سال بعد دفعتاً" سر سکندر حیات انتقال فرما گئے اور انہیں بھی بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا لیکن عوامی غیض و غضب نے مرنے کے بعد بھی خان صاحب کا پیچھا نہ چھوڑا اور اہل خاندان نے اپنے وقار اور تزک و احتشام کی نمود و نمائش کی خاطر انھیں علامہ اقبال کی آخری آرام گاہ کے قریب ہی جگہ دلوائی لیکن آج علامہ اقبال کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور سر سکندر حیات خان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کوئی نہیں آتا بلکہ شنید ہے کہ بعض باخبر لوگ ان کی قبر پر تھوکتے ہیں۔ اس دنیا کے مال و منال کے جلو میں کچھ لوگ اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ انہیں مخلوق خدا کی ایذا رسانی کے سوا اور کوئی کام سوجھتا نہیں اور پھر خدائی قانون اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ان کے مکروہ عزائم کو خاک میں ملا دیتا ہے اور پھر قیامت کے روز کی سزا اس پر مستزاد ہو گی۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**

(۲) لندن میں قانون کی تعلیم کے حصول کے لئے علامہ اقبال کا خاندان **lincons inn** میں داخلہ لیتا رہا میرے بڑے صاحبزادے آزاد اقبال بھی اس ادارے میں بیرسٹری کرنے گئے تھے اور اختتام تعلیم پر ادارے کی طرف سے ایک الوداعی تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے اور حسب روایت بیرسٹر صاحبان ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے لئے اپنی اپنی شناخت اچھے حوالوں سے کرواتے ہیں۔ آزاد اقبال کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ساتھیوں میں ان کی ایک چچازاد بہن گیتی شیخ (علامہ اقبال کے بھانجے ظفر الحق کی صاحبزادی) بھی تقریب میں موجود تھیں۔ گیتی شیخ اپنا تعارف علامہ اقبال کی پوتی کے حوالے سے کروا رہی تھیں اور اتفاق سے آزاد اقبال کے پاس آ بیٹھیں اور اپنا تعارف کروانے کے بعد آزاد اقبال کو تعارف کی دعوت دی۔ آزاد اقبال گویا ہوئے۔ میں علامہ اقبال کا پوتا ہوں اور میری کوئی بہن نہیں اور آپ کیسے علامہ کی پوتی ہیں؟

دراصل گیتی شیخ کو علم نہیں تھا کہ علامہ اقبال کے بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال

کراچی میں مقیم ہیں اور نہ ہی آفتاب اقبال کے بیٹوں کے بارے میں انہیں کوئی معلومات تھیں لہذا جب انہیں آفتاب اقبال کی کراچی موجودگی کا علم ہوا تو وہ کراچی آنے کے بعد اپنے والد شیخ ظفر الحق (مکینکل انجینئر) کے ہمراہ ہمارے گھر ٹیپو سلطان روڈ آئیں اور یوں رشتہ داری کے قریبی بندھن کا علم ہوا اور پھر دونوں خاندان ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے اور جب بھی گیتی شیخ کو یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال سے قریبی رشتہ بڑا خوش آئند اور مبارک رشتہ ہے اور لوگ علامہ اقبال سے رشتہ داری کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں اور دل و جان سے خاندان اقبال سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار فرماتے ہیں۔

یہ بھی اقبال سے قریبی نسبی تعلق کا تاثر ہے کہ آزاد اقبال اپنے قانونی پیشے کی بدولت ایک اہم اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور قدرت نے انہیں مال و دولت اور عزت و قار سے نواز رکھا ہے اور بیچاری گیتی شیخ (علامہ کی بہن کریم بی بی کی پوتی) قانونی تعلیم میں مہارت ہونے کے باوجود نہایت ہی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

(۳) میرے صاحبزادے نوید اقبال تقریباً" ساڑھے چار سال کے پیٹے میں تھے کہ آفتاب اقبال صاحب نے لاہور کے ایچی سن کالج میں ان کا داخلہ کروا دیا۔ ان دنوں مذکورہ کالج میں داخلہ جان جوکھم کا کام تھا۔ بہر کیف نوید کو ذہانت اور کچھ سوجھ بوجھ کی بدولت داخلہ مل گیا۔

ہم لوگ ۱۹۴۷ء سے کراچی کے باسی ہیں اور ۱۹۵۷ء کے زمانے میں ایک معصوم بچے کا لاہور میں داخلہ کروا رہے تھے۔ آفتاب اقبال صاحب اپنی اولاد کو بہترین اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کے شائق تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کو دکھوں اور محرومیوں سے دوچار ہونا پڑے۔ ان کی پالیسی کا ثمرہ ہے کہ ان کی اولاد اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہے اور خوشحال زندگی گزار رہی ہے۔

میری بڑی بہن وحیدہ روشن (ہیڈ مسٹریس سردار محمد گرلز ہائی اسکول لاہور) لاہور

مقیم تھیں۔ کالج کے قواعد کے مطابق بہن وحیدہ روشن کا نام کالج میں لکھوا دیا گیا اور تعطیل کے روز نوید میاں اپنی خالہ وحیدہ روشن کے ہاں چلے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میرا لاہور جانا ہوا تو منیرہ سے مڈبھیڑ ہو گئی اور خیر خیریت کے بعد جب اسے علم ہوا کہ اس کا بھتیجا ایچی سن کالج میں پڑھتا ہے اور ابھی کم سن ہے لہذا گھر سے دوری کی وجہ سے گھبراتا ہو گا۔ انہوں نے ضد کی کہ آپ کالج والوں کو میرا نام بھی بتا دیجئے اور میں بھی اسے اپنے ہاں لے آیا کروں گی۔

ایک روز وہ نوید میاں کو گھر لے آئیں۔ اتنے میں ان کے سسر میاں امیر الدین مرحوم گھر میں داخل ہوئے اور ننھے منے بچے کو گھر میں دیکھ کر پوچھنے لگے: یہ کون ہے۔ منیرہ نے بتایا کہ بھائی جان آفتاب اقبال کا چھوٹا صاحبزادہ ، نوید ہے۔ میاں صاحب نوید میاں کو گھورتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ نوید میاں نے بڑے میاں کے تیور دیکھے تھے لہذا اپنی پھوپھو سے مخاطب ہوئے: آپ نیا گھر خریدیں گے تو میں آپ کے ہاں آؤں گا۔ ابھی تو یہ گھر ان بوڑھے میاں کا ہے۔

یہ اقبال کے فیضان کا کرشمہ ہے کہ چھ سال کا بچہ اتنی گہری بات کہہ گیا ورنہ اتنی کم عمری میں مردم شناسی کا ملکہ کہاں ودیعت ہوتا ہے۔

(۴) آزاد اقبال کو اللہ تعالیٰ نے "جہاد" سے نوازا تو دوست احباب کا تقاضا ہوا کہ انہیں بچے کی خوشی میں طارق روڈ پر تکے کھلائے جائیں۔ اپنے دوستوں کے ہمراہ آزاد اقبال طارق روڈ پر گئے۔ ان کے دوست تکے کھانے لگے اور جیسے ہی تکے خوری سے فارغ ہوئے وہ پان کے لئے قریب پنواڑی کی دکان کی طرف لپکے۔ آزاد اقبال تکے کھا رہے تھے کہ پولیس پارٹی بھتہ کی وصولی کے لئے تکا فروش کے سامان کو اتھل پتھل کرنے لگی۔ آزاد اقبال نے ان کی حرکت کو ناشائستہ قرار دیا اور پولیس پارٹی کباب فروش سے ہٹ کر آزاد اقبال کی طرف لپکی اور انہیں گاڑی میں زبردستی ڈال کر فیروز آباد تھانے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ان کے دوستوں

کی آزاد اقبال پر نظر پڑی تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کیونکہ وہ تو گھر سے خوشی خوشی اپنے دوست کے ہمراہ آئے تھے اور اب ان کا میزبان ظالم پولیس کی تحویل میں چلا گیا اور وہ حیران و ششدر کھڑے تھے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد وہ میرے پاس آئے اور پورا قصہ کہہ دیا۔ میں نے فوراً" پولیس کے اعلیٰ افسران سے رابطہ کیا اور اپنے بیٹے کی بے گناہی کا یقین دلایا۔ تھانے کے ایس ایچ او کو اوپر سے فون آیا اور آزاد اقبال کو فوری رہائی کا حکم دیا گیا۔ پولیس پارٹی کو پتہ چلا کہ یہ نوجوان علامہ اقبال کا پوتا ہے تو وہ کہنے لگے: آپ ہمیں بتا دیتے کہ میں علامہ اقبال کا پوتا ہوں تو ہمیں کیا پڑی تھی کہ آپ پر ہاتھ ڈالتے ؟

(۵) ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں لندن میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کے آغاز ہی میں حاضرین کو بتایا گیا کہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس مجلس میں علامہ اقبال کے بڑے فرزند اور ان کی بڑی بہو موجود ہیں اور میں انہیں اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔

ہم میاں بیوی ڈائس پر پہنچے تو سارے حاضرین و حاضرات احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یہ صرف علامہ اقبال کا فیضان تھا ورنہ ہم ایسے غریب الدیار جوڑے کا اک فقید المثال استقبال دیار غرب میں ناممکن تھا۔

حاضرین کے اصرار پر آفتاب اقبال صاحب سے سیکھی ہوئی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" سنائی اور ہال میں حاضرین نے تحسین سے نوازا۔

آفتاب اقبال کے لندن میں بقید حیات دوست سید سجاد شمسی نے اپنے مضمون "یادوں کی کلیاں" میں اس جلسے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

سلسلہ قادریہ میں علامہ محمد اقبال کی بیعت

تحریر: سید نور محمد قادری

حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں میر غلام بھیک نیرنگ (۱۹۵۲ء) اپنے ایک مضمون "اقبال کے بعض حالات" میں رقم طراز ہیں، ان (علامہ اقبال) کے والد ماجد ایک صوفی بزرگ تھے۔ خود اقبال سلسلہ قادریہ میں بیعت کئے ہوئے تھے۔ حکیم الامت خود بھی سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں "۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں ،میں خود بیعت رکھتا ہوں۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم کے مرشد سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون سی ہستی تھی جس کے دست حق پرست پر انہوں نے بیعت کی تھی۔ یہ فقیر (سید نور محمد قادری) اس عقدہ کو حل کرنے کے لئے ایک مدت سے تحقیق کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ سامنے آیا ہے۔ اس کی تفصیل پیش ہے۔

۱) جناب علی احمد خان صاحب جنرل منیجر پاکستان میوچل انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور اپنے ایک مضمون "حضرت قاضی سلطان محمود صاحب" میں بحوالہ مولانا روح اللہ قادری صاحب (م ۱۹۶۹ء) تحریر فرماتے ہیں۔

علامہ اقبال کے والد ماجد حضرت قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے، اپنے فرزند کو لے کر آستانہ عالیہ (آوان شریف گجرات) پر حاضر ہوئے اور دعائے خیر کے لئے معروض ہوئے۔ قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ننھے محمد اقبال کے لئے دعا فرمائی اور کہا کہ یہ لڑکا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیرو ہوگا، محمد اقبال سن شعور کو پہنچے تو ان کے والد ماجد نے قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے دست

قطبِ تفرید حضرت قاضی سلطان محمودؒ نور اللہ مرقدہٗ

علامہ اقبال کے مرشد گرامی حضرت قاضی سلطان محمود صاحب (گجرات)

حق پرست پر بیعت کرائی - نمبر ۳ (ماہنامہ 'آئینہ) لاہور اپریل ۱۹۶۵ء ، ص ۴۴۔

یہ مضمون پڑھ کر میں نے موصوف کو خط لکھا کہ اس سلسلہ میں اگر آپ کچھ مزید معلومات رکھتے ہوں تو مطلع فرمائیں ، علی احمد خان صاحب نے جولبا" تحریر فرمایا "پروفیسر سید عبدالقادر صاحب (م جنوری ۱۹۵۵ء) کہ جن سے مجھے شرف تلمذ بھی تھا ، ایک مرتبہ مجھ سے بیان کیا کہ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے ان سے خود اس بارے میں تذکرہ کیا تھا کہ میں قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق پہلے حضرت سلطان جی کے ہاں حاضر ہوا اور وہاں رویا بعد میں حضرت قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ارشاد کیا کہ تمہارا فیض حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال سرہند پہنچے اور فیض یاب ہوئے۔ نمبر ۴ (مکتوب علی احمد خان بنام راقم الحروف ۸/ دسمبر ۱۹۶۵ء۔

اس کے بعد مجھے مولانا روح اللہ صاحب قادری کی خدمت میں حویلی میاں خان موچی دروازہ لاہور حاضر ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا لیکن اس وقت موصوف قوت گویائی اور قوت سماعت سے تقریبا" محروم ہو چکے تھے۔ کوئی بات نہ ہو سکی۔ صرف اشاروں میں انہوں نے حضرت علامہ کی بیعت کی تصدیق فرمائی۔

۲) علامہ اقبال کے مخلص دوست فقیر سید وحید الدین مرحوم مصنف "روزگار فقیر" سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے جولبا" تحریر فرمایا، جہاں تک علامہ اقبال کی بیعت ہونے کا تعلق ہے روزگار فقیر جلد دوم میں صفحہ نمبر ۱۲۸ پر مرحوم کے عزیز بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی جانب سے اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب نے لکھا ہے کہ "علامہ اقبال کی نظر میں میاں جی (صوفی شیخ نور محمد والد ماجد حضرت علامہ) کا وہی مرتبہ تھا جو ایک مرید کی نظر میں مرشد کا ہوتا ہے۔" شیخ صاحب نے مزید لکھا ہے کہ

اگر ڈاکٹر صاحب کا اپنے والد کا مرید ہونا لفظاً" نہیں تو معنوی طور پر یقیناً" درست تھا ،علاوہ ازیں روزگار فقیر جلد اول صفحہ ۱۹۸ پر علامہ کے والد کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے قطعہ تاریخ بھی نقل کیا گیا ہے۔ جو علامہ کے والد بزرگوار کی لوح مزار واقع سیالکوٹ پر آج بھی کندہ ہے۔

پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت
ماہمہ راہرواں منزل مالک لحد
ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آواز اثر رحمت و آغوش لحد

اس قطعہ تاریخ وفات میں علامہ نے اپنے والد گرامی کو براہ راست "پدر و مرشد" کے نام سے خطاب کیا ہے۔ علامہ کے خاندانی ریکارڈ اور حوالوں سے جو بات راقم الحروف کے علم میں آئی ہے۔ من و عن "روزگار فقیر" میں شامل کر دی گئی ہے۔ اوز کوئی ایسی کہنے یا لکھنے کی ذمہ داری قبول نہیں کی گئی ہے۔ جس کے لئے راقم کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت اور مستند حوالہ موجود نہ ہو۔" نمبر ۵ (مکتوب فقیر سید وحید الدین بنام راقم الحروف مورخہ ۱۰/ دسمبر ۱۹۶۶ء۔

۴) مولانا عبداللہ قریشی صاحب سابق مدیر رسالہ "ادبی دنیا" لاہور اپنے ایک مضمون "اقبال اور طریقت" مشمولہ کتاب "آئینہ اقبال" شائع کردہ مکتبہ آئینہ ادب لاہور کے صفحہ ۲۵۴ پر لکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات آپ کی معلومات میں اضافے کا باعث ہو گی کہ اقبال خود بھی بچپن سے سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود صاحب رحمتہ اللہ علیہ آوان شریف کے مرید تھے جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔

جناب مولانا عبداللہ قریشی صاحب کے مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ کے بعد میں

لاہور گیا اور ان سے ملاقات کی اور دریافت کیا کہ حضرت علامہ اقبال کی بیعت والی بات آپ نے کہاں سے لی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا۔ "اس کے راوی میرے محترم بزرگ مولانا حکیم محمد روح اللہ قادری ہیں۔ چونکہ مولانا نہایت ہی ثقہ اور متدین بزرگ تھے اس لئے اس روایت کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔"

حکیم محمد حسن قرشی صاحب (متوفی ستمبر ۱۹۷۴ء) سے بھی رابطہ قائم کیا اس سلسلہ میں ان کے دو تین خطوط بھی راقم الحروف کے نام آئے لیکن کوئی نئی بات سامنے نہ آئی۔

۵) حضرت صاحبزادہ محبوب عالم صاحب دام فیوضہ (سجادہ نشین آوان شریف) سے عرض کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ 'میں اس بات کی نہ تائید کرتا ہوں اور نہ تردید۔ ہاں اگر حافظ عبداللہ شاہ صاحب اور مولوی نور اللہ شاہ صاحب اس وقت زندہ ہوتے تو وہ اس مسئلہ پر بہتر روشنی ڈال سکتے تھے کیونکہ وہ علامہ اقبال کے ہم محلہ اور ہم عصر تھے۔

۶) حضرت قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے حافظ عبداللہ شاہ صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ حضرت قاضی صاحب جب مزارات عالیہ کی زیارت کے لئے سیالکوٹ جاتے تو حافظ صاحب کے گھر بھی تشریف لے جاتے۔ جہاں ان کے عقیدت مند اور اہل محلہ زیارت کے لئے جمع ہو جاتے۔ حضرت علامہ اقبال کے والد ماجد صوفی نور محمد صوفیائے کرام کے ازحد معتقد تھے۔ جب بھی گردونواح میں کسی بزرگ کے ورود فرمانے کا سنتے تو زیارت کے لئے حاضر ہوتے ، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قاضی صاحب جیسے عظیم بزرگ اور صوفی ان کے اپنے محلہ ہی میں تشریف لاتے رہے ہوں اور کسب فیض کے لئے حاضر نہ ہوتے رہے ہوں یہ بات قرین قیاس ہی نہیں بلکہ یقینی ہے کہ وہ ان ملاقاتوں میں حضرت قاضی صاحب کی زبردست شخصیت سے متاثر ہو کر بیٹے

(علامہ اقبال) سمیت حضرت سے بیعت ہو گئے ہوں۔ شیخ نور محمد سیالکوٹی نہ صرف خود سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تھے بلکہ انہوں نے حضرت علامہ کو بچپن میں حضرت قاضی صاحب سے بیعت کرا لیا۔ اقبال کے مایہ ناز فرزند جسٹس جاوید اقبال "زندہ رود" جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نور محمد سلطان العارفین قاضی سلطان محمود رحمتہ اللہ علیہ دربار آوان شریف (گجرات) کے مرید تھے جو قادریہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی بنا پر اقبال بھی بچپن سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کئے ہوئے تھے۔

چونکہ یہ مسئلہ کہ حضرت علامہ کس بزرگ سے بیعت تھے۔ ان کی وفات کے تقریباً " ۴۰ سال بعد حل ہوا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قدرے تفصیل قارئین کے سامنے پیش کر دی جائے۔ اس ضمن میں کئی ایسی باتیں بھی ہیں جو پہلی دفعہ قارئین کے سامنے آ رہی ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ قارئین اور عقیدت مندان اقبال اس سے برابر مستفید و مستفیض ہوں گے، ملاحظہ ہو۔

میرے بچپن میں جب میرے حقیقی عم محترم مولوی نور اللہ شاہ صاحب نور (م ۱۹۴۹ء) ساکن کشمیری محلہ شہر سیالکوٹ والد مکرم حافظ عبد اللہ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۹۴۱ء) خلیفہ مجاز حضرت قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے کے لئے تشریف لاتے تو محلہ کے جن بزرگوں کا ذکر ہوتا ان میں سے حافظ سلطان اور شیخ نور محمد صاحب عرف نتھو ٹوپیاں والا کے نام اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس کے

بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے چچا زاد بھائی سید مقبول حسین سے معلوم ہوا ہے کہ شیخ نور محمد اور ان کے بیٹے علامہ اقبال بھی ہمارے خاندان کی طرح حضرت قاضی صاحب کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ پھر جب تعلیم مکمل کرنے کے بعد عام مطالعہ کا دور آیا تو حضرت اقبال پر لکھی ہوئی کتابوں سے اتنا تو معلوم ہوا کہ حضرت علامہ سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ لیکن ان کے مرشد کے اسم گرامی کا پتہ نہ چل سکا یہاں تک کہ ماہنامہ "آئینہ" لاہور کی اپریل ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں جناب علی احمد خان صاحب جنرل منیجر پاکستان میوچل انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور کا مضمون بعنوان "حضرت قاضی سلطان محمود صاحب" نظر سے گزرا جس میں انہوں نے مولانا روح اللہ صاحب قادری (م ۱۹۶۹ء) کے حوالہ سے مندرجہ ذیل سطور لکھیں۔

علامہ اقبال کے والد محترم قاضی صاحب کے مرید تھے۔ اپنے فرزند کو لے کر آستانہ عالیہ "آوان شریف" پر حاضر ہوئے اور دعائے خیر کے لئے معروض ہوئے ۔ قاضی صاحب نے ننھے محمد اقبال کے لئے دعا فرمائی ور کہا یہ لڑکا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیرو ہوگا۔ محمد اقبال سن شعور کو پہنچے تو ان کے والد نے قاضی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کرائی۔" نمبر ۶۔

اس کے بعد مولانا عبداللہ قریشی صاحب سابق مدیر "ادبی دنیا" لاہور کی کتاب "آئینہ اقبال" میں مندرجہ ذیل سطور نظر سے گزریں۔

یہاں یہ بات شاید آپ کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہو کہ اقبال خود بھی بچپن سے سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود صاحب آوان شریف کے مرید جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔" نمبر ۷۔

ان حوالوں سے جب میرے برادر محترم سید مقبول حسین کی تصدیق ہوئی تو مجھے

اس سلسلہ میں مزید تحقیق و جستجو کا شوق پیدا ہوا تو میں لاہور جا کر مولانا عبداللہ قریشی صاحب ، مولانا روح اللہ صاحب قادری اور جناب علی احمد خان صاحب سے ملا۔ اس کے علاوہ فقیر سید وحید الدین صاحب مصنف روزگار فقیر اور حکیم محمد حسن قرشی صاحب مرحوم سے بھی خط و کتابت کی۔ ان تمام اصحاب نے میرے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنی معلومات کو مختصراً" ترتیب دے کر ماہنامہ "ضیائے حرم" لاہور کے اپریل ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں بعنوان "سلسلہ قادریہ میں علامہ اقبال کی بیعت" میں شائع کروادیا۔

جب یہ مضمون جناب سید نذیر نیازی صاحب دام ظلہ کی نظر سے گزرا تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے میرے ساتھ حضرت قاضی صاحب کے موجودہ سجادہ نشین سیدی و مرشدی جناب صاحبزادہ محبوب عالم صاحب زید لطفہ ، کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنایا۔ جسے وہ اپنی بیوی کی شدید علالت کی وجہ سے پورا نہ کر سکے۔ آواخر فروری ۱۹۷۸ء میں ، میں نے یہ مضمون جناب جسٹس جاوید اقبال کی خدمت میں مطالعہ کے لئے ارسال کیا تو انہوں نے جواباً" تحریر فرمایا۔

عین ممکن ہے کہ علامہ بچپن میں اپنے والد کی وساطت سے حضرت قاضی سلطان محمود صاحب سے قادریہ سلسلہ میں بیعت ہوں۔ نمبر ۸۔

اس کے بعد بھی ان سے اس موضوع پر میری گفتگو جاری رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک خط میں اس مسئلہ کو بالکل صاف کرتے ہوئے کہا۔

یہ بات ہمارے خاندان میں بیشتر کو معلوم ہے کہ حضرت علامہ کے والد حضرت قاضی سلطان محمود صاحب آوان شریف والوں سے بیعت تھے اور بچپن میں حضرت علامہ اقبال کو بھی آوان شریف ان کی بیعت کے لئے لے گئے۔" نمبر ۹۔

اس کے بعد ۲۹/ مارچ ۱۹۸۰ء کو جسٹس جاوید اقبال صاحب سے ان کے چیمبر میں ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ آپ نے خط میں جو یہ لکھا ہے کہ ہمارے خاندان کے بیشتر افراد کو معلوم ہے کہ حضرت علامہ حضرت قاضی صاحب سے بیعت تھے۔ یہاں بیشتر افراد سے مراد کون اصحاب ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اس کے راوی میرے حقیقی پھوپھا شیخ غلام رسول مرحوم وزیر آبادی ہیں جو بڑے متدین اور ثقہ بزرگ تھے۔ لیکن اس بات کی تصدیق ان کی زبانی اس وقت ہوئی جبکہ 'زندہ رود' کا مسودہ ترتیب پاچکا تھا۔ اب کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس کا مفصلا" ذکر ہوگا۔

اب آیئے حضرت علامہ کے ماحول کی طرف۔ خوش قسمتی سے حضرت علامہ کو ماحول بھی دیندارانہ اور درویشانہ ملا۔ ان کے محلہ کی علمی ودینی فضا میں گجرات سے آئے ہوئے ایک سید گھرانے کا بھی بڑا تعلق تھا۔ آج سے کوئی ایک سو تیس برس پہلے اس خاندان کے بزرگوں مولوی سید چراغ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۸۸۷ء) تحصیل علم کے لئے گجرات کے مضافات میں سے ایک چھوٹے سے گاؤں "بوکن" سے سیالکوٹ آئے اور اپنے دور کے سب سے بڑے عالم وفاضل مولانا غلام مرتضٰی صاحب کے درس میں شامل ہوگئے۔ تحصیل علوم کے بعد کشمیری محلہ ہی میں مکان خرید کر مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ حضرت قاضی سلطان محمود صاحب آوان شریف والوں سے آپ کے بڑے مراسم تھے۔ جب قاضی صاحب مزارات عالیہ کی زیارت کے لئے سیالکوٹ تشریف لاتے تو شاہ صاحب سے اکثر ملاقات رہتی۔ ۱۸۸۰ء کو شاہ صاحب نے اپنے سب سے بڑے لڑکے حافظ عبداللہ صاحب کو حضرت قاضی صاحب سے بیعت کروایا تو مراسم مستحکم ہوگئے۔ اب قاضی صاحب جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو حافظ عبداللہ شاہ صاحب کے ہاں بھی قیام فرماتے جہاں کشمیری محلہ

اور ارد گرد کے لوگ کسب فیض اور حصول سعادت کے لئے حاضر ہوتے۔ سیالکوٹ شہر کے اکثر لوگ حافظ عبداللہ شاہ صاحب ہی کی معرفت حضرت قاضی صاحب کے دربار پر انوار میں پہنچے۔ میرے پاس مولانا عبدالکریم اشراقی مرحوم کا ۱۹۱۵ء کا لکھا ہوا ایک خط محفوظ ہے جس میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ وہ حافظ صاحب ہی کے توسط سے دربار آوان شریف میں پہنچے تھے۔ حافظ صاحب کا سب سے بڑا لڑکا حافظ شاہ ولایت ۱۹۱۴ء میں جب شدید بیمار ہو گیا تو قاضی صاحب نے حکیم اجمل خاں مرحوم کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا جو "مقامات محمود" تالیف نواب معشوق حسین خان مترجم ابن رشد و فلسفہ ابن رشد کے صفحات ۳۴۷ تا ۳۴۸ پر چھپا ہوا ہے۔ یہ تعارفی خط قاضی صاحب نے حافظ صاحب کے گھر کشمیری محلہ ہی میں تحریر کیا تھا۔

بڑی بہو کا علامہ اقبال کے گھرانے سے تعارف

رشیدہ بیگم

منیرہ سے پہلی ملاقات: عنایت بیگم (علامہ اقبال کی بھتیجی) سے پہلی ملاقات ریلوے کوارٹرز میں ہوئی۔ عنایت کی بیٹیاں سردار محمد گرلز ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس میری بڑی بہن وحیدہ روشن تھیں۔ اسکول سے عنایت بیگم کو پتہ چلا کہ وحیدہ روشن میری بہن ہیں۔ یوں عنایت بیگم نے یہ بات منیرہ کے کان میں ڈال دی ۔عنایت بیگم نے منیرہ سے میری ملاقات کا انتظام کیا۔ اس ملاقات کی بھنک منیرہ کے گارجین اور پھوپھی کریم بی بی مرحومہ کے کان میں نہیں پڑی ورنہ وہ اس ملاقات میں مزاحمت کرتے اور اپنی دیرینہ پالیسی پر گامزن ہوتے ہوئے علامہ اقبال کی بیٹی اور بیٹوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ پھٹکنے دیتے۔ ان کی نظر میں علامہ اقبال کی اولاد کا آپس میں میل جول ان کا "جاوید منزل" میں داخلے کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بن جاتا۔ جاوید منزل ڈیرہ جمانے والے علامہ کی مشکلات میں اضافے کا سبب تھے ۱۹۳۵ء میں علامہ کی بیوی سردار بیگم نے دم کیا توڑا ، مصائب کا پہاڑ کھڑا ہو گیا اور علامہ کی تخلیقی سرگرمیوں میں انحطاط ، مختلف عوارض نے شدت سے گھیرا اور کچھ یگانوں کی ریشہ دوانیوں نے زندگی اجیرن کر دی۔

علامہ اپنی زوجہ کے انتقال کے بعد صرف تین سال زندہ رہے ، مس ڈورس نے جاوید اور منیرہ کی اچھی نگہداشت کی اور علامہ اکیلے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ علامہ کی وفات کے پانچ سال بعد کم عمری میں میں ازدواجی بندھن میں بندھ گئی۔ افراتفری میں کلکتہ چل دیئے اور تقریباً دو سال بعد ۱۹۴۵ء میں لاہور واپس لوٹے۔ گجرات سے "اماں" بھی اپنے بیٹے آفتاب اقبال کے پاس رہنے کے لئے آگئیں۔ "لالہ زار کوٹھی" کرائے پر لی اور آفتاب اقبال صاحب نے پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۴۷ء میں "اماں" کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لئے عنایت بیگم اور پھوپھی کریم بی بی مرحومہ آئیں۔ عنایت بیگم سے مس منیرہ (ابھی منیرہ کی

شادی نہ ہوئی تھی) کو میرے متعلق علم ہوا تو وہ میرے سے ملنے کی خواہش مند ہوئیں۔ عنایت بیگم نے انتہائی دانشمندی سے کام لیتے ہوئے منیرہ سے میری ملاقات کا انتظام کر دیا۔ گارجین اور پھوپھی کریم بی بی اس ملاقات سے بے خبر رہے۔

مس منیرہ ہم دونوں کو تپاک سے ملیں۔ سچی بات ہے مجھے بھی منیرہ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ بڑی بھولی بھالی، معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی تھیں۔ اس ملاقات کی ایک بات ابھی تک میرے ذہن پر نقش ہے اور شاید منیرہ (وہ غالباً" پندرہ سال کے پیٹے میں تھی) بھول گئی ہو۔ منیرہ کہنے لگیں: بھابھی جان! میں نے سنا ہے کہ آپ گانا بہت اچھا گاتی ہیں، مجھے کچھ سنائیں۔ میں نے موقعہ کی مناسبت سے ایک فلمی گانے کے دو بول سنائے (ان دنوں لاہور میں چلنے والی فلم کے بول تھے)

دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی
آکاش کے تاروں کو . . . . .

اس پر منیرہ نے کہا: آپ یوں کہئے چار دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی)۔ اس کی مراد جاوید، منیرہ، آفتاب اقبال اور میری ذات تھی۔

اس ملاقات کے بعد غالباً" اس کی شادی ہو گئی (ویسے منیرہ کی شادی ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی) اور ہم ۱۹۴۷ء کی پہلی سہ ماہی میں روزگار کی تلاش میں ساہیوال روانہ ہو گئے۔ پھر شہروں کے فاصلے حائل ہو گئے اور منیرہ اپنے گھر والی ہو گئی لہذا دوبارہ اس سے ملاقات نہ ہوئی کافی عرصے بعد کراچی سے لاہور آئی، میں عموماً" اپنی بہن وحیدہ روشن کے ہاں روشن ہاؤس میں ٹھہرتی تھی۔ ان دنوں میرے چھوٹے بیٹے نوید نے ایچی سن کالج میں داخلہ لیا تھا اور وہ صرف تعطیل کے روز میری بہن کے ہاں جا سکتا تھا۔ منیرہ کا بیٹا یوسف بھی ایچی سن کالج میں پڑھتا تھا اور نوید سے دو سال آگے تھا۔

اتفاقاً" منیرہ سے ملاقات ہو گئی۔ بڑے تپاک سے ملیں اور کہنے لگیں: نوید میرا بھتیجا ہے، کالج والوں کے پاس میرا نام بھی لکھوا دیجئے تاکہ وہ میرے ہاں بھی آجایا کرے۔ سچ ہے

اداس ہو جاتا ہو گا۔

تقریباً" ساڑھے چار سال کی عمر میں نوید کو داخلہ دلوایا تھا۔ یہ ادارہ تعلیم اور تربیت کے لئے ایک منفرد اہمیت کا حامل تھا۔ ہمارے سابق صدر فاروق احمد لغاری صاحب بھی اسی ادارے کے فارغ التحصیل ہیں۔

لاہور کے رئیس میاں نظام الدین صاحب (ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر کے خالو اور ایم اسلم کے والد) کی بیٹی میاں امیر الدین صاحب سے بیاہی ہوئی تھی۔ میاں امیر الدین صاحب علامہ اقبال کے بچوں (جاوید اور منیرہ) کے گارجین کی فہرست میں شامل تھے۔

علامہ اقبال کی وفات کے گیارہ سال بعد منیرہ کی شادی میاں امیر الدین کے صاحبزادے میاں صلاح الدین سے ہو گئی۔ آفتاب اقبال مرحوم اس رشتے کے خلاف تھے۔ لہذا میاں امیر الدین مرحوم کی پالیسی تھی کہ یہ بھائی بہن آپس میں مل نہ بیٹھیں۔ اس کا اشارہ نوید کے واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ میاں امیر الدین کو آفتاب اقبال کی مخالفت کی وجہ سے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ علامہ اقبال کی زندگی میں یہ رشتہ کبھی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ بازار دنیا میں پیسے کے زور پر ہر چیز کو خریدا جا سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں خودی کا مبلغ اپنی بیٹی ایک سرمایہ دار کی بہو نہ بننے دیتا۔

بہر کیف ایک حقیقت کا اظہار کر دیا ہے اور اپنی عمر کی اس منزل پر اب دبیز پردوں میں رازوں کو دفن کرنے سے بہتر ہے کہ انہیں فاش کر دیا جائے اور اس سے گھٹن دور ہوتی ہے میرے گمان سان میں بھی نہ تھا کہ کسی روز قلم سے ان رازوں کو فاش کرنے کا کام انجام دوں گی۔

جاوید سے ملاقات: پاکستان کی تخلیق کے زمانے میں ہماری رہائش گاہ پاکستان چوک کے قریب اسٹریچن روڈ پر واقع دگل مینشن، نامی بلڈنگ کے ایک پگڑی (پنجاب والے مغالطے میں نہ پڑ جائیں کراچی میں اب بھی فلیٹ کی پگڑی ایک موٹی رقم کی صورت میں لی جاتی ہے اور معمولی ماہوار کرایہ دینا پڑتا ہے) کے فلیٹ میں ہوئی تھی۔ وقار اقبال اور نوید اقبال اسی فلیٹ

میں پیدا ہوئے تھے۔ بعدہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہم نے پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں خالد بن ولید روڈ پر واقع 'فوزیہ' نامی کوٹھی کرائے پر لے لی۔ چند سال بعد رازی روڈ پر واقع بنگلہ نمبر M-44 میں اٹھ آئے۔

تقریباً" ۱۹۶۱ء کے لگ بھگ ہمارے گھر پر ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ اس دعوت میں شیخ اعجاز احمد (وہ ۱۹۴۷ء سے کراچی میں مقیم تھے) اپنے ساتھ جاوید اقبال کو بھی لیتے آئے۔

شیخ صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ براہ راست دونوں بھائیوں کو مل بیٹھنے کا موقع فراہم کرتے میں تو یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ جس فریضے کو شیخ اعجاز احمد کے والد محترم نے انجام دیا تھا وہ شاید شیخ اعجاز احمد کو تفویض کر گئے کہ ان دونوں بھائیوں کو مل بیٹھنے کا موقع فراہم نہ کرنا۔ اس فریضے کو کمال خوبی سے انجام دیتے دیتے ۱۹۹۴ء میں شیخ اعجاز احمد چل دیئے اور ہر کسی کو اس سرائے فانی سے وقت معینہ پر کوچ کرنا ہے۔ اب قدرت کی شان ملاحظہ کیجئے کہ آفتاب اقبال کی فوتیدگی کی خبر جاوید اقبال صاحب نے ایبٹ آباد کے ایک اخبار میں پڑھی اور فورا" میرے سے رابطہ کیا اور پھر انہوں نے دو صفحے کا تعزیتی خط بھیجا۔ آفتاب اقبال صاحب کے " تعزیتی" خطوط والے حصے میں اسے دے رہی ہوں۔

وہ تعزیت کے لئے بنفس نفیس کراچی تشریف لائے تھے اور اتفاقا" میں لاہور گئی ہوئی تھی اور ان کی آمد کو آزاد اقبال نے اپنے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر دیا ہے۔ اور یہ تصویر میرے پاس موجود ہے۔

مجھے The Pakistan Times میں جناب احسان قریشی صابری (علامہ خالد محمود کے برادر اکبر) کا ایک مراسلہ پڑھنے کا اتفاق ہوا اور لاہور کے ایک قاری نے اس کا جواب ایڈیٹر کے نام خطوط میں جاوید اقبال کی زبانی دے دیا۔

اور اب مذکورہ بالا صورت حال کے پیش نظر دنیا والے واقعی دلوں کو ملنے نہیں دیتے۔ دوسری بار جاوید اقبال صاحب نے ہمیں 'جاوید منزل' بلایا تھا۔ ہم میاں بیوی یرقان کے

جان لیوا حملے کے بعد تبدیلی آب وہوا کے سلسلے میں لاہور گئے تھے۔ اس موقع پر جاوید اقبال اور آفتاب اقبال کی پھوپھیاں (طالع بی بی کا ۱۹۰۲ء میں انتقال ہو گیا تھا) زینب بی بی، فاطمہ بی بی اور کریم بی بی ہو سکتی ہیں۔ کھانے کے بعد ہمیں اندر بیٹھک میں لے گئے۔

آفتاب اقبال اپنی پھوپھیوں سے مل کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ میں خاموش دور بیٹھی تھی۔ مجھے چھپ کر باتیں سننے کی عادت نہ تھی۔ وہ آفتاب اقبال سے مختلف قسم کے سوالات کر رہی تھیں اور بعض سوالات میری ذات سے متعلق تھے۔ میں چپ چاپ سب کچھ سن رہی تھی۔

گھر واپس لوٹے تو آفتاب اقبال صاحب میرے پر بگڑے کہ تم میری پھوپھیوں سے دور کیوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھنے میں کیا حرج تھا۔ میں نے جواب دیا کہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی اور پہلی ملاقات کے بعد آدمی کھل کر بات کرتا ہے۔ پہلی ملاقات تو صرف معمولی شناسائی تک محدود ہوتی ہے۔ میں ویسے آفتاب اقبال صاحب کی پھوپھیوں سے متاثر نہیں ہوئی ہوں۔ ان میں خلوص کی بھی کمی تھی۔ میں تو کہوں گی کہ وہ دوغلے پن کا شکار تھیں۔ آفتاب اقبال صاحب اپنے والد محترم کی طرح بالکل بھولے بھالے تھے اور عزیزوں کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ پھوپھی زینب بی بی اور پھوپھی کریم بی بی سے یہ آخری ملاقات تھی۔ وہ اپنے بڑھاپے کی وجہ سے کراچی کا طویل سفر کرنے سے گریزاں تھیں اور ہمارا لاہور کبھی کبھار جانا ہوتا تھا۔ اس طرح میں علامہ کی بیٹی منیرہ، بیٹے جاوید اقبال اور علامہ کی دو بہنوں (زینب بی بی اور کریم بی بی) سے ملی۔ علامہ اقبال کے والدین اور بڑے بھائی شیخ عطا محمد میری شادی سے پہلے ہی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔

۱۹۴۷ء میں "اماں" کے انتقال پر عنایت بیگم اپنی پھوپھی کریم بی بی کے ساتھ ہمارے ہاں باغبان پورہ میں آئی تھیں۔ جب علامہ کا ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا تو آفتاب اقبال صاحب اور اماں (کریم بی بی صاحبہ زوجہ اولیٰ علامہ اقبال) سب سے پہلے "جاوید منزل" پر حاضر ہوئے۔ ان دنوں آفتاب اقبال صاحب کلکتہ کے اسلامیہ کالج سے پروفیسری چھوڑ

کر لاہور آئے ہوئے تھے۔ علامہ کی میت پر شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے شیخ اعجاز احمد دہلی سے آئے تھے ۔ شیخ ظفر الحق بھی شملہ یا دہلی میں ہونے کی وجہ سے نماز جنازہ میں شریک نہ ہوئے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں آفتاب اقبال کی فوتیدگی پر شیخ اعجاز احمد (تایازاد بھائی) اور شیخ ظفر الحق (پھوپھی زاد بھائی) کراچی رہائش پذیر تھے۔ یکے بعد دیگرے اب یہ دونوں بھائی بھی راہی ملک بقا ہو چکے ہیں۔

جاوید اقبال صاحب صحیح دن کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔ آفتاب اقبال کی نماز جنازہ ایک بار ریجنٹ پارک لندن میں پڑھائی گئی اور دوسری بار کراچی میں ہمارے گھر کے قریب مسجد نجم میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔

شیخ اعجاز احمد سے ملاقات: ۱۹۴۸ء میں ہم 'گل مینشن' بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہائش رکھتے تھے۔ اسی فلیٹ میں ۱۹۴۸ء میں وقار اقبال عرف پاشا پیدا ہوئے۔ جب پاشے کی پیدائش کا شیخ اعجاز احمد کو علم ہوا تو وہ اپنے بڑے بیٹے تحسین احمد کے ہمراہ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ انہوں نے مبلغ پانچ سو روپے بچے کی نذر کیے۔ ان دنوں وہ داؤد پوتا روڈ پر واقع ایک ملٹری بیرک میں رہائش رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد وہ دہلی سے کراچی پہنچے اور یہ بنگلہ انہیں الاٹ ہوا۔ بعد ازاں وہ اپنی ذاتی کوٹھی میں PECHS کے علاقے میں رہائش پذیر ہوئے۔ انہوں نے اپنی پہلی رہائش گاہ کو "پاپوش سازی" کے ایک کارخانے کا روپ دے دیا۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے نعیم احمد مزاحاً" کہا کرتے ہیں کہ ہمارے بڑے یعنی صوفی نور محمد برقعے اور ٹوپیاں سیا کرتے تھے اور یوں لوگوں (خواتین) کے سروں کو ڈھانپتے تھے اور ہم سر سے پاؤں پر آگئے اور پاؤں کو ڈھانپنے کے دھندے میں مگن ہیں یعنی جوتے تیار کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم میاں بیوی یرقان کے موذی مرض کا شکار ہوئے اور علاج کی خاطر مسیونتھ ڈے ہسپتال (انتہائی گراں ہسپتال) میں داخل ہوئے تو ہماری مزاج پرسی کے لئے

شیخ اعجاز احمد اپنی صاحبزادی عاصمہ کے ہمراہ تشریف لائے۔ ان کی صاحبزادی آنسہ کی شادی تک ہمارے مراسم مناسب تھے لیکن پھر شیخ اعجاز احمد کے چھوٹے بھائی مختار احمد کی ایک آدھ بد تمیزی کی وجہ سے ہمیں ان سے نفرت ہو گئی۔ اور پہلے جیسے تعلقات نہ رہے۔ میرے بڑے بیٹے آزاد اقبال بڑے وسیع القلب ہیں وہ اپنوں سے ضرور ملتے ہیں۔ شیخ اعجاز احمد بھی انہیں بہت چاہتے تھے۔ شیخ اعجاز کے انتقال سے ایک دو مہینے پہلے آزاد اقبال نے ان کی اتاری اور وہ تصویر ہمارے پاس موجود ہے۔ آزاد اقبال کو انہوں نے انگریزی میں ایک خط لکھا تھا۔ کچھ خط ہمیں سید عبداللہ قادری صاحب نے واہ کینٹ سے بھیجے ہیں۔ ان کے والد سید نور محمد قادری کی شیخ اعجاز احمد سے خط و کتابت تھی اور یوں شیخ اعجاز احمد جاوید اقبال صاحب اور سید نذیر نیازی کے خطوط کو 'مشاہیر کے خطوط' کے عنوان سے اسی کتاب میں شامل کیا ہے

-حالات کے دھارے کے ساتھ خاندان کے بکھرے لوگ ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ اس کی زندہ مثال شیخ اعجاز احمد کی نواسی کی شادی منیرہ بانو کے بیٹے 'اقبال' سے ہوئی ہے اور 'اقبال' ماشاءاللہ دو بچیوں کا باپ بن چکا ہے۔ پچھلے دنوں علامہ اقبال کی بہن فاطمہ بی بی کی پوتی مسرت (شیخ ظہور احمد کی بیٹی) منیرہ بانو کے ہاں رہائش پذیر تھیں اور اسی نے ڈاکٹر جاوید اقبال کو کراچی شیخ اعجاز احمد کے گھر رابطہ قائم کر کے آفتاب اقبال صاحب کی تدفین کی اطلاع دی تھی۔ اسی مسرت کا ایک آدھ ماہ پہلے سیالکوٹ میں انتقال ہو چکا ہے۔

مسرت کے والد شیخ ظہور احمد تھے۔ جو واجبی تعلیم یافتہ تھے۔ ان کے دوسرے تین بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے پروفیسر منظور احمد تھے اور ان کا بڑا شاندار کتب خانہ تھا۔ پروفیسر صاحب انگریزی میں شاعری فرماتے تھے۔ ان کے انگریزی کلام کا نمونہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں شاید جلد ہی کامیابی ہو تو ان کا نمونہ کلام ان کے حالات زندگی کے ساتھ پیش کروں گی۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں آفتاب اقبال صاحب کے ننھیال اور ددھیال کے صاحب فہم لوگوں سے رابطہ قائم کیا لیکن ان کے عدم تعاون کی وجہ سے بڑا قلق ہوا۔ بہر کیف

جتنا کچھ ہاتھ لگا اسے آپ تک پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لوں گی۔

علامہ اقبال کے تین بھانجوں (شیخ خورشید احمد، شیخ ظہور احمد اور شیخ نور احمد) کا بہت زیادہ تذکرہ نہیں کیا گیا۔ صرف پروفیسر منظور احمد صاحب کے حوالے سے اتنا بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال کی چار بہنیں تھیں۔ حالانکہ اپنے چاروں بھائیوں میں سے پروفیسر منظور احمد ہی زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ اور ان کا ذاتی کتب خانہ نادر کتب کا خزینہ تھا اور وہ عمر بھر مجرد رہے۔

شیخ فضل الٰہی سے ملاقات: مارچ ۱۹۴۳ء میں شادی کے بعد قسمت آزمائی کی خاطر اللہ کے بھروسے پر کلکتہ جانا ہوا۔ ان دنوں علامہ اقبال کے بھانجے شیخ فضل الٰہی مرحوم کلکتہ میں رہائش پذیر تھے۔ ایک مختصر سے گھر میں رہائش تھی۔ ایک کمرہ ہمیں دے دیا، اور دوسرے کمرے میں وہ اپنی دال روٹی کی خاطر پامسٹ کا پیشہ اپنائے تھے اور ان کا یہ دھندہ صحیح چل رہا تھا۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کلکتہ کب پہنچے۔ ان کے داماد خواجہ عبدالحمید عرفانی اپنی یادداشتوں میں فرماتے ہیں کہ میری شادی ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی اور 'اقبال منزل' میں یہ آخری بارات تھی۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ فضل الٰہی صاحب ۱۹۳۶ء میں اپنی بیٹی کی شادی کے بعد کلکتہ چلے گئے ہوں اور یوں انہیں کلکتہ میں رہتے سات سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ہم ان کے پاس کچھ وقت کے لئے ٹھہرے۔

شیخ فضل الٰہی صاحب پست قد اور دبلے پتلے تھے لہذا اس مناسبت سے آفتاب اقبال صاحب نے ان کا عرفی نام بھابیڑا "بیڑ بھائی" تجویز کیا اور ہم میاں بیوی اشاروں کنایوں میں اسی نام سے بات چیت کرتے تھے۔ ایک روز وہ بازار سے سودا سلف لینے گئے اور ہم انہیں ان کے عرفی نام سے پکار کر بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ بد قسمتی سے وہ ابھی دروازے کے ساتھ ہی کھڑے تھے لہذا وہ غصے میں واپس پلٹے اور ہماری بد تمیزی پر سیخ پا ہو گئے۔ خدا خدا کر کے یہ معاملہ رفع دفع ہوا اور پھر آفتاب اقبال صاحب نے جناب فضل الحق صاحب (جو

اب بنگال کے وزیراعظم تھے) سے ملازمت کے سلسلے میں بات چھیڑی - انہوں نے فورا "پارک سرکس کے شاندار علاقے میں ہمیں رہنے کو ایک فلیٹ دلوادیا اور تقریبا" ڈھائی سو روپے ماہوار خرچہ دینے لگے۔ خدا کا کرنا ہمیں شیر بنگال کی مساعی سے جلد ہی اچھی سی نوکری مل گئی۔

۱۹۴۳ء کے بعد شیخ فضل الٰہی صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کی زوجہ اکبری بیگم، آفتاب اقبال صاحب کی تایا زاد بہن تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب "زندہ رود" میں دیئے گئے شجرے سے ان کے بچوں کا علم ہوا۔

ابھی اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں مختلف حضرات سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا اور اپنی یہی کوشش رہی کہ خاندان اقبال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ صحیح اور ٹھوس معلومات کو یکجا کیا جائے تو اتفاق سے شیخ فضل الٰہی صاحب کے نواسے سروش عرفانی (مقیم اسلام آباد) کے خط سے پتہ چلا کہ ان کے نانا اور نانی بالترتیب ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء میں اس دار فانی سے سدھار چکے ہیں۔ اور دونوں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے لیکن انہیں پشاور اور کوئٹہ شہر کی خاک میں پیوند ہونا نصیب ہوا۔

ابھی معلومات کی ٹوہ میں لگے تھے کہ ہمیں شیخ منظور احمد کے بھتیجے صفی اللہ کی لاہور میں رہائش کا علم ہوا اور چونکہ وہ اس وقت ساٹھ سال کے پیٹے میں ہیں اور خاندان کے چیدہ چیدہ افراد سے متعلق معلومات رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ شیخ فضل الٰہی مرحوم نے دو شادیاں کی تھیں۔ بہر کیف صفی اللہ صاحب سے ہمیں خاندان کے بارے میں ثقہ معلومات حاصل ہوں گی۔ وہ شاید کراچی تشریف لائیں تو ان کے چچاؤں شیخ نور احمد، شیخ خورشید احمد اور شیخ پروفیسر منظور احمد کے بارے میں معتبر معلومات حاصل ہوں گی۔ اتنی تگ و دو ہمارے خاندان کے کسی فرد نے نہیں کی اور نہ ہی اس طرف توجہ مبذول کی۔ میں بڑھاپے کے عالم میں اس کام کے لئے کوشاں ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری فراہم کردہ معلومات میں کسی قسم کی دروغ بیانی اور قصہ گوئی کا شائبہ تک نہیں کیونکہ میری معلومات کا

ماخذ ثقہ اور مستند افراد ہیں۔

سید سلطان محمود حسین صاحب نے اپنی کتاب 'اقبال کی ابتدائی زندگی' میں شیخ ظہور احمد، شیخ خورشید احمد، شیخ نور احمد اور پروفیسر منظور احمد کے بارے میں مختصر معلومات دینے کے بجائے صرف یہ اندراج کیا ہے کہ یہ لوگ انتقال کر گئے اور ان کی اولاد سیالکوٹ میں رہتی ہے۔

میں نے بڑی محنت اور واقفیت کو بروئے کار لاتے ہوئے علامہ کی بہن طالع بی بی کی اولاد کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کے بارے میں کتابوں میں تشنہ معلومات ملتی ہیں۔

شیخ ظفر الحق سے ملاقات: آزاد اقبال 'لنکنز ان' سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر لندن سے پاکستان آنے کے لئے پر تول رہے تھے کہ انہیں "لنکنز ان" کی الوداعی پارٹی میں شرکت کا موقع ملا۔ پاکستان کے کامیاب بیرسٹر حضرات میں ایک شوخ و شنگ لڑکی بھی تھی۔ وہ لڑکی اپنا تعارف "علامہ اقبال" کی پوتی کے حوالے سے کروا رہی تھی۔ آزاد اقبال کے پاس آئیں اور "علامہ اقبال" کی پوتی کے حوالے سے تعارف کروا کر آزاد اقبال کا تعارف چاہا۔ آزاد اقبال نے بتایا: علامہ اقبال کے صرف پانچ پوتے (آزاد اقبال، وقار اقبال، نوید اقبال، ولید اقبال اور منیب اقبال) ہیں ان کی کوئی پوتی نہیں۔ دو پوتیاں تھیں جو عرصہ ہوا انتقال کر گئیں اور سیالکوٹ اور لاہور میں دفن ہیں۔ لیکن خود علامہ اقبال کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال صاحب کا بیٹا ہوں اور ہمارے چچا ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے بھی صرف دو بیٹے ہیں۔ آپ کس بنا پر اپنے تئیں علامہ اقبال کی پوتی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہیں جب اس شوخ اور چنچل بیرسٹر لڑکی نے آفتاب صاحب کے بیٹے کو اپنے سامنے پایا تو بولیں: میں دراصل علامہ اقبال کے بھانجے ظفر الحق کی بیٹی ہوں اور آفتاب اقبال صاحب ان کے ماموں زاد بھائی تھے۔

لندن سے واپسی کے بعد یہ نوجوان بیرسٹر لڑکی (گیتی شیخ) اپنے والد جناب ظفر الحق صاحب کے ہمراہ ہمارے گھر ۳۳-ٹیپو سلطان روڈ وارد ہوئی اور یوں ہم ظفر الحق صاحب سے

متعارف ہوئے حالانکہ وہ بھی ایک عرصے سے کراچی میں مقیم تھے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے مکینکل انجینئر تھے اور ایک خاصہ زمانہ سعودی عرب میں گزار چکے تھے اور آخری ایام کراچی گزارے۔

انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی سے دو بچیاں رفعت اور گیتی پیدا ہوئیں۔ گیتی ابھی چند ماہ کے پیٹے میں تھیں کہ ان کی والدہ داغ مفارقت دے گئیں۔ سسرال والوں نے اپنی دوسری بیٹی شیخ ظفر الحق صاحب کے عقد میں دے دی۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا اور دوسری بیوی سے ایک بیٹی بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔

ظفر الحق صاحب ۱۹۹۰ء میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ وہ سوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہیں۔ اب دو بیٹے اور دو بیٹیاں ان کی نشانی ہیں۔ بیٹے اچھے عہدوں پر فائز ہیں اور لڑکیاں بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

والدین کے انتقال کے بعد شادی کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور بس ڈھنگ کا بر اور ڈھنگ کی بہو ڈھونڈتے ڈھونڈتے عمر بیت جاتی ہے اور جب نوجوان لڑکی یا نوجوان لڑکا جوانی کی سرحدوں کو عبور کرنے لگے تو پھر شادی کے امکانات بالکل معدوم ہو جاتے ہیں اور شومئی قسمت سے یہی صورت حال علامہ اقبال کے بھانجے ظفر الحق مرحوم کی اولاد کو درپیش ہے۔

اللہ کے کاموں میں کون دخل اندازی کر سکتا ہے۔ اور جب کسی کی قسمت کھلنے لگتی ہے تو دیر نہیں لگتی۔

میری مثال دیکھ لیجئے کہ آفتاب اقبال صاحب مناسب رشتے اور معقول تنخواہ کی خواہش میں پینتالیس سال کی عمر کو جا پہنچے تو پھر دوست احباب کے تعاون سے شادی کا بندوبست ہوا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ بچیوں کو اپنے گھروں والی اور لڑکوں کو اپنی بیوی والا بنائے۔ دو دلوں کو جوڑنے کا کام پہلے میری مرحومہ بہن انجام دیتی تھیں اور اب آفتاب اقبال صاحب کی وفات

کے بعد اس کام سے میں خود منسلک ہوں اور اپنی پوری کوشش کرتی ہوں کہ مناسب اور اچھے رشتے طے ہوں۔ اللہ کی دین ہے کہ ابھی تک ہمارے ادارے کے جوڑے مثالی رہے ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا۔ اس کی بنیادی وجہ ہمارا اس کام کو انجام دینا ذاتی غرض و غایت سے ماورا ہے اور یوں ہمارے ادارے کا اپنا مقام ہے۔

اور ادارے اس بہانے لاکھوں روپے بٹور رہے ہیں اور عیش کر رہے ہیں۔ لیکن میرا ادارہ اس لعنت سے بچا ہوا ہے اور فی سبیل اللہ خدمت سے مجھے ذہنی سکون کے ساتھ ساتھ روحانی حظ بھی محسوس ہوتا ہے۔ جسے الفاظ میں بیان کرنے سے عاجز ہوں۔

صفی اللہ سے ملاقات: علامہ اقبال کے تقریباً" قابل ذکر بھانجوں اور بھتیجوں سے ملاقات ہوئی لیکن علامہ کی بہن طالع بی بی کے بیٹوں سے ملاقات نہ ہوئی کیونکہ ان سے ملنے کا کوئی موقع نصیب نہ ہوا۔ میں اپنی سیلانی زندگی کے ہاتھوں مجبور سیالکوٹ کا سفر اختیار نہ کر سکی اور جب پچھلے سال سیالکوٹ جانے کا اتفاق ہوا تو میرے پاس اتنا کم وقت تھا کہ کسی عزیز سے ملاقات ناممکن تھی۔ میرے بیٹے نوید اقبال کی طبیعت بھی ناساز تھی اور چودھری سعید کی گاڑی سے سیالکوٹ آئے اور سیالکوٹ میں رہائش کا انتظام بھی خواجہ فیملی کی وجہ سے معقول تھا۔

جب پلٹ کر کراچی آنا پڑا تو میرے علم میں یہ بات آئی کہ علامہ کی بہن طالع بی بی کے تقریباً" چاروں بیٹے نور احمد ، خورشید احمد ، ظہور احمد اور پروفیسر منظور احمد سیالکوٹ ہی رہے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

ظہور احمد صاحب کے تین صاحبزادے لاہور مقیم ہیں اور ایک صاحبزادے سیالکوٹ میں مشہور ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں۔ لاہور میں مقیم شیخ ظہور احمد کے صاحبزادے صفی اللہ سے میری بات چیت ہوئی۔ ایک آدھ ماہ پہلے صفی اللہ کی بہن مسرت کا انتقال ہوا ہے اور ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اپنے تعزیتی خط میں اپنی عزیزہ مسرت کا ذکر کیا ہے وہ یہی مسرت

تھیں۔ علامہ کے مرحوم بھانجے ظہور احمد کی بڑی صاحبزادی تھیں اور لاہور میں 'منیرہ باجی' کے ہاں رہ رہی تھیں۔

صفی اللہ صاحب نے بتایا کہ میرے چچا پروفیسر منظور احمد بڑے قابل تھے اور ان کا ذاتی کتب خانہ بڑا شاندار تھا جس میں بہترین کتب موجود تھیں۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ جوانی میں مرے کالج سیالکوٹ میں پروفیسر رہے اور پھر ملازمت چھوڑ دی تھی۔ سیالکوٹ میں "اقبال منزل" سے تھوڑے فاصلے پر ایک گھر میں ان کا کتب خانہ موجود ہے۔ لیکن مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے کتابیں کرم خوردہ ہیں۔ ان کے بھتیجے تلاش معاش میں سیالکوٹ سے باہر نکل گئے اور ان کی وفات کے بعد مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بڑا ہی پیارا کتب خانہ تباہ ہو گیا۔

میری خواہش تھی کہ علامہ کے تقریباً" قابل ذکر بھتیجوں اور بھانجیوں سے ملاقات ہو جائے۔ علامہ کی کوئی بھانجی نہ تھی۔ صرف تین بھتیجیاں تھیں اور میں تینوں سے واقف تھی۔ ایک صرف عنایت بیگم ہی زندہ ہیں باقی دو کا انتقال ہو چکا ہے۔ صفی اللہ سے ٹیلیفونی ملاقات ایک غیبی ذریعے سے ممکن ہوئی۔ میں ہر سال لاہور آتی جاتی ہوں۔ لیکن مجھے صفی اللہ کا کوئی علم نہیں تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ صفی اللہ کو کیا ملی ان کے والد محترم اور تینوں چچاؤں سے ملاقات ہو گئی۔

ان کے چچا منظور احمد نامور تھے اور مختلف روایات جمع کرنے والے ادیبوں نے صرف پروفیسر منظور احمد کے حوالے سے کچھ باتیں لکھی ہیں۔ اور ان کا ذکر نہیں ملتا۔ سوائے نور احمد صاحب کے۔

میں نے علامہ کے سلسلے میں نور احمد کا ذکر بھی کیا ہے۔ بہر کیف شیخ ظہور احمد مکانوں کی خرید و فروخت سے اپنی روزی کماتے تھے اور سیالکوٹ میں ایک اچھی دوکان ان کی ملکیت تھی جو بعد میں کسی کے چکر کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

خورشید احمد کا ذکر تقریباً" بالکل نہیں ملتا۔ یہ بھی شیخ ظہور احمد کے بھائی تھے اور

اسپورٹس کے کاروبار سے وابستہ تھے اور ان کا انتقال بھی سیالکوٹ میں ہوا۔ خالد نظیر صوفی کے دادا تھے۔

صفی اللہ سے کراچی میں ملاقات ہو گی تو پھر خاندانی امور کے بارے میں قیمتی معلومات کا علم ہو گا۔

اس سے پہلے شیخ فضل الٰہی اور ان کی اہلیہ اکبری بیگم کے بارے میں کچھ اتہ پتہ نہ تھا کہ ان کے نواسے سروش عرفانی سے خط و کتابت سے پتہ چلا کہ اکبری بیگم ۴۸ میں کوئٹہ میں انتقال فرما گئیں اور شیخ فضل الٰہی پشاور میں ۱۹۵۶ء میں انتقال کر گئے۔ سروش صاحب نے خواجہ فاروق کا پتہ دیا تھا کہ وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہمارا خط کافی دنوں بعد خواجہ فاروق صاحب کو موصول ہوا ، وہ ضروری کام سے بیرون ملک گئے ہوئے تھے اور واپسی پر ڈاک میں انہیں ہمارا خط ملا۔ بہر کیف انہوں نے بھی مزید قیمتی معلومات فراہم کرنے کا وعدہ کیا لیکن چونکہ کافی دنوں تک ہم قاصر رہے لہذا اب نجانے ان کی معلومات کب ملتی ہیں۔ ان سے خاص بات یہی دریافت کرنا تھی کہ شیخ فضل الٰہی مرحوم کے بھائی فضل حق کب فوت ہوئے اور کہاں دفن ہیں۔ خواجہ فاروق بھی اکبری بیگم کے نواسے ہیں اور مولوی الف دین نفیس کے پوتے ہیں۔ انہوں نے کلام نفیس اور اقبال عرفانی کتابیں دے کر ہماری بہت مدد کی اور آج کل لاہور میں ہی مقیم ہیں اور اپنا ذاتی کاروبار سنبھالے ہیں۔ انہوں نے علامہ کے بھانجے فضل حق کے بارے میں قیمتی معلومات سے نوازا اور ان کے عالمی شہرت یافتہ بیٹے جالی کا پتہ بھی دیا۔ لیکن خط و کتابت سے جالی کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنی والدہ کی خالہ عنایت بیگم (علامہ اقبال کی بقید حیات واحد بھتیجی) کے انٹرویو کا بھی عندیہ دیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اب کتاب پریس میں جا رہی ہے اور ہمیں عنایت بیگم کا انٹرویو موصول نہیں ہوا ہے۔

گیتی شیخ سے اس کے دو چچاؤں کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک چچا تو بچپن میں انتقال فرما گئے اور دوسرے چچا لاہور میں رہائش پذیر ہیں لیکن انہیں ان کا صحیح پتہ معلوم نہیں ہے۔ میں اب اتنی معلومات پر اکتفا کرتی ہوں اور آپ سے رخصت چاہتی ہوں۔

علامہ اقبال کی شادیاں

رشیدہ بیگم

علامہ اقبال کی شادیوں کے سلسلے میں بعض لوگ بڑی عجیب عجیب داستانیں بیان فرماتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے جب دوسری شادی کا ارادہ فرمایا تھا تو وہ دراصل بیوی بچوں کے سیالکوٹ رہنے اور خود لاہور ہی رہنے کی وجہ سے تھا۔ علامہ اقبال نے کھلے لفظوں میں اپنی پہلی بیوی سے کہہ دیا تھا کہ گھر میں تمہارا ہی حکم چلے گا اور گھر کی تم ہی مالک ہو گی کیونکہ تم معراج اور آفتاب کی والدہ ہو۔

میری تحویل میں اپنی خوشدامن صاحبہ (کریم بی بی صاحبہ زوجہ اولی علامہ اقبال) کے نام علامہ اقبال کے خطوط تھے اور ان خطوط میں معراج بیگم کے نام اپنے ابو کے خط بھی شامل تھے۔ ۱۹۴۳ء میں شادی کے بعد جناب آفتاب اقبال صاحب مجھے خالہ حمیدہ مرحومہ کی کوٹھی میں لائے اور وہیں صندوق جس میں پرانے خطوط اور دستاویزات تھیں، ہم خالہ حمیدہ کے ہاں چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے اور تقریباً" دو سال بعد ہماری واپسی ہوئی تو وہ صندوق نہ مل سکا میں کم عمری کی وجہ سے اس صندوق میں پڑے خطوط اور دستاویزات کی اہمیت سے بے خبر تھی اور اب بعض نابکار غلط باتیں لکھتے اور کہتے ہیں تو ان کی گوشمالی کے لئے اصل خطوط کی شہادت پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

آمدم بر سر مطلب، مختار بیگم صاحبہ سے شادی کے بعد علامہ اقبال نے پھر سردار بیگم صاحبہ سے بھی شادی کا ارادہ کیا۔ دوبارہ نکاح کے سلسلے میں فتوی طلب کیا تو اس سے یہ بات کھلی کہ چونکہ رخصتی سے پہلے طلاق ہوئی ہے لہذا بغیر حلالے کے نکاح ہو سکتا ہے۔ یوں علامہ اقبال کا تیسری بیوی سے چوتھا نکاح ہوا۔ دونوں بیویاں لاہور ایک ساتھ رہنے لگیں۔ ادھر علامہ کے والدین کو بھی پتہ چلا کہ اب علامہ اقبال نے اپنا گھر آباد کر لیا ہے اور دو بیویاں ان کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ایک پہلی بیوی کو سیالکوٹ میں رکھنے کا جواز نہیں اور پہلی
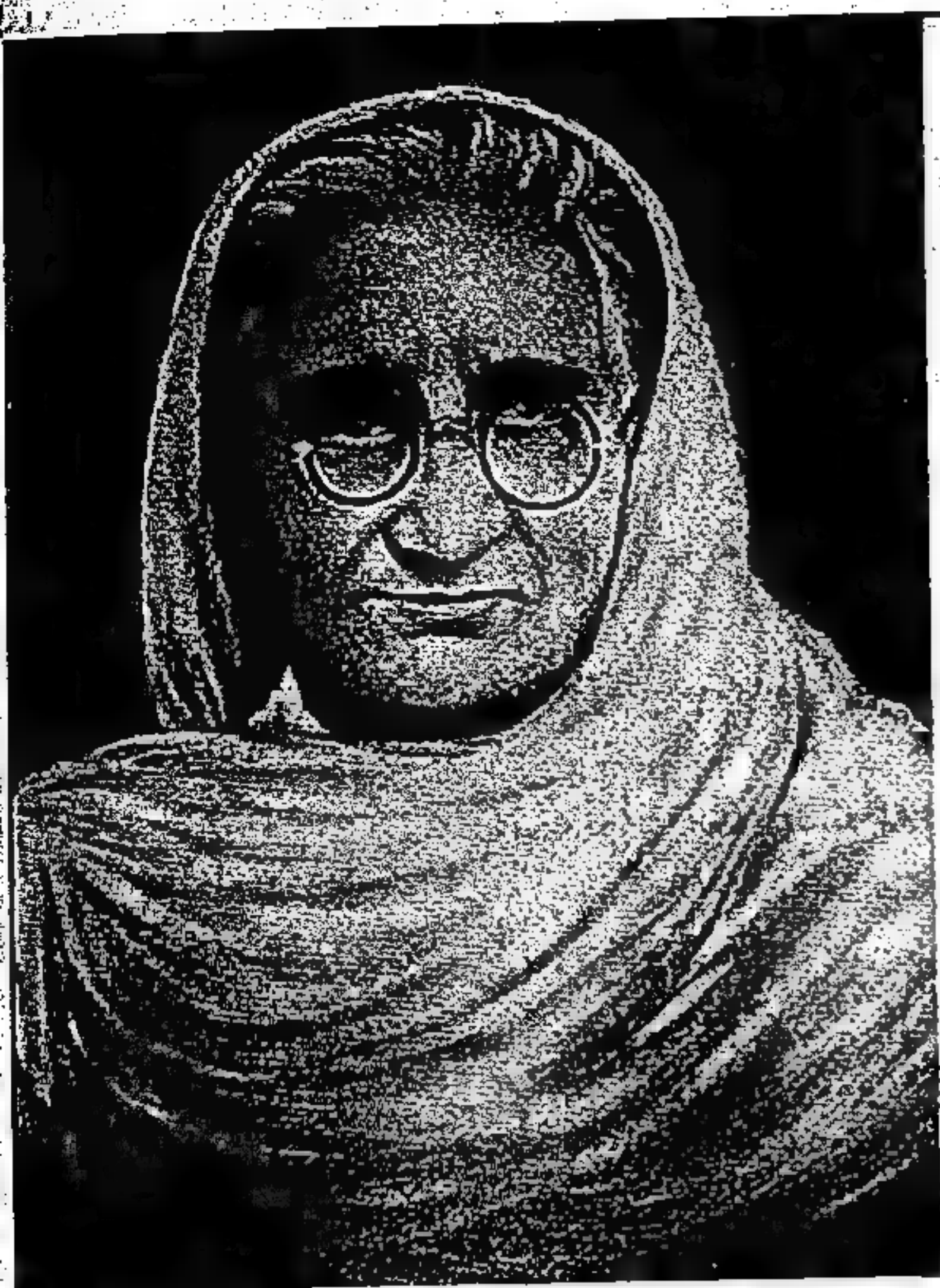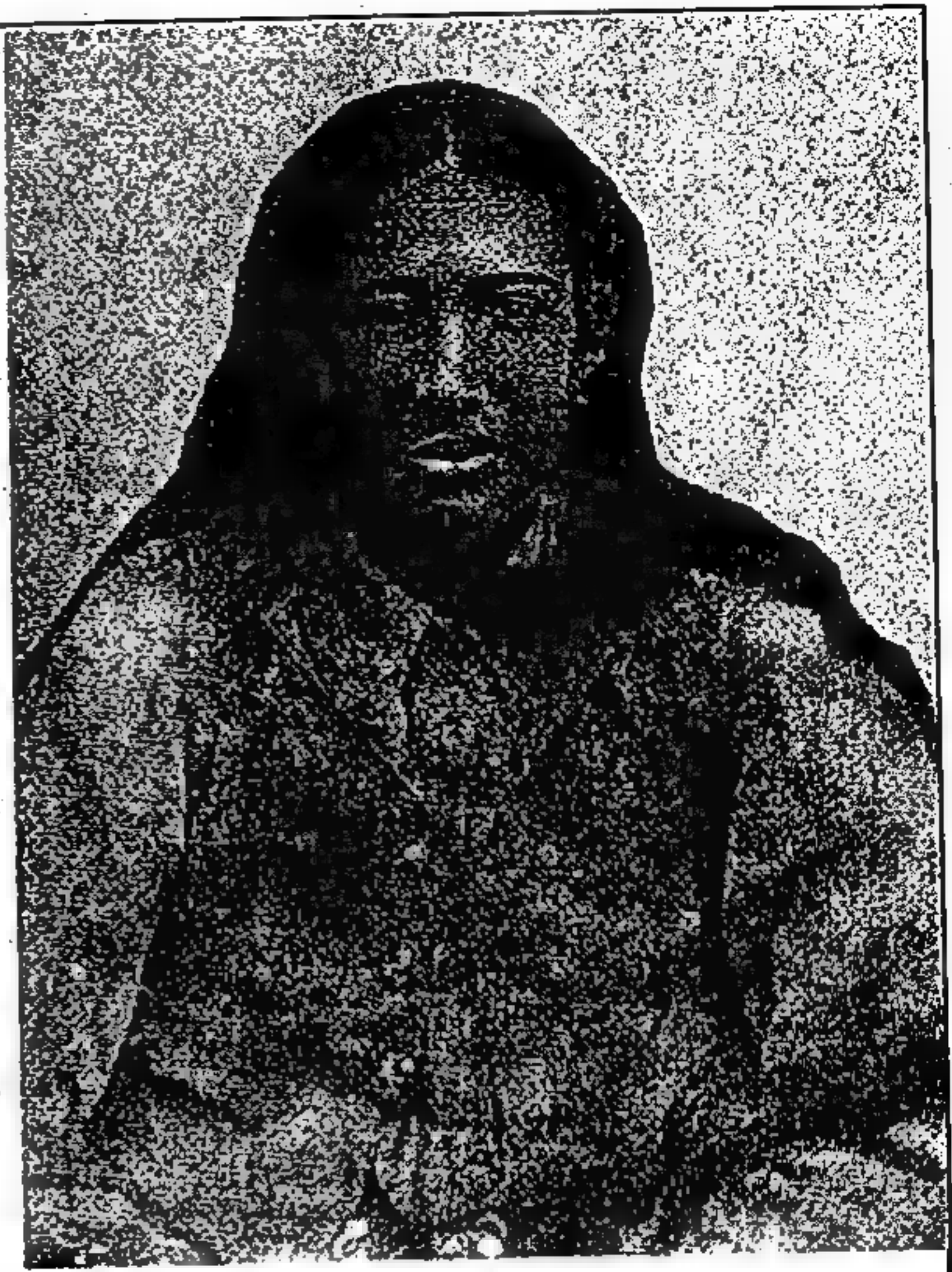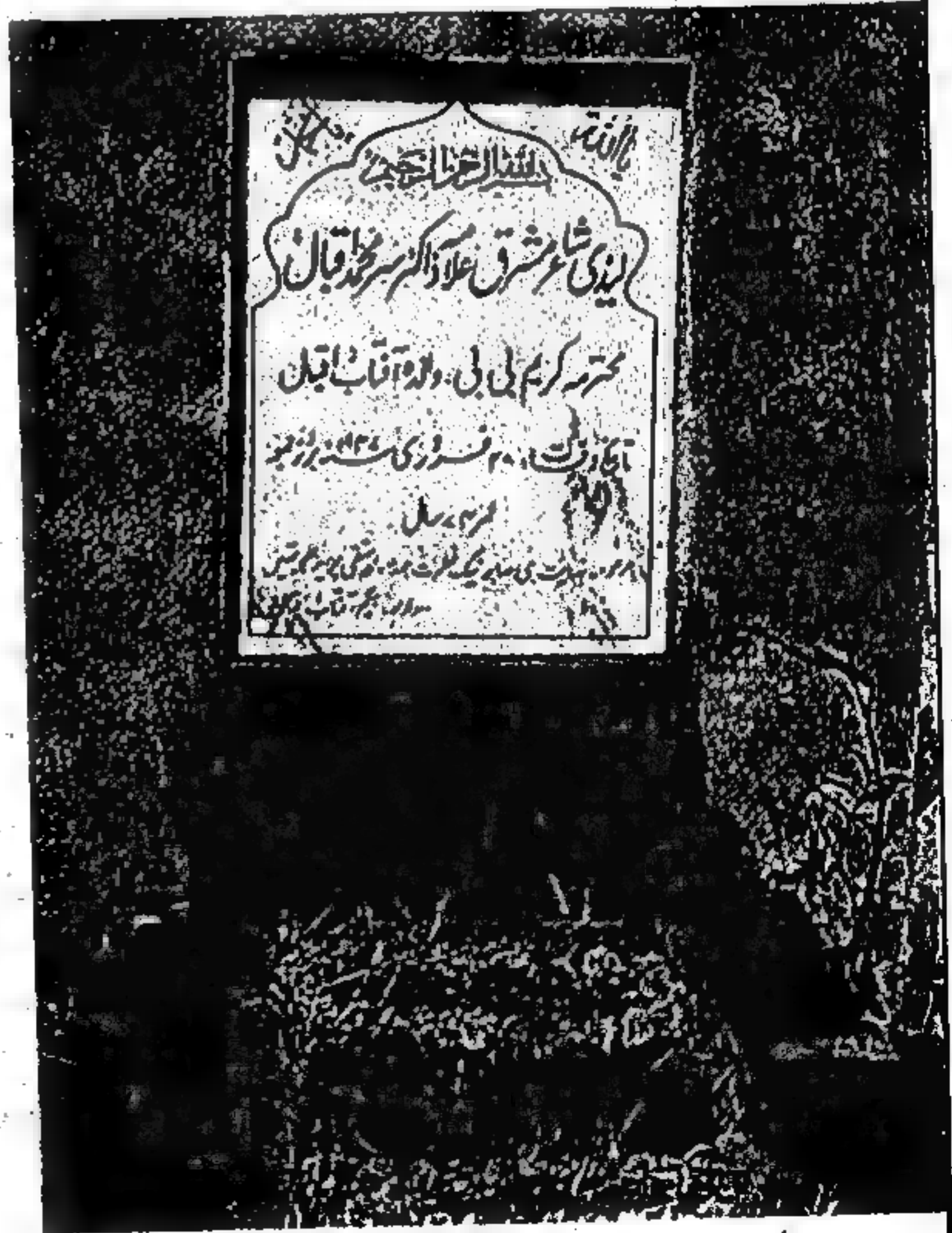
بیوی کو لاہور جانے میں رکاوٹ نہ ڈالی۔ اس طرح انار کلی والے مکان میں تینوں بیویاں ایک ساتھ اکٹھا رہنے لگیں اور بعدہ ، علامہ اقبال کی خوش دامن صاحبہ (لیڈی حافظ شیخ عطا محمد) لاہور گئیں اور تینوں بیویوں کو ایک کرائے کے گھر میں رہتے دیکھا تو نجانے انہیں کیا سوجھی کہ وہ اپنی بیٹی (کریم بی بی صاحبہ) کو اپنے ہمراہ گجرات لے آئیں۔ علامہ اقبال اپنی بیوی کو لینے گجرات گئے اور نہ بیوی از خود آئیں۔

اس کتاب میں دیئے گئے ایک مضمون 'لیڈی اقبال' میں صاحبہ مضمون نے جو علامہ اقبال کی زوجہ اولیٰ کی بہت ہی قریبی عزیزہ ہیں ،انہوں نے فرمایا ہے۔ 'جب معراج بیگم کا سیالکوٹ میں انتقال ہو گیا تو وہ اپنے بیٹے آفتاب کو لے کر گجرات چلی گئیں اور واپس اپنے سسرال نہ آئیں۔

بہر کیف اصل واقعات یوں ہیں اور ان کو توڑ مروڑ کر اور مختلف رنگ روپ دے کر بعض اہل قلم طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور بھارت کے اکبر علی خان عرشی زادہ صاحب باقاعدہ علامہ اقبال کی جنسی نا آسودگیوں پر کتاب لکھنے کے لئے پر تول رہے ہیں اور میں نے انہیں لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے قلم کی جولانیاں کسی اور میدان میں دکھائیں تو بہتر ہو گا۔

میں دراصل علامہ اقبال کی شادیوں کے بارے میں اظہار خیال سے گریز کر رہی تھی لیکن چونکہ ۱۹۸۵ء میں شیخ اعجاز احمد اپنی کتاب 'مظلوم اقبال ، میں بھی اس مضمون پر طبع آزمائی کر چکے ہیں اور میں نے حقائق کو سامنے رکھ کر اصل حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ میں اپنے تئیں محقق اور علامہ نہیں گردانتی لہذا سیدھے سادھے انداز میں اس بارے میں چند معلوم باتوں پر کچھ لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی زوجہ اولیٰ کے بارے میں ایک بار فرمایا تھا یہ امر ربی ہے۔

لہذا میں 'علامہ اقبال کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اسے امر ربی ہی سمجھتی ہوں۔ چونکہ ۱۹۹۷ء کے دورہ سیالکوٹ کے موقع پر Dawn 'اخبار کے ۷ دسمبر کے شمارے میں ایک خبر کی سرخی یوں چھپی تھی۔

New book may reveal hidden aspects of iqbal's life

میرے پاس ایک راز تھا ، جس سے پردہ اٹھادیا۔ مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب میں بھی گمنام خطوط کے پیچھے ایک وکیل کا ہاتھ کار فرماد کھایا گیا ہے اور علامہ اقبال کی بیوی سردار بیگم صاحبہ کو دسویں جماعت کی طالبہ بتایا گیا ہے اور پھر سردار بیگم صاحبہ کے کردار کے بارے میں انگریز پرنسپل سے رابطہ کیا گیا۔ مجھے حیرت ہے کہ اقبال کے ساتھیوں کو بھی حقائق کا اتنا علم نہ تھا۔ اگر علم ہوتا تو اس قسم کی من گھڑت باتیں کیوں حیات اقبال میں راہ پاتیں۔

چند ایک معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر ،ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی کتاب "زندہ رود" ایک مفصل اور مستند کتاب ہے۔ اب چند ایک باتوں کے انکشافات کے بعد یہ معمولی سی کتاب تاریخ میں یادگار رہے گی کیونکہ اس میں بیان کردہ حقائق کا انکشاف آفتاب صاحب نے کیا تھا جو علامہ اقبال کی وفات کے موقعہ پر ایک بالغ اور ذی ہوش عاقل مرد تھے اور علامہ اقبال کی تقریبا" چالیس سالہ زندگی کے اکثر و بیشتر واقعات کے عینی شاہد تھے۔

علامہ اقبال نے دوسری بیوی (سردار بیگم) کو طلاق کیوں دی؟

رشیدہ بیگم

آج میں علامہ اقبال کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کا انکشاف کرنے لگی ہوں اور یہ واقعہ ڈاکٹر جاوید اقبال اور منیرہ بانو کے لئے بہت اہم ہے کیونکہ ان کی والدہ ماجدہ کی پاک دامنی اور عفت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس راز کے امین ایک ایک کر کے اس دار فانی سے کوچ کر چکے اور ہم بھی تیار بیٹھے ہیں۔ اس واقعہ کے کردار علامہ اقبال کی چھوٹی بہن کریم بی بی صاحبہ ،بیٹی معراج بیگم ،بھانجے ،نور احمد ،علامہ اقبال اور آفتاب اقبال ہیں۔

لوگوں کو اتنا معلوم ہے کہ جب علامہ اقبال نے سردار بیگم صاحبہ سے نکاح کیا تو علامہ اقبال کو کچھ گمنام خطوط موصول ہوئے۔ ان خطوط میں سردار بیگم کے چال چلن پر اتنے گھناؤنے الزامات عائد کئے گئے تھے کہ علامہ اقبال نے کبیدہ خاطر ہو کر سردار بیگم کو طلاق دے دی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ خطوط کسی وکیل کی طرف سے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ایک منظم اسکیم کے تحت علامہ اقبال کی چھوٹی بہن کریم بی بی صاحبہ کی کارستانی تھی۔

اس دور میں علامہ اقبال کے بچے معراج بیگم اور آفتاب اقبال "اقبال منزل "سیالکوٹ میں مقیم تھے اور وہیں علامہ کی چھوٹی بہن کریم بی بی صاحبہ اپنے بچوں کے ہمراہ قیام پذیر تھیں۔ کسی ذریعے سے خاندان کے لوگوں کے کان میں بھنک پڑی کہ علامہ اقبال خفیہ طور پر لاہور میں دوسری شادی رچا رہے ہیں۔ علامہ کو دوسری شادی سے روکنے کے لئے اور اپنی بھاوجہ اور بچوں سے ہمدردی کے جذبے کے تحت کریم بی بی صاحبہ نے یہ منصوبہ بنایا کہ کسی طریقے سے علامہ کا دل نئی بیوی سے میلا کر دیا جائے تاکہ بھاوج پر سوت نہ آسکے اور بچے باپ کی محبت سے محروم نہ ہو جائیں۔ بہن کو اپنے بڑے بھائی کے رویے پر افسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے بچوں کو لاہور نہیں جانے دیتا تھا اور اپنے بھائی کی کم آمدنی کا رونا

روتا تھا۔ آفتاب اقبال کی پیدائش کے ایک سال بعد تو علامہ باقاعدہ کمانے لگے تھے اور اس سے پہلے بچوں کا خرچہ ننھیال اور ددھیال برداشت کرتے تھے اور اب تو بچوں کو باپ کے پاس جانے سے روکنا صریح ظلم اور زیادتی تھی۔

آخر بڑے بھائی کے اس رویہ سے تنگ آکر علامہ نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا اور شادی بھی لاہور کے ایک غریب گھرانے کی ایک لڑکی سے کی۔

کریم بی بی صاحبہ نے علامہ کو دوسری شادی سے روکنے کا بہترین منصوبہ تیار کیا اقبال منزل سیالکوٹ میں صرف دو ہی نوشت و خواند سے واقف عورتیں تھیں۔ ایک کریم بی بی صاحبہ (پانچویں جماعت تک پڑھی ہوئی تھی) اور دوسری معراج بیگم (گھر پر ہی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا) کریم بی بی صاحبہ نے بڑے رازدارانہ طریقے سے خط معراج بیگم سے لکھوائے اور شیخ نور احمد کی وساطت سے گوجرانوالہ اور گجرات کے شہروں سے سپرد ڈاک کیے جاتے تھے اور نور احمد صاحب کو تھوڑا بہت معاوضہ دے دیا جاتا تھا۔ نور احمد صاحب کے علم میں نہ تھا کہ یہ خطوط کس قسم کے ہیں حالانکہ نور احمد صاحب نوشت و خواند سے واقف تھے اور ایک مستند حکیم تھے۔

ادھر لاہور میں نکاح کے بعد جب علامہ کو گمنام خطوط نئی بیوی کے بارے میں متواتر اور تسلسل کے ساتھ ملنے شروع ہوئے تو وہ بہت آزردہ ہوئے۔ علامہ میں ایک بشری کمزوری تھی کہ وہ کسی بات کو سن کر فورا" متاثر ہوتے تھے اور غلط بات کی چھان بین نہیں کرتے تھے۔ لہذا جیسے ہی ان خطوط کی بھرمار ہوئی اور نئی بیوی پر الزامات کی بوچھاڑ ہوئی انہوں نے خطوط کے مندرجات کو من و عن درست مان کر سردار بیگم کو طلاق دے دی۔

سردار بیگم صاحبہ کو بڑا صدمہ پہنچا کیونکہ علامہ نے نہ صرف اسے طلاق بھجوائی بلکہ ایک اور عورت مختار بیگم صاحبہ سے لدھیانہ میں شادی کرلی۔ سردار بیگم صاحبہ نے علامہ اقبال کو خط لکھا کہ میں بے گناہ ہوں۔ میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے۔ لہذا اب میں کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کروں گی۔

خیر یوں ہی وقت گزرتا گیا کہ ایک روز معراج بیگم کا خط اپنے ابا کے نام آیا۔ علامہ نے خط پڑھا تو انہیں اچانک حیرت ہوئی کہ اس خط کی لکھائی گمنام خطوط کی لکھائی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ لہذا علامہ نے معراج بیگم کے خط کی لکھائی کا گمنام خطوط کی لکھائی سے موازنہ کیا تو ان کا اندازہ درست ثابت ہوا۔

اس کے بعد علامہ گمنام خطوط لے کر سیالکوٹ جا پہنچے۔ کمرے میں اپنی بیٹی معراج بیگم کو بلولیا۔ گمنام خطوط معراج بیگم کو دکھائے اور پوچھا کہ ان خطوط کی لکھائی آپ کی پاکیزہ اور صاف لکھائی کی چغلی کھا رہی ہے۔ سچ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔ معراج بیگم ڈر گئی اور اس پر خوف طاری ہو گیا۔ اس نے سچ بات بتانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ یوں علامہ کی بہن کریم بی بی صاحبہ کا منصوبہ ایک ٹیکنیکل خامی کی وجہ سے سربستہ نہ رہا بلکہ علامہ کو بھی اپنی جلد بازی کا احساس ہو گیا۔

کریم بی بی صاحبہ کے اس منصوبے کا گھر کے کسی فرد کو علم نہ تھا۔ حتیٰ کہ علامہ کی زوجہ اولیٰ کریم بی بی صاحبہ بھی بے خبر تھیں۔ علامہ اپنی بہن کریم بی بی پر بہت بگڑے بیٹی اور بہن نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور علامہ سے معافی کی خواستگار ہوئیں۔ علامہ نے معاف کر دیا اور فرمایا: اب یہ راز صیغہ راز ہی میں رہے اور کسی کو اس کی بھنک نہ پڑے۔

یہ پوری روئیداد جب معراج بیگم نے اپنے چھوٹے بھائی آفتاب اقبال کو سنائی اور وعدہ کیا کہ وہ اس کو سربستہ راز رہنے دیں گے۔

اب اس راز کے سبھی کردار ایک ایک کر کے اپنے اللہ کے حضور پہنچ چکے ہیں اور میں اس کو پچپن سال تک اپنے سینے میں دبائے رہی لیکن اب بڑھاپے کی اس منزل پر اس راز کو فاش کر رہی ہوں تاکہ قارئین بغیر کسی اشارے کنائیے کے خود فیصلہ کر سکیں کہ بعض واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا جواز کیا ہوتا ہے اور صداقت ہمیشہ اکثریت کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے اور دستور دنیا بھی ہے کہ کسی راز کو تقریباً" پچاس سال تک فاش کرنے کی ممانعت ہوتی ہے اور طویل عرصے کے بعد فاش ہونے سے اس کی شدت میں ناقابل بیان

حد تک کمی واقع ہو چکی ہوتی ہے۔

اس سے پہلے جنگ اخبار کے صفحات پر حکیم اجمل خان کی المناک موت کا واقعہ پیش کیا جا چکا ہے کہ نواب رام پور نے حکیم اجمل خان کو خود مروایا تھا اور اس وقت ان کی عارضہ قلب کے سبب موت کا اعلان فرمایا۔ عینی شاہد نے برسوں بعد واقعہ سے پردہ اٹھایا۔ علامہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر اس سے بمشکل راضی ہوتے تھے۔ لیکن یہاں سگی بہن اور سگی بیٹی کا رشتہ آڑے آیا اور راضی ہو گئے دونوں کو معاف کر دیا۔ دوسری طرف سردار بیگم کا دل پسیجنے میں کریم بی بی صاحبہ کامیاب ہو گئیں۔ آخر علامہ چوتھا نکاح کر کے سردار بیگم صاحبہ کو گھر لائے۔ چوتھا نکاح یوں کہ ۴ مئی ۱۸۹۳ء کو پہلا نکاح کریم بی بی صاحبہ سے ہوا، دوسرا نکاح سردار بیگم صاحبہ سے، تیسرا نکاح مختار بیگم سے اور چوتھا نکاح ۱۹۱۳ء میں سردار بیگم سے ہوا کیونکہ پہلے سردار بیگم صاحبہ کو علامہ بغیر رخصتی کے طلاق دے چکے تھے۔

علامہ کے سلسلے میں یہ عجیب معاملہ ہوا کہ انہوں نے چار نکاح کئے لیکن بیویاں تین رہیں۔

پھوپھی کریم بی بی صاحبہ علامہ اقبال کی چھوٹی بہن

مختار بیگم سے شادی کا واقعہ اور کریم بی بی کا کردار

رشیدہ بیگم

جب علامہ اقبال سے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سردار بیگم صاحبہ کو طلاق دلوا دی تو علامہ اقبال کی بہن کریم بی بی فوراً" ایک رشتے کے لئے علامہ اقبال کے لئے کوشش میں لگ گئیں۔ اس رشتہ کا پیغام بھی علامہ کو اپنے ایک دوست کی وساطت سے ملا تھا اور علامہ نے اپنی بہن کریم بی بی صاحبہ کو لدھیانہ بھجوایا تاکہ وہ لڑکی کو اچھی طرح سے دیکھ بھال لیں۔ علامہ دراصل لدھیانہ کے ڈاکٹر سبحان علی کی لڑکی کے رشتہ کے خواہش مند تھے اور ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ان کی مرحومہ سالی کے دو بچے بھی مقیم تھے۔ بچی کا نام مختار بیگم تھا۔ مختار بیگم کا بھائی بھی ڈاکٹر تھا۔ یہ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے اور نولکھا کہلاتے تھے۔ لاہور میں نولکھا بازار اس خاندان سے منسوب ہے۔ کریم بی بی صاحبہ نے ڈاکٹر سبحان علی صاحب کی لڑکی دیکھی تو لڑکی خوبصورت ،اسمارٹ اور سلیقہ شعار پائی۔ واپسی پر کریم بی بی صاحبہ نے علامہ سے لڑکی کی خوبصورت اور سلیقہ شعاری کا ذکر کیا۔ لیکن شادی کے بعد انہوں نے لڑکی کو ان خوبیاں سے مبرا پایا تو بڑے رنجیدہ ہوئے کہ اب بھی بہن جھانسہ دینے سے باز نہیں آئی۔

دراصل ڈاکٹر سبحان علی کے گھر میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب کی لڑکی سے ہی کریم بی بی صاحبہ کا سامنا ہوتا رہا اور لڑکی کی خوبصورتی ، مستعدی اور تندرستی کی باتیں بتاتی رہیں لیکن شادی والی لڑکی میں خصوصیات نام کو نہ تھیں۔ کیونکہ ڈاکٹر سبحان علی صاحب اپنی سالی کی لڑکی مختار بیگم کے لئے رشتہ کی تلاش میں تھے اور اس طرح وہ ایک ذمہ داری سے سرخرو ہونا چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنی سالی کی بیٹی۔ مختار بیگم کا رشتہ طے کیا، نہ کہ اپنی لڑکی کا حالانکہ علامہ کی بہن کریم بی بی صاحبہ کو کھل کر بات کرنی چاہئے تھی کہ آپ اس لڑکی کا رشتہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ کریم بی بی صاحبہ پانچویں درجے تک پڑھی تھیں ،سوجھ

بوجھ کی مالک تھیں لیکن نجانے رشتہ کے سلسلے میں کیوں بھول گئیں۔

بہر کیف علامہ کی دوسری شادی سے دس سال تک اولاد نہ ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں اولاد کی آس لگی تو مختار بیگم صاحبہ زچگی کی حالت میں لدھیانہ میں چل بسیں اور شہر لدھیانہ کے مرکزی قبرستان میں دفن ہیں اور مختار بیگم صاحبہ نے علامہ کی آنکھوں کے سامنے سفر آخرت اختیار کیا اور اپنے وارثوں کو وصیت کر گئیں کہ جہیز کا سامان واپس نہ لیا جائے۔ علامہ نے مرحومہ کے لئے قطعہ تاریخ وفات کہا اور ان کی قبر پر کتبہ موجود تھا۔

کریم بی بی صاحبہ کے بارے میں میں اپنی زبان کیا کھولوں۔ ان کے بھائی اور بیٹے ظفر الحق بھی ان سے خفا تھے۔

علامہ اقبال

سردار بیگم سے دوسری شادی کیوں اور کیسے

رشیدہ بیگم

بہت سی باتیں یعنی پہلی شادی کریم بی بی کی جو ہوئی تھی' علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی سے معلوم ہوگئیں ہیں۔ علامہ کی شادی ۴ مئی ۱۸۹۳ء میں ہوئی تھی۔ جب علامہ نے میٹرک پاس کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال تھی اور کریم بی بی کی ۱۸ سال تھی۔

شادی سے لے کر ان کے لندن جانے تک یعنی ۱۹۰۵ء تک حالات بالکل معمول کے مطابق تھے۔ شادی کے بعد لاہور تعلیم کے لئے گئے۔ اور انکے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ بڑا بھائی خرچہ برداشت کرتا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ بیوی بچوں کا خرچہ کہاں سے پورا ہوتا۔ اس لئے آفتاب صاحب کی والدہ کبھی سیالکوٹ کبھی اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں۔ علامہ اکثر سیالکوٹ آتے اور بچوں کے ساتھ کچھ دن گزارتے ۱۹۱۴ء تک یہ آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ جب ان کی یکے بعد دیگرے ۳ شادیاں ہوئیں۔ اس کی وجہ سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ اور گھر میں ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں۔ آفتاب اقبال نے اپنی والدہ کا ساتھ دیا۔ اس لئے ان کے والد علامہ اقبال ان (آفتاب) سے ناراض رہنے لگے۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ دوسری اور تیسری شادی کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے والدہ آفتاب سے شادی کی اجازت مانگی تھی۔ اور یہ لکھا تھا کہ ان کے حقوق کی بالکل حق تلفی نہ ہوگی کیونکہ 'تم میری پہلی اور اصلی بیاہتا بیوی ہو اور میرے والدین کی رضامندی سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ (افسوس کہ یہ خط ضائع ہوگئے) ان کی دوسری بیویاں آپ کا احترام کریں گی اور مندرجہ ذیل فقرہ اس خط میں لکھا کہ 'گھر کی مالک تم ہوگی۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ گھر کی اصل مالک تم ہوگی۔ سب سے بڑھ کر تم میرے بچوں آفتاب اور معراج کی والدہ ہو۔ تیسری شادی کے بعد تینوں بیویاں انار کلی والے گھر میں کچھ عرصہ اکٹھی رہیں۔ ظاہر ہے کریم بی بی وہاں خوش نہیں تھیں۔ وہ بہت خوددار تھیں۔ دوسری

بیویاں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس لئے انہیں ان کی والدہ (خان بہادر حاجی ڈاکٹر عطا محمد کی بیوی) غالباً" ۱۹۱۷ء میں آخری دفعہ ریاست مالیر کوٹلہ لے گئیں۔ جہاں خان بہادر گورنمنٹ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد چیف میڈیکل افسر تھے۔ مولانا جلالی کی کتاب سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ گورنمنٹ کی ملازمت میں میانوالی سول سرجن تھے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد مالیر کوٹلہ میں گئے تھے۔

اقبال کی پہلی شادی کا افسوس ناک انجام

چند وجوہات:-

نفسیاتی ڈاکٹر منیر احمد سلیچ نے اپنی کتاب "اقبال اور گجرات" میں سائنٹیفک طریقہ سے انصاف اور صاف گوئی سے اور دیانتداری سے کام لیا ہے اور چند وجوہات بیان کی ہیں۔

مالی حیثیتوں کا تفارق:-

شیخ نور محمد اور شیخ عطا محمد دونوں کشمیری شیخ تھے، شرافت اور دینداری میں سربلند تھے، خدا ترس تھے، دونوں صوفیانہ طرز فکر کے پیرو تھے مگر دونوں کی مالی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

ایک طرف خان بہادر حاجی حافظ ڈاکٹر شیخ عطا محمد تھے جو نسل در نسل معزز سماجی اور مستحکم مالی حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے دادا اجناس کشمیر کے تاجر، والد داروغہ جیل اور وہ خود سول سرجن، وائسرائے ہند کے اعزازی سرجن، "خان بہادر" خطاب یافتہ، وائس کونسل آف برٹش انڈیا تھے اور "رئیس گجرات" کہلاتے تھے۔ گویا سماجی اور مالی ہر دو اعتبار سے نہایت معتبر مقام کے مالک تھے۔

دوسری طرف شیخ نور محمد تھے جو ٹوپیاں سی کر اپنے خاندان کا پیٹ پالتے تھے اور اقبال اس وقت صرف جماعت نہم کے ایک ہونہار طالب علم تھے اور بس! ان کے بڑے بھائی بھی کسی بڑے عہدے پر فائز نہ تھے۔ جب شیخ نور محمد نے بیٹے کا رشتہ بھیجا تو

ڈاکٹر عطا محمد نے سنت نبوی ﷺ کے پیش نظر مالی حیثیت کی کمزوری کو نظر انداز کرتے ہوئے خاندان کی دینداری اور شرافت کو ترجیح دی۔

لیکن شاہانہ ماحول میں پلی بڑھی کریم بی بی کے لئے ایسے ماحول میں گزارہ اتنا آسان نہ تھا۔ اقبال خود طالب علم تھے اور شادی کے ۶ سال بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شیخ نور محمد کی اپنی آمدنی قلیل تھی۔ شیخ عطا محمد ملٹری انجینئرنگ سروس میں اوورسیئر تھے اور خود بال بچے دار تھے۔ ایسے حالات میں وہ سہولتیں کیسے میسر آسکتی تھیں جو کریم بی بی کو اپنے میکے میں دستیاب تھیں۔ میکے میں دولت کی فراوانی تھی، نوکر، چاکر، گاڑی، محل نما حویلی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ والد بہت مشفق اور نرم مزاج تھے۔ سسرال میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں کریم بی بی کو بلاشبہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔

۱۸۹۹ء میں اگرچہ اقبال کمانے لگ گئے تھے لیکن ابھی اس قابل نہیں تھے کہ بیوی بچوں کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ طالب علمی میں ہی دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ ملازمت کے دوران گھر بھیجنے کے لئے شاید ان کے پاس کچھ نہ بچتا ہو۔ بیرون ملک جانے کا خواب بھی سامنے تھا۔ اس کے لئے بھی کچھ جمع کرنا تھا۔ ایسے میں ان کے بیوی بچے شیخ عطا محمد (برادر بزرگ) کے دست نگر ہونے پر مجبور تھے جن کی اپنی آمدنی محدود تھی۔ عورت اگر دوسروں کے رحم و کرم پر ہو اور اپنے خاوند سے دور بھی ہو تو اس کے احساسات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

شیخ عطا محمد کی سخت طبیعت:-

اقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مزاجاً بہت سخت اور غصیلے آدمی تھے۔ بقول اعجاز احمد وہ "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" قسم کے آدمی تھے اور

اولاد کی تربیت میں جسمانی سزا کے قائل تھے۔ شیخ اعجاز احمد نے "مظلوم اقبال" میں چند واقعات بیان کئے ہیں جن میں آفتاب اقبال کا شیخ عطا محمد کے ہاتھوں پیٹا جانا تفصیلا لکھا ہے۔ (۷۱)

سید حامد جلالی لکھتے ہیں۔ (۷۲)

"عطا محمد صاحب موصوف کا رویہ علامہ کے بیوی بچوں کے ساتھ ہمیشہ سے نہایت سخت اور معاندانہ تھا۔ آفتاب اقبال کو زدوکوب کرنا، سب و شتم سے پیش آنا ان کا معمول تھا۔ عطا محمد صاحب کا ظالمانہ سلوک والدہ آفتاب اور ان کی اولاد کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ شیخ نور محمد صاحب دیکھتے تھے اور دکھ پاتے تھے لیکن عطا محمد کی درشت طبیعت کے آگے مجبور تھے۔ عطا محمد اپنے گھر والوں پر بے طرح چھائے ہوئے تھے۔

مزید لکھتے ہیں۔ (۷۳)

"اب تاریخ جہاں یہ بتائے گی کہ علامہ اقبال اپنی پہلی بیوی سے بیزار تھے، وہاں بے زاری کی وجوہ میں عطا محمد صاحب کا کردار بھی لوگوں کے سامنے آئے بغیر نہ رہے گا جو اس غمناک داستان کے سبب اصلی بلکہ بانی کی حیثیت کے مالک ہیں اور علامہ اقبال سے ۱۶۔۱۷ سال بڑے ہونے کی وجہ سے علامہ اقبال کی گھریلو زندگی پر ایک دیو کی طرح مسلط تھے"۔

عورت کے لئے اقبال کو سمجھنا مشکل ہو تو کیا اچنبھا! مگر اقبال کے لئے ایک سادہ سی عورت کو سمجھنا اور اس سے نباہ کرنا، خدا جانے، کیوں اتنا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر انہیں یہ بھی علم تھا کہ کریم بی بی جس ماحول میں پلی بڑھی ہے اس کا اور ان کے ماحول کا بہت زیادہ فرق، طبیعت میں کچھ ایسی ناگوار تبدیلیوں کا باعث بن سکتا ہے جو دونوں کے درمیان ہم آہنگی کو مشکل بنا دے۔

پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ تھوڑا بہت اختلاف تو زوجین میں قدرتی طور پر ہوتا ہی ہے۔ مگر اسے حد سے زیادہ شدید بنانے میں درج بالا اور درج ذیل عوامل بھی شامل تھے۔

اقبال کی عدم دستیابی :-

۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک کے بیس سالوں میں سے صرف پہلے دو سال اقبال اپنی بیوی کے پاس رہے۔ قیام لاہور کے دوران کبھی کبھار سیالکوٹ آتے اور یورپ سے واپسی پر بھی تنہا رہے۔ اندریں حالات مسائل کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ قریب رہنے سے ایک دوسرے کو سمجھنے سے مدد ملتی ہے۔ دور رہنے سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔

اقبال کی مجبوری تھی کہ وہ لاہور میں بیوی کو ساتھ رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسری طرف کریم بی بی، دو بچوں کے ساتھ دوسروں کی محتاج تھی۔ اگر اسے تکلیف ہوتی، کوئی مسئلہ ہوتا تو کس سے کہتی؟ بہت سی باتیں صرف شریک حیات ہی سے کہی جا سکتی ہیں اور شوہر اگر مہینے میں ایک آدھ بار گھر آئے تو ایسی باتوں کے بیان سے اجتناب ہی کیا جاتا ہے کہ ایک تو مسئلے کی نوعیت ایسی کہ فوری حل ممکن نہیں، دوسرے شوہر کے اس بھائی کی سخت رویئے کی شکایت کیسے ہو جو دونوں کا کفیل ہو۔

ایک معالج ہونے اور نفسیاتی امراض و مسائل میں کچھ سوجھ بوجھ رکھنے کی بناء پر راقم کے ذاتی مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ جن خواتین کے شوہر ان سے دور مثلاً بیرون ملک رہ رہے ہوں ان میں نفسیاتی مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ نفسیاتی مسائل جسمانی

مسائل کا باعث بنتے ہیں جو مالی اور دیگر پریشانیوں کی وجہ سے مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔
اپنی بیویوں سے دور رہنے والے مردوں کے اپنے رویوں میں مختلف درجات کی تبدیلیوں کو سمجھنا بھی مشکل نہیں۔

اپنے گھر کا خواب:۔

ہر عورت اپنے گھر کا خواب ضرور دیکھتی ہے، ایک ایسا گھر جہاں اس کی حکومت ہو، جہاں وہ اپنے بال بچوں اور شوہر کے ساتھ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق زندگی گزار سکے۔ جہاں وہ کسی کی دست نگر نہ ہو، جہاں اسے کوئی ہر بات پر ٹوکنے والا نہ ہو اور جسے وہ "اپنا گھر" کہہ سکے۔

نفسیاتی نقطہ نظر سے یہ بات ثابت ہے کہ عوت دو چیزوں میں بہت Possessive ہوتی ہے۔ ایک اپنے شوہر کے سلسلے میں اور دوسرے اپنے گھر کی بابت۔ وہ ان دونوں میں اشتراک کو کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی۔ مشترکہ خاندانی نظام یا متحدہ خاندانی نظام (Combined Family System) میں رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کوئی عورت، جب وہ بہو کے روپ میں ہو، اس نظام کو پسند نہیں کرتی۔ اور نہ وہ اس میں خوش رہ سکتی ہے۔ وہ اپنا گھر چاہتی ہے۔ اپنا! اور صرف اپنا! چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو! اور پھر عورت پہ ہی کیا موقوف گھر کا جذبہ مرد میں بھی موجود ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گھر کا تصور انسانی جبلت کا حصہ ہے۔

جب ہم اقبال اور کریم بی بی کے کیس کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی ازدواجی زندگی کے مسئلے کو گھمبیر سے گھمبیر تر بنانے میں اس محرومی کا بھی کافی حصہ نظر آتا ہے۔ سب کو اقبال کا کرب نظر آتا ہے کہ جب وہ یورپ سے واپس آئے تو ازدواجی زندگی ان کے

لئے سوہان روح تھی، وہ اذیت اور ذہنی کشمکش کا شکار تھے، ان کا یہ دکھ انہیں تنہائی میں رلاتا تھا، ان کی زندگی بقول ان کے بہت Miserable تھی اور وہ کریم بی بی کو ساتھ رکھ کر اسے مزید تکلیف وہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اس مسئلے سے تنگ آکر انہوں نے ملک چھوڑنے اور علم بغاوت بلند کرنے کی بھی ٹھان لی تھی اور اپنے اس سوز دروں کا بھی اظہار کیا تھا جو سب کچھ جلا سکتا تھا۔ غرض اقبال کے لئے یہ دور (۱۲۔۱۹۰۸ء) انتہائی صبر آزما اور اذیت ناک تھا۔

مگر کاش! کسی کی نظر اس مظلوم عورت کے دکھوں کی جانب بھی گئی ہوتی جس نے تمام عمر امیدوں کے سہارے کاٹ دی مگر جس کی امید کبھی بر نہ آئی۔ شادی کے بعد یہ امید کہ اقبال کی تعلیم مکمل ہو جائے تو ایک اچھی زندگی کا خواب پورا ہو گا، تعلیم مکمل ہو گئی مگر خواب ادھورا ہی رہا۔ ملازمت شروع ہوئی تو بھی مجازی خدا کی قربت میسر نہ آسکی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اقبال نے یورپ کا سفر اختیار کیا تو ایک نیا خواب، ایک سہانا خواب آنکھوں میں جاگزیں ہوا۔ تکلیفیں تو پہلے سے بڑھ گئیں مگر آسانیوں کی امید پر برداشت ہوتی رہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد اقبال کو اعلیٰ مقام حاصل ہو گا اور زوجہ اقبال کی حیثیت سے اسے بھی زیادہ عزت ملے گی۔ پھر ان تکلیفوں کا احساس مٹ جائے گا۔ منزل کو پا لینے کے بعد سفر کی تھکان جاتی رہے گی! مگر افسوس! آنکھوں میں بسنے والے سپنوں کو آنسو بن کر چھلکنا تھا۔ ملن کی آس میں رتجگوں سے گزرنے والی آنکھوں کو اب مایوسیوں بھری بے خوابیوں سے گزرنا تھا۔ سپنوں کا شیش محل چکنا چور ہونا تھا کیونکہ "اقبال نے یورپ سے واپسی پر دوسری شادی کا اعلان کر دیا۔"

یہی وہ بجلی تھی جس نے کریم بی بی کی امیدوں کے گلشن کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ کیا یہی وہ "بہار" تھی جس کے انتظار میں خزاں کی طویل مدت کے دکھ جھیلے تھے۔

بقول میاں محمد بخش:

آسے آسے عمر گزاری تے جھلے خار ہزاراں
مالی باغ نئیں دیکھن دیندا آیاں جدوں بہاراں

اقبال، جو فلسفے کی اتھاہ گہرائیوں سے واقف تھا، جو جذبوں کی شدت کو زبان دینا جانتا تھا، جو "نوائے غم" کی مدد سے "فلسفہ غم" کا اظہار جانتا تھا، کے لئے یہ دور کٹھن تھا تو ایک سیدھی سادی عورت کے لئے کس درجہ جاں سوز ہوگا۔ اس کے سوز نہاں کا کون اندازہ کر سکتا ہے، وہ اپنی دکھوں کا اظہار کس سے کرتی اور کیسے کرتی؟

جن کو امید تھی بہاروں کی
ان کو گلشن میں آشیاں نہ ملا

لیڈی اقبال . . . . اقبال کی پہلی بیگم

تحریر: بیگم سید عابد علی

علامہ مرحوم نے زندگی میں کئی شادیاں کیں۔ مجھے ان سے بحث نہیں۔ مجھے صرف اس بیوی کے بارے میں کچھ کہنا ہے جو ان کے سہرے کی بیاہی ہوئی تھیں اور جنہیں وہ سیالکوٹ سے بارات لے کر گجرات بیاہنے کو آئے تھے۔ یعنی والدہ آفتاب اقبال چونکہ میری ان سے عزیزداری تھی اس لئے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جب علامہ مرحوم کو "سر" کا خطاب ملا ہے تو بہنیں انہیں لیڈی اقبال کہہ کر چھیڑا کرتی تھیں ۔ اس طرح وہ لیڈی اقبال ہوئیں۔

لیڈی اقبال گجرات کے مشہور و معروف سول سرجن حاجی حافظ شیخ عطا محمد کی بڑی صاحب زادی تھیں۔ ان کی پانچ بیٹیاں تھیں جن میں سے چار خدا کے فضل سے زندہ سلامت موجود ہیں۔ ان میں سے منجھلی میرے چچا اور چھوٹی میرے بھائی سے بیاہی ہیں ۔علامہ کی شادی جب گجرات میں ہوئی تو وہ بہت کم عمر تھے۔ جس روز ان کی بارات آئی ہے ۔ تو علامہ کے میٹرک میں کامیاب ہونے کا تار گجرات میں آیا ہے۔

لیڈی اقبال میری بڑی بھاوج کی حقیقی بہن تھیں۔ چونکہ عمر میں میری بھاوج سے اٹھائیس سال بڑی تھیں اس لئے بھابھی انہیں اماں کہہ کر پکارتیں اور اسی لحاظ سے ہم لوگ بھی انہیں اماں کہا کرتے۔ اس طرح وہ ہماری اماں ہوئیں۔ اماں کو چھوٹی بہن سے بہت پیار تھا۔ تو وہ اکثر اوقات میرے بھائی کے ہاں رہا کرتیں اور ہم لوگوں سے بہت الفت و شفقت سے پیش آتیں۔ اماں کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک لڑکی معراج بیگم اور ایک لڑکا آفتاب اقبال (یعنی شیخ آفتاب اقبال ایم اے پی ایچ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لاء ۔آج کل کراچی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی موجودگی ہی میں علامہ نے

دوسری شادی کرلی تھی۔ اس لئے جب ان کی لڑکی معراج بیگم کا انتقال ہو گیا تو وہ اداس ہو کر اپنے میکے (گجرات) چلی آئیں اور اس کے بعد واپس نہیں گئیں۔ ان کا میکا چونکہ کھاتا پیتا مالدار گھرانہ تھا۔ اس کے بعد واپس نہیں گئیں۔ اس لئے یہاں رہنے میں انہیں کوئی تکلف نہ تھا۔ تاہم علامہ اپنی بقایا عمر ایک معینہ رقم بطور ماہوار خرچ کے ہمیشہ بھیجتے رہے اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ اور جب علامہ کا انتقال ہو گیا تو والئی ریاست جو علامہ کے مداح تھے تازندگی اماں کو پچاس روپے ماہوار بھیجتے رہے۔

اماں مرحوم بہت سیدھی سادی اور نیک دل عورت تھیں۔ ان کی زبانی میں نے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی ، حتیٰ کہ علامہ کی دوسری بیویوں کا جب ذکر کرتیں تو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس تغافل کے جو علامہ نے ان کے ساتھ برتا تھا - اماں کے دل میں ان کی محبت موجود تھی۔ کیونکہ جب کبھی گھریلو زندگی کے واقعات دہراتیں تو بڑے پیارے انداز میں آفتاب کے ابا کا ذکر کرتیں - " آفتاب کے ابا نے مجھے یوں کہا... آفتاب کے ابا نے مجھے یوں کہا۔" اس بات پر ہماری ان سے لڑائی ہو جاتی۔ ہماری ایک خالہ زاد بہن ان سے بہت بے تکلف تھیں۔ وہ چمک کر کہتی جانے بھی دو اماں ابھی تک تمہارے دل سے ان کی محبت نہیں نکلی... میں پھر کہوں گی۔ اماں جھٹ ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتیں کہ نہیں بھئی چاہے کچھ ہو شرعی طور پر وہ میرے سر تاج ہیں۔ ان کی عزت کرنا میرا فرض ہے اور پھر میرے ساتھ انہوں نے کوئی ناانصافی بھی نہیں کی۔ میں ہی بدقسمت ہوں جو ان کی خدمت نہیں کر سکی۔ آخری وقت میں جب علامہ عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے تو ان کے دل میں علامہ کی خدمت کی حسرت تھی لیکن پرانی وضع کی شرمیلی حیادار عورت تھی۔ جب وہاں جانے کا ذکر ہوتا تو کہتی کہ بھئی اب مجھے شرم آتی ہے۔ بیس سال ہوئے میں نے

ان کے گھر میں قدم نہیں رکھا۔ اب کس طرح جاؤں۔ آخری وقت میں اگر علامہ کی طرف سے اشارہ بھی ہوتا تو وہ بسرو چشم ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتیں لیکن آخر تک بیگانگی کا پردہ درمیان رہا اور ان کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

(اس پیراگراف میں بیگم بلقیس صاحبہ نے ایسی بات کا ذکر کیا ہے جس سے میں قطعی طور پر متفق نہیں ہوں۔ اور اس لئے ان کے پیراگراف کو اپنی کتاب میں بھی جگہ نہیں دے رہی' کتاب میں اس پیراگراف کی تردید میں مضمون کے آخر میں نوٹ کا اضافہ کرنے سے بہتر یہ سمجھا کہ سرے سے غلط پیراگراف کو مضمون سے نکال دیا جائے۔)

اماں کو اپنے بیٹے کی دلہن بیاہ لانے اور پوتا کھلانے کی بڑی حسرت تھی۔ ان کے صاحب زادے آفتاب اقبال صاحب جو میری بھاوج سے دو سال بڑے تھے بہت عرصہ انگلستان میں رہے اور بہت دیر کے بعد انہوں نے شادی کی۔ لیکن آخری وقت میں ان کی یہ دونوں حسرتیں خدا نے پوری کردیں۔ اپنے صاحب زادے کے پاس رہنے کی بھی انہیں بہت تمنا تھی اور جب وہ انگلستان سے حصول علم کے بعد واپس آگئے اور لاہور آکر انہوں نے رہائش اختیار کی تو یہ تمنا بھی پوری ہوگئی۔ یعنی وہ اپنے بہو بیٹے کے پاس چلی گئیں اور آخر دم تک ان کے پاس رہیں۔ جس طرح اماں کا نام سیدھا سادا کریم بی بی تھا اس طرح ان کی زندگی بھی سیدھی سادی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے ہر کام کرنے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ بچوں کو نہلانے دھلانے اور کھلانے پلانے کا کام بڑے چاؤ سے کرتیں اور کہتیں دعا کرو۔

خدا مجھے پوتا کھلانا نصیب کرے اور ہم واقعی ان کے حق میں دل سے دعا کرتے تھے۔

اماں علامہ کے نیک سلوک کی ہمیشہ تعریف کرتیں ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے کہ علامہ مرحوم میکلوڈ روڈ پر ایشر داس بلڈنگ کے سامنے ایک کوٹھی میں مقیم تھے ۔ساتھ ہی یعنی دیوار بیچ میرے بھائی کی اقامت تھی۔ ایک روز علامہ نے میرے بھائی کو بلا بھیجا اور کہا میں چاہتا ہوں کہ آفتاب کی والدہ کا حق مہر اپنی زندگی میں ادا کر دوں کہ یہ مجھ پر شرعی فرض ہے۔ آپ والدہ آفتاب سے اجازت لے کر یہ رقم انہیں دے دیجئے۔ ان کے ہاتھ کی رسید مجھے لا دیجئے۔ چنانچہ بھائی صاحب نے رقم مقررہ لا کر اماں کو دے دی اور انکے ہاتھ کی رسید علامہ کو پہنچا دی۔ رسید پر صرف ان کے دستخط تھے۔ اور کوئی تحریر نہ تھی۔ کیونکہ مرحوم اپنا نام لکھنے کے سوا پڑھنا لکھنا بالکل نہ جانتی تھیں۔

جب علامہ نے وفات پائی تو اماں کی دلی محبت ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور فوراً لاہور پہنچیں اور تجہیز و تکفین کی رسومات میں شریک ہوئیں"

بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی سے انتقام

رشیدہ بیگم

بابو عطا محمد علامہ سے ۱۷ سال بڑے تھے۔ بچپن میں اقبال کو اپنے بچوں کی طرح پرورش کرتے تھے۔ اقبال کی تعلیم پر روپیہ بھی خرچ کیا۔ اس لئے اقبال احسان مند تھے۔ ساری زندگی ان کے احسان تلے دبے رہے۔ بلکہ اخلاقی دباؤ میں تھے۔ حالانکہ جو خرچہ عطا محمد نے علامہ پر کیا تھا اس سے کہیں زیادہ وصول کر چکے تھے۔

بابو عطا محمد سخت مزاج اور غصے والے تھے۔ ان سے سارا گھر بہت ڈرتا تھا۔ اقبال ان کے بالکل برعکس ، شریف النفس اور بردبار تھے۔ وہ عطا محمد کی سختی سے نفرت بھی کرتے تھے۔

عطا محمد بہت موقعہ پرست بھی تھے۔ انہوں نے اقبال کی مقبولیت وشہرت کو اپنی ذات اور اپنی اولاد کے مفاد کے لئے مخصوص کر لینے کی کامیاب کوشش کی۔ اقبال کو اپنی بیوی اور بچوں پر توجہ دینے کا کوئی موقعہ نہ ملتا تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ آفتاب اقبال کی بجائے ان کا اپنا بیٹا اعجاز جو تقریباً" آفتاب اقبال کا ہم عمر تھا۔ علامہ کی توجہ کا مرکز بنا رہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بیوی کو شوہر سے ، بیٹے کو باپ سے جدا رکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ علامہ بھی ان کے اس سلوک اور رویہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علامہ نے ان کے متعلق کہا تھا۔

He has heart but no intellect عقل کی جگہ خود غرضی نے لے لی تھی ان کا بیٹا اعجاز بھی ان کے اس سخت رویہ کو پسند نہیں کرتا تھا اور علامہ کے والدین بھی ۔لیکن بہت مجبور تھے۔

عطا محمد کی بدسلوکیاں آفتاب اقبال اور ان کی والدہ کے ساتھ علامہ کی وفات تک جاری رہیں۔

اب تاریخ جہاں یہ بتائے گی کہ علامہ اپنی بیوی اور بیٹے سے ناراض تھے تو عطا محمد کا کردار

بھی لوگوں کے سامنے آئے گا۔ جو اس سارے ڈرامے میں ہیرو کا کردار انجام دے رہے تھے ۔یہی وجہ تھی کہ اقبال نے آفتاب پر ظلم اور ناجائز سختیاں دیکھتے ہوئے۔ جاوید اور منیرہ کو ان کا نشانہ نہ بننے دیا۔ شیخ عطا محمد کو سرپرستوں میں شامل نہ کیا۔

یہ تو عطا محمد کی زندگی کا پس منظر تھا۔ اب یہ بتانا ہے کہ اس ظلم وستم کے پیچھے عطا محمد کا کیا انتقام تھا۔ جو وہ اقبال سے لیتا رہا۔ بچپن میں تو ویسے ہی وہ سختی کرتے رہے۔ صرف اقبال کے ساتھ نہیں سب کے ساتھ۔ لیکن جب اقبال بڑے ہو گئے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ان کے پیسے کا حساب بھی چکا دیا تھا۔ پھر اس سختی کا کیا جواز تھا۔ جواز تھا۔ مذہبی انتقام۔

وہ اپنا مذہب بدل چکے تھے۔ احمدی ہو گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ سب گھر والے ان کی طرح احمدی ہو جائیں۔ لیکن یہاں ان کا وار نہ چلا۔ نہ والد۔ نہ والدہ نہ اقبال کوئی احمدی نہیں ہوا۔

جب تک مرزا غلام احمد صاحب نے نبوت کا دعوی نہیں کیا۔ اقبال اور اقبال کے والد ان سے ملتے تھے۔ ان کی عزت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ قابل انسان تھے۔ لیکن جب مرزا صاحب نے نبوت کا دعوی کر دیا تو اقبال اور انکے والد نے ملنا چھوڑ دیا۔ لیکن بابو عطا محمد نے بیعت کر لی۔ لہذا اس بات کا اس کو بہت غصہ تھا۔ کہ اقبال احمدی کیوں نہیں ہوئے۔ اب ان کو چین کی زندگی گزارنے نہیں دوں گا۔ ساری زندگی اقبال کو تنگ کرنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔

اقبال کے انتقال تک دشمنی جاری تھی۔ شیخ عطا محمد کی کوشش تھی کہ آفتاب اقبال اقبال کے جنازے کو کسی طرح کاندھا نہ دے سکے۔ لیکن اس وقت کسی کی مجال تھی کہ کوئی ایسا کرتا ۔یعنی آفتاب کو روکتا۔ آفتاب نے کاندھا بھی دیا اور جسم خاکی کو قبر میں خود اتارا۔ یہاں ڈرامے کا ایک منظر ختم ہوا۔ دوسرا شروع ہونے والا ہے۔

جب فاتحہ سوئم ہو چکی۔ وصیت نامہ نکالا گیا۔ اپنا نام سرپرستوں میں شامل نہ دیکھ کر انتقام کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ اس ڈرامے میں وہ آفتاب کو ہیرو بنانا چاہتا تھا۔ صرف اقبال

سے انتقام لینے اور اسے بدنام کرنے کے لئے۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ آفتاب کا ہمدرد بن کر اقبال کے خلاف استعمال کروں۔ اس لئے اس نے آفتاب کو خطوط لکھے اور اپنی زیادتیوں کی معافی مانگی۔ اور گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ اقبال کے خلاف ہو گئے اور آفتاب اقبال کے ہمدرد بن گئے اور آفتاب پر پورا زور لگایا۔ کہ ہبہ نامہ اور وصیت نامہ غلط ہے۔ اس کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اور اپنا حق مانگو۔ آفتاب صاحب نے اپنی والدہ سے ذکر کیا کہ تایا جی ایسا کہہ رہے ہیں اور اپنی سختیوں اور ظلموں کی معافی مانگ لی ہے۔ اب ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی والدہ نے جواب دیا۔ میں اس کی چال سمجھ گئی ہوں۔ وہ تمہارے والد سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنا ہمدرد مت سمجھو۔ انکی باتوں میں مت آنا۔ اور اپنے باپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا۔ اگر تم نے اپنے تایا کے کہنے پر باپ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میں تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی اور دودھ نہیں بخشوں گی۔

آفتاب اقبال نے والدہ کے مشورے پر عمل کیا۔ اور اپنے تایا کے کہنے پر کوئی مقدمہ بازی وغیرہ نہیں کی۔ بلکہ وہ سب کو یہی کہتے کہ میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو ضرورت ہے۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہوں۔ ان کی مالی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کے ننھیال والے بہت غریب ہیں۔

یہ تھا بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی سے مذہبی انتقام جب تک زندہ رہے اقبال کو برا بھلا ہی کہتے رہے۔

علامہ اقبال کی آل اولاد

علامہ اقبال کی (3) بیویاں	کریم بی بی، مختار بیگم، سردار بیگم
کے (2) بیٹے	آفتاب اقبال، ڈاکٹر جاوید اقبال
کی (2) بیٹیاں	معراج بیگم، منیرہ بانو
کے (5) پوتے	آزاد اقبال، وقار اقبال، نوید اقبال، منیب اقبال، ولید اقبال
کے (3) نواسے	اسد صلاح الدین، یوسف صلاح الدین، اقبال صلاح الدین
کے (2) پڑپوتے	جہاد اقبال، جہانگیر اقبال
کی (4) پڑپوتیاں	یاسمین، ثانیہ (کیتھرین فرانسیسی ماں سے)
	جیہان اقبال (والدہ فریدہ اقبال)
	فرح اقبال (والدہ ریشماں اقبال)

****

اولاد کی تفصیل: پہلی بیوی کریم بی بی صاحبہ کے بچے (معراج بیگم، آفتاب اقبال، بیٹا (ت)

دوسری بیوی مختار بیگم کے بچے۔ بچہ۔ ماں بیٹا فوت ہو گئے۔

تیسری بیوی سردار بیگم صاحبہ کے بچے۔ جاوید اقبال، منیرہ بانو

اب صرف ایک بیٹا جاوید اقبال (75 سال) اور بیٹی منیرہ بانو ے 69 سال) زندہ باکرامت ہیں۔

علامہ اقبال کی پہلوٹھی بیٹی معراج بیگم

علامہ اقبال کی پہلی زوجہ محترمہ کریم بی بی صاحبہ

محترم جناب آفتاب اقبال صاحب پہلا بیٹا

محترمہ رشیدہ بیگم صاحبہ پہلی بہو (بہو علامہ اقبال)

علامہ اقبال کے بڑے پوتے آزاد اقبال صاحب

علامہ اقبال کے بڑے پڑپوتے جہاد اقبال صاحب

علامہ اقبال کی بڑی پڑپوتی یاسمین اقبال صاحبہ

وحیدہ روشن دار القرآن ٹرسٹ میں محترمہ منیرہ بانو اور محترمہ ناصرہ صاحبہ تعزیت کے لئے آئیں (79)

آزاد اقبال کے گھر جدہ میں
جاوید اقبال، ناصرہ (جاوید کی بیوی) آزاد فیملی کے ساتھ (دسمبر ۹۵ء تصویر)

خفتگان خاندان اقبال

دادا جان، والدین، رفیقہ حیات، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، بھائی، بہنوئی اور ان کی اولاد کی فوتیدگی کا ریکا

نام	رشتہ	تاریخ	قبرستان	حوالہ
شیخ محمد رفیق	دادا جان	نامعلوم	روپڑ بھارت	مکتوب ڈاکٹر جاوید اقبال بنام سید نور محمد قادری
طالع بی صاحبہ	ہمشیرہ صاحبہ	31 جولائی 1902ء	کشمیریاں سیالکوٹ	"حیات اقبال" ایس ایم ناز
امام بی بی صاحبہ	والدہ محترمہ	9نومبر1914ء	امام صاحب سیالکوٹ	"مظلوم اقبال" شیخ اعجاز احمد
معراج بیگم	پہلوٹھی بیٹی	17اکتوبر1915ء	امام صاحب سیالکوٹ	"حیات اقبال" ایس ایم ناز
مختار بیگم	اہلیہ محترمہ	21اکتوبر1924ء	لدھیانہ (بھارت)	"مظلوم اقبال" شیخ اعجاز احمد
نور محمد صاحب	والد محترم	17اگست1930ء	امام صاحب سیالکوٹ	"حیات اقبال" ایس ایم ناز
سردار بیگم	اہلیہ محترمہ	23مئی1935ء	بی بی پاکدامن لاہور	"زندہ رود" ڈاکٹر جاوید اقبال
شیخ عطا محمد	برادر بزرگ	22دسمبر1940ء	کشمیریاں سیالکوٹ	"دانائے راز" سید نذیر نیازی
شبنم	پوتی	5ستمبر1945ء	معراج دین لاہور	"یادداشت" بیگم آفتاب اقبال
اکبری بیگم	بھتیجی	1948ء	قبرستان کوئٹہ	مکتوب سروش عرفانی بنام ماسٹر اکرام
شیخ امتیاز احمد	بھتیجا	30دسمبر1946ء	بحرین	مکتوب چوہدری ریاست علی بنام ماسٹر
کریم بی بی	اہلیہ محترمہ	28 فروری 1947ء	معراج دین لاہور	"اقبال اور گجرات" ڈاکٹر منیر احمد
شیخ نور احمد	بھانجا	1949ء	کشمیریاں سیالکوٹ	مکتوب چوہدری ریاست بنام ماسٹر اکر
شیخ فضل الٰہی	بھانجا	1954ء	پشاور سیالکوٹ	مکتوب چوہدری ریاست بنام ماسٹر اکر
شیخ ظہور احمد	بھانجا	22اگست 1954ء	کشمیریاں سیالکوٹ	مکتوب چوہدری ریاست بنام ماسٹر اکر

خ خورشید احمد	بھانجا	25 اگست 1954ء	کشمیریاں سیالکوٹ	مکتوب چوہدری ریاست بنام ماسٹر اکرام
ریم بی بی	ہمشیرہ	4 جولائی 1958ء	کشمیریاں سیالکوٹ	مکتوب چوہدری ریاست بنام ماسٹر اکرام
وفیسر منظور احمد	بھانجا	15 جولائی 1976ء	کشمیریاں سیالکوٹ	مکتوب چوہدری ریاست بنام ماسٹر اکرام
تاب اقبال	فرزند اکبر	13 اگست 1979ء	سخی حسن کراچی	"اقبال اور گجرات" ڈاکٹر منیر احمد
فار اقبال	پوتا	22 دسمبر 1988ء	سخی حسن کراچی	"خفتگان کراچی" پروفیسر محمد اسلم
ثار احمد	بھتیجا	18 دسمبر 1989ء	میانی صاحب لاہور	"خفتگان خاک لاہور" پروفیسر محمد اسل
مد ظفر الحق	بھانجا	27 جنوری 1990ء	سوسائٹی کراچی	"یادداشت گیتی شیخ" (بیٹی)
خ اعجاز احمد	بھتیجا	2 جنوری 1994ء	اسٹیل ٹاؤن کراچی	روایت نعیم احمد (فرزند شیخ اعجاز احمد)
یمہ مبارک	بھتیجی	20 فروری 1993ء	گلبرگ لاہور	خالد نظیر صوفی (تحریری)
رکت بی بی	بھتیجی	نامعلوم	کشمیریاں سیالکوٹ	چوہدری ریاست علی سیالکوٹ
مد سرور	بھانجا	نامعلوم	لاہور	یادداشت گیتی شیخ (بیٹی) شیخ ظفر الحق
ضل حق	بھانجا	نامعلوم	کشمیریاں سیالکوٹ	چوہدری ریاست علی
اطمہ بی بی	ہمشیرہ	نامعلوم	کشمیریاں سیالکوٹ	چوہدری ریاست علی
ینب بی بی	ہمشیرہ	نامعلوم	وزیر آباد	چوہدری ریاست علی

چراغ تلے اندھیرا

میں ادیب نہ نقاد۔ بس علامہ اقبال کی بڑی بہو کے رشتے کے ناتے، کچھ بڑے لوگوں کی سوانحی اغلاط کی نشاندہی کر رہی ہوں اور صحیح بات بھی تحریر کر رہی ہوں۔ اب ان غلطیوں پر گرفت کرنے والا اور کوئی نہ ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ میری اس سراغ رسانی پر صاحب کتاب حضرات برا نہیں مانیں گے اور اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے۔ اس طریقے سے کسی کی سبکی اور اپنی بڑائی کا پہلو نمایاں کرنے کی کسی شعوری کوشش میں مبتلا نہیں ہوں۔ اپنی معلومات کی روشنی میں غلطیاں سرزد کرنے والوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ آئندہ اس قسم کی غلطیوں سے گریز فرمائیں گے اور مداحین اقبال کو درست معلومات کا علم ہو سکے گا۔

(رشیدہ بیگم)

کوائف و سوانح بیگمات

علامہ اقبال کے والد کا نام:

شیخ نور محمد (۱) کریم بی بی (شادی ۱۸۹۲ء)

والدہ آفتاب اقبال و معراج بیگم۔

والدہ کا نام: امام بی بی (۲) سردار بیگم (نکاح: ۱۹۱۰)

بڑے بھائی کا نام: شیخ عطا محمد (۳) مختار بیگم (شادی ۱۹۱۲)

والدہ جاوید اقبال و منیرہ۔

"شاعر مشرق" صفحہ ۴۲ پیش لفظ: ڈاکٹر جاوید اقبال

یہ کتاب رئیس امروہوی مرحوم کے شاگرد رشید جناب بشیر فاروق صاحب نے تحریر فرمائی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں 'یوم اقبال' شایان شان طریقے سے منایا گیا۔ اس جلسے کی صدارت کے لئے علامہ اقبال کے ملازم علی بخش کو بطور خاص فیصل آباد سے کراچی بلایا گیا۔ اس جلسے میں بیرون ملک سے بھی مہمان مدعو تھے اور اس جلسے کے انعقاد میں جن حضرات نے سرگرمی دکھائی انہیں کونسل کی طرف سے 'میرٹ سرٹیفکیٹ' دیئے گئے۔ اس کتاب کے مصنف بشیر فاروق صاحب "اقبالیات" سے شغف رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں انہیں 'میرٹ

سر ٹیفکیٹ، سے نوازا گیا۔ کتاب میں سر ٹیفکیٹ کا عکس بھی دیا گیا ہے اور ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں علامہ اقبال کی بیوی مختار بیگم کی اولاد ڈاکٹر جاوید اقبال اور منیرہ بانو کو ظاہر کیا گیا ہے حالانکہ علامہ کی بیوی مختار بیگم کا تعلق لدھیانہ سے تھا اور وہ ۱۹۲۴ء میں لدھیانہ ہی میں علامہ اقبال کی موجودگی میں دم توڑ گئی تھیں۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب 'مظلوم اقبال' میں پورا واقعہ بیان کیا ہے کہ مختار بیگم جاوید اقبال کی سیالکوٹ میں پیدائش کے اٹھارہ روز بعد لدھیانہ میں انتقال فرما گئیں والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ وہ لاہور کی رہنے والی تھیں اور ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء میں لاہور میں ہوا۔

علامہ اقبال کی پہلی بیوی کا انتقال 28 فروری ۱۹۴۷ء میں لاہور میں ہوا۔ یوں ان کی دو بیویاں لاہور میں دفن ہیں اور ایک بیوی مختار بیگم لدھیانہ میں دفن ہے۔

بشیر فاروق صاحب نے نجانے اس غلطی کا ارتکاب کیسے کیا؟ میں علامہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی کی بہو ہوں اور مرحومہ کے ساتھ دو سال تک "لالہ زار کوٹھی" میں رہی ہوں اور مرحومہ کریم بی بی لاہور کے معراج دین قبرستان میں دفن ہیں۔

مزید معلومات کے لئے عرض ہے کہ علامہ اقبال کی دو بیویاں سردار بیگم اور مختار بیگم دس سال تک اولاد سے محروم رہیں اور ۱۹۲۴ء میں دونوں کے ہاں اولاد متوقع تھی لیکن مختار بیگم زچگی کے دوران ہی راہی ملک بقا ہوئیں اور سردار بیگم کے ہاں ڈاکٹر جاوید اقبال پیدا ہوئے۔

بہر کیف بشیر فاروق صاحب سے گزارش ہے کہ جس محنت ، جستجو اور تحقیق سے سید فقیر وحید الدین صاحب نے 'روزگار فقیر' مرتب فرمائی ہے۔ ویسی محنت اور تحقیق سے کام لے کر علامہ اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار فرمائیں۔

ہماری اجارہ داری نہ سہی ، لیکن رشتہ داری کے ناتے ہم ایسی غلط معلومات کا ضرور نوٹس لیں گے۔

اپنی کتاب کی دوسری اشاعت میں محولہ بالا غلطی کی تصیح فرمادیں۔ بیٹی کے غلط نام کا اندراج مولانا عبدالمجید سالک ایسے اہل قلم نے اپنی کتاب "ذکر اقبال" میں کیا اور بشیر فاروق صاحب نے بیویوں کے نام میں غلطی کا ارتکاب کر کے واقفان حال کو حیرت زدہ کر دیا۔

علامہ کی پہلی شادی میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں گجرات کے سول سرجن ڈاکٹر عطا محمد خان کی بیٹی مریم بی بی سے ہوئی تھی۔

(مکالمات اقبال- پروفیسر سعید راشد- صفحہ ۱۱۰)

آپ کی کتاب پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ کس قدر جانفشانی سے واقعات کو صحیح موقع محل میں چسپاں کر کے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ علامہ اقبال کی پوری زندگی کی "مووی" اوراق کتاب پر چل رہی ہے اور ہماری نظریں کتاب سے ہٹنے نہیں پاتیں۔ نجانے کتنی معتبر کتابوں کی ورق گردانی اور واقعات کی صحت کے اطمینان کے بعد آپ نے یہ انوکھی کتاب ترتیب دی ہے اور جب میری نگاہ پڑی تو میں آپ کی ایک غلطی کی گرفت کئے بغیر نہ رہ سکی۔

تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے کہ سیالکوٹ کے ایک نامی گرامی صنعت کار نے اپنی بیٹی کو جہیز دینے سے پہلے عام لوگوں کے دیکھنے کے لئے اس کی نمائش کا اہتمام کیا تاکہ یوں کسی چیز کی کمی کا پتہ چل سکے اور صاحب نمائش کی امارت کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بیٹھ سکے صنعت کار نے اپنے طور پر دنیا کی ہر چیز کو جہیز میں شامل کر دیا تھا۔ بہر کیف اسے یہ وہم تھا کہ تقریباً" کسی چیز کی کمی کی شکایت نہیں ملے گی۔

جیسے ہی نمائش میں خواتین تشریف لائیں اور وہ نمائش میں رکھی چیزوں کی رنگارنگی سے کافی متاثر ہوئیں اور جہیز کی تعریف و توصیف میں لگیں تعریفوں کے پل باندھنے کہ اتنے میں ایک بوڑھی عورت بھی آئی اور اس نے ہر چیز کو غور سے دیکھا اور نمائش دیکھنے کے بعد کہنے لگیں کہ اصل کام کی چیز تو اس جہیز میں موجود ہی نہیں۔

استفسار پر اس نے بتایا کہ گھر داری میں سب سے زیادہ اہمیت "توے" کو دی جاتی ہے اور (توا) تو سرے سے ندارد ہے۔ لہٰذا اور چیزوں کی نمائش فضول ہے اور یہ تقریباً" مکمل اور ادھورا جہیز ہے۔

پروفیسر صاحب! آپ کی محنت اور واقعات کی ڈرامائی تشکیل سے دل کو بڑی فرحت

محسوس ہوتی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے ایسی کتاب کے لئے کوئی کلمہ تحقیر ادا کرنا زیب نہیں دیتا لیکن آخر علامہ اقبال کی بڑی بہو کے ناتے کہوں گی کہ آپ نے علامہ اقبال پر سوانحی کتب کے ذخیرے کو ذرا گہری نظر سے پرکھا ہوتا تو آپ سے ایک فاش غلطی کا ارتکاب نہ ہوتا۔

ویسے میں خود جانتی ہوں کہ ہمارے ہاں سطحی قسم کی معلومات بھی انتہائی مایوس کن ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے اصل نام سے حنفی مسلک کے اکثر لوگ ناواقف ہیں اور ان کا اصل نام ان کی ''کنیت کی شہرت تلے دب کر رہ گیا ہے۔ تاریخ کی ایک تابندہ شخصیت نواب سراج الدولہ بھی لقب کے تلے اتنا دب کر رہ گئے کہ ان کے اصل نام سے ہمارے کئی تاریخ پڑھانے والے اساتذہ بھی بے خبر ہیں۔

یہ تو کنیت اور القاب کے جھگڑے تھے، مریم بی بی علامہ کے خاندان کی کسی خاتون کا نام نہیں ہے۔ منیرہ بانو کو خاندان کے لوگ "باجی بانو" اور یا "بانو" کے نام سے پکارتے ہیں۔

محترمہ کریم بی بی صاحبہ (جن کا نام آپ نے مریم بی بی تحریر فرمایا ہے) آخر عمر میں اپنی کہنہ سالی کی وجہ سے سب کی "اماں" کہلاتی تھیں اور اسی نام سے سب انہیں پکارتے تھے۔ میں خود ان کے ساتھ دو سال گزار چکی ہوں اور ہم انہیں "اماں" ہی پکارتے تھے۔

اس کتاب میں ایک مضمون "لیڈی اقبال" کے نام سے بیگم بلقیس کے قلم سے لکھا ہوا موجود ہے۔ اس میں جگہ جگہ وہ "اماں" کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔

آپ نے کس کتاب سے ان کا نام مریم بی بی نقل فرمایا ہے حالانکہ کم از کم میری نظر سے علامہ اقبال پر لکھی گئی کسی کتاب میں مجھے یہ نام نہیں ملا۔ مریم بی بی علامہ اقبال کی خالہ ساس ضرور تھیں۔ آپ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح فرمالیجئے گا۔ اتنی وقیع اور شاندار کتاب میں علامہ اقبال کی بیوی کے نام کا غلط اندراج بڑی زیادتی اور ناانصافی کے مترادف ہے۔ شیخ عطا محمد کے دو لڑکے اعجاز احمد اور مختار احمد تھے۔' (حیات اقبال صفحہ ۲۹)

چودھری ریاست علی ناظم علامہ اقبال لائبریری نے اطلاع دی ہے کہ شیخ امتیاز احمد کا ۳۰ دسمبر ۱۹۴۶ء میں بحرین میں انتقال ہوا اور انہیں بحرین ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ پروفیسر اسلم صاحب نے ایک صاحب کو دوران گفتگو بتایا تھا کہ امتیاز احمد نے کار اٹھائی تھی اور چھاتی پر بوجھ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا تھا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب "بلوچستان اور اقبال" میں علامہ اقبال کے ایک عزیز بابو عبدالحق کا ذکر کیا ہے جو کوئٹہ میں گھوڑا اٹھایا کرتے تھے۔

شیخ عطا محمد کے تین لڑکے تھے۔ تیسرے لڑکے کا نام امتیاز احمد تھا۔ شیخ عطا محمد اپنے خط بنام آفتاب اقبال محررہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۸ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"امتیاز کے واسطے یہاں کوئی صورت روزگار کی نہ ہو سکی اور وہ بے کار رہنا پسند کرتا تھا اس لئے وہ بحرین پرشین گلف جا رہا ہے۔ وہاں سے اس کے کسی دوست نے اسے خط لکھا ہے مکینک کا کام جاننے والوں کی وہاں ضرورت ہے۔ اول اول پانچ روپیہ روزانہ تنخواہ ملتی ہے جو دس روپیہ روزانہ تک ترقی ہو جاتی ہے۔ اس کے واسطے یہ موقعہ اچھا ہے۔ اگر دو چار سال اس کے وہاں لگ جاویں تو اس کے مستقبل کے واسطے بہتر ہوگا۔ پاسپورٹ ہوا رہا ہے۔ امید ہے عید کے بعد یہ یہاں سے رخصت ہو جائے گا۔ چنداں لمبا سفر نہیں ہے۔ دو یوم کراچی تک ریل اور آگے تین یوم سمندر کا سفر ہے۔ فی الحال یہ دو سال کے ارادہ سے یہاں سے جا رہا ہے۔"

۱۹۷۶ء میں پندرہ روزہ 'آتش فشاں، نے قائداعظم نمبر شائع کیا۔ اس رسالے میں سیالکوٹ سے سید مرید حسین صاحب نے قائداعظم کے دورہ سیالکوٹ (۲۸ اپریل ۱۹۴۴ء) کے سلسلے میں فرمایا۔

"ہم نے قائداعظم کی شایان شان استقبال کے لئے سیالکوٹ سے ۵ میل دور اگوکی کے مقام پر علامہ اقبال کے بھتیجے ممتاز یا امتیاز کو استقبال کے بھیجا تھا اور خود کوٹلی بہرام جی کے موڑ پر

ان کے استقبال کے لئے موجود تھے"۔

۱۹۹۷ء میں شیخ اعجاز احمد مرحوم کے فرزند اصغر نعیم احمد سے امتیاز احمد کے بارے میں پوچھا تو وہ گویا ہوئے کہ میرے چچا شیخ امتیاز احمد جوانی کے عالم میں ہی انتقال فرما گئے تھے اور ان کا ایک بیٹا افتخار احمد لاہور میں مقیم ہے اور اپنے نجی کاروبار میں مصروف ہے۔

ان حقائق کے باوجود ایک منجھے ہوئے قلم کار، جو ایک عرصہ تک لاہور رہ چکے ہیں اور صحافت کے شعبے سے بھی ان کا تعلق رہا ہے ،وہ اقبال کے سوانحی واقعات کے لئے علامہ کے فرزند اصغر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے ہی دریافت فرما لیتے تو انہیں پتہ چل جاتا کہ شیخ عطا محمد کے دو نہیں تین صاحبزادے تھے۔

میں کوشش کر رہی ہوں کہ علامہ اقبال کے بھتیجوں اور بھانجوں (تین بھتیجوں کے بارے میں بھی) کے بارے میں اپنی معلومات کی روشنی میں چند سطور سپرد قلم کر دوں تاکہ آئندہ کے لئے علامہ اقبال کے بھتیجوں اور بھانجوں کے بارے میں صحیح اور واضح معلومات مہیا ہو سکیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے بڑھاپے کے دور میں بڑی تگ ودو کے بعد معتبر اور صحیح معلومات کی فراہمی کے لئے کوشاں ہوں۔ اے کاش! اقبال کے خاندان کے دیگر افراد بھی اپنی یادداشتوں کی صورت میں کچھ تحریری مواد چھوڑ جائیں تاکہ سوانحی واقعات پر بطریق احسن روشنی پڑ سکے۔

مزید تلاش کے بعد پتہ چلا کہ "نقش اقبال" کے صفحہ ۱۲۸ پر امتیاز احمد کے بارے میں ڈاکٹر عبد الواحد یوں رقم طراز ہیں۔

"علامہ نے ایک بار اپنے بھتیجے امتیاز احمد سے چاقو چھین لیا چونکہ ڈر تھا کہ کہیں یہ اس چاقو سے اپنا ہاتھ نہ کاٹ لے۔ اس کی وجہ سے امتیاز رونے لگا۔ اس چھوٹے سے واقعہ کا اثر علامہ کے دل و دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ فوراً" ایک نظم جو "بانگ درا" میں "طفل شیر خوار" کے عنوان سے درج ہے نازل ہوئی۔ اس نظم کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

آہ کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے
میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں مجھے نامہرباں سمجھا تو

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حافظ بشیر احمد غازی آبادی کی قبر سے جو سڑک قبرستان کی شرقی دیوار کی جانب جاتی ہے اس کے آخری سرے پر علامہ محمد اقبال کے فرزند آفتاب اقبال کی آخری آرام گاہ ہے۔ ان کا انتقال لندن میں ہوا تھا لیکن میت کراچی لائی گئی۔ پہلے انہیں کورنگی میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی کے احاطہ قبور میں دفن کرنے لگے تھے لیکن ان کے عقائد واضح نہیں تھے۔ بعض لوگ انہیں قادیانی سمجھتے تھے اس لئے مفتی صاحب کے قریب انہیں جگہ نہ مل سکی۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آفتاب اقبال

فرزند اکبر سر محمد اقبال

تاریخ پیدائش: ۲۳ جون ۱۸۹۸ء

تاریخ وفات: ۱۳ اگست ۱۹۷۹ء

(یہی عبارت انگریزی زبان میں بھی مرقوم ہے۔ تعویذ کے دونوں جانب آیات الکرسی اور چاروں قل منقوش ہیں)۔("خفتگان کراچی" پروفیسر محمد اسلم صفحہ)

پروفیسر محمد اسلم صاحب جامعہ پنجاب کے سابق سربراہ شعبہ تاریخ ہیں اور اپنی کتاب "خفتگان کراچی" میں مرحومین کے صرف کتبات کو محفوظ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے لیکن عجیب تماشہ ہے کہ وہ قبروں کے کتبات کی درجہ بندی کرتے نظر آتے ہیں اور پھر اپنے اس قاعدہ سے انحراف کرتے ہوئے مرحومین کے مذہب اور عقیدہ پر فقرے کستے ہیں۔

آفتاب اقبال صاحب کی قبر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہیں قادیانی گردانتے ہیں کیونکہ انہیں کورنگی کے قبرستان میں دفن کی اجازت نہیں ملی تھی۔

میں سید نور محمد قادری کو بتا چکی تھی کہ جب ہمایوں اختر صاحب نے (اب مرحوم ہیں) مجھے بتایا کہ کورنگی کا قبرستان اہل دیوبند حضرات کا ہے اور وہ اپنے عقیدے کے مطابق قبرستان میں فاتحہ خوانی کے لئے عورت کو آنے سے روکتے ہیں تو مجھے خود ہی یہ پابندی منظور نہ تھی۔ پھر بھی جب صحیح اصولا" دارالعلوم سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے ذرا ترش الفاظ میں ممانعت کر دی تھی اور قبر کی اجازت دینے والے مفتی رفیع الدین عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اعتکاف میں بیٹھ چکے تھے۔

اصل حقائق کی خاطر جب ہمارا آدمی (کورنگی کے علاقے میں واقع ایک سرکاری اسکول کا صدر مدرس) پندرہ اگست ۱۹۷۹ء کو دارالعلوم پہنچا اور علاقے کے لوگوں سے پتہ چلا کہ

بیسویں رمضان کی شب کو عشاء کی نماز کے وقت یہ خبر گشت کرنے لگی کہ صبح علامہ اقبال کے فرزند اکبر جناب آفتاب اقبال کو دار العلوم کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا تو ایک فریق نے انتہائی جذباتی انداز میں فرمایا کہ اگر آفتاب اقبال صاحب کو یہاں دفن کیا گیا تو پورے دار العلوم کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ بم کی دھمکی سے مفتیان دین کی "تحقیق معاملہ" کی رگ نہ پھڑکی اور دو ٹوک انداز میں ممانعت کا اعلان فرمایا اور اس افواہ کے پھیلانے والے بھلے مانس (ماسٹر عباس صاحب جو نابینا اسکول میں مدرس تھے) نے ہمارے آدمی کے استفسار پر بتایا کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ کتاب کا حوالہ مانگا تو آئیں بھائیں شائیں کر کے رہ گئے۔

ان دنوں استقبالیہ پر سید محمد معروف (جو مولانا تقی عثمانی کے استاد ہیں اور پہلے "البلاغ" کے ایڈیٹر تھے) متعین تھے اور ان کے ہم کار مولانا فاروقی صاحب تھے۔ مولانا سید محمد معروف صاحب ہمارے آدمی کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ کر "جے ایریا" کے سامنے والے علاقے میں آئے تھے اور گاڑی میں حاضرات الارواح پر بات ہوئی تھی تو انہوں نے فرمایا تھا کہ میں "جسم" کے ساتھ روح کو بلاتا ہوں۔

رہا آپ کا میرے سیکریٹری سے خلافت آفس سے رابطہ کرنے کا مسئلہ تو میں آپ کو صاف صاف بتا دیتی ہوں میں نے کئی دفعہ قادیانیوں کی تنظیموں کو چندہ دیا ہے اور اب پچھلے دنوں مجھے ایک سیرت النبی کے جلسے میں بلایا گیا تھا جس کا اہتمام قادیانیوں نے کیا تھا۔ صرف اپنا اندازہ دکھانے کے لئے اگر کل کلاں وہ ہماری تصویر قادیانی خواتین کے زمرے میں شائع کر دیں تو میں قادیانی قرار پاؤں گی؟ پروفیسر صاحب اگر ہم صحیح معنوں میں مسلمان ہو جائیں تو آپ ہی مدعیان نبوت کے عقیدت مند نابود ہو جائیں۔

آپ 'قادیانی امت' کو ۱۹۷۴ء سے غیر مسلم قرار دے چکے ہیں لیکن ان کی چالبازیوں اور دروغ گوئیوں سے کتنے محفوظ ہیں۔ خدا کے لئے خود مسلمان بنیں اور راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ پر لائیں۔ محض باتیں بنانے سے قادیانی فتنہ سے کوئی محفوظ نہیں رہے گا۔ خدا آپ کو تاریخ کے واقعات سے سبق سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

باب اول

پیدائش، تاریخ پیدائش، بچپن کی شرارتیں

پیدائش: ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب اپنی کتاب 'اقبال کی ابتدائی زندگی' میں فرماتے ہیں کہ آفتاب اقبال صاحب کے نانا جان ڈاکٹر حافظ عطا محمد صاحب تقریباً" ۱۹۰۱ء تک اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے سلسلے میں 'پنڈ دادن خان'، ضلع شاہ پور میں بطور سول سرجن متعین تھے اور اسی قصبے میں آفتاب اقبال صاحب نے آنکھ کھولی اور اس زمانے کے دستور کے مطابق پہلوٹھا بچہ اپنے ننھیال ہی میں جنم لیتا تھا اور آفتاب اقبال صاحب کے نانا جان ایک کھاتے پیتے اور آسودہ حال تھے۔ اس لئے پہلوٹھی بچی معراج بیگم کی پیدائش کے موقع کے علاوہ دوسرے بچے آفتاب صاحب کی پیدائش کے موقع پر بھی بیگم اقبال (کریم بی بی صاحبہ) اپنے والدین کے پاس پنڈ دادن خان مقیم تھیں۔

علامہ اقبال اپنی پہلی بچی معراج بیگم کی پیدائش کے موقع پر برسر روزگار نہ تھے، وہ ابھی سیالکوٹ میں کالج میں زیر تعلیم تھے۔ بچی کی پیدائش کے تین سال بعد دوسرے بچے یعنی آفتاب اقبال صاحب کی پیدائش پر وہ سیالکوٹ کے مرے کالج سے لاہور کے ڈگری کالج میں اعلیٰ تعلیم کی خاطر مقیم تھے اور اب بھی وہ اپنے بچوں کے کفیل نہ تھے۔ ان کے بچوں کی کفالت علامہ اقبال کے والد محترم اور بڑے بھائی کے علاوہ ان کے سسر خان بہادر ڈاکٹر حافظ عطا محمد صاحب کے ذمہ تھی اور آفتاب اقبال صاحب کی والدہ صاحبہ کبھی بچوں کے ننھیال اور کبھی بچوں کے ددھیال ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں یہ دستور بھی تھا کہ کنبہ کی بڑھوتری کے ساتھ کنبہ کے شادی

شدہ افراد اپنے والدین کے ساتھ ہی رہائش پذیر ہوتے تھے اور اگر شادی شدہ بچہ سمجھ دار بھی ہوتا تو اسے اپنے خاندان کی اس روایت کو نبھانے کے لئے اپنے بچوں کو اپنے والدین کے پاس چھوڑنا ہوتا تھا اور ملازمت کے سلسلے میں وہ کہیں رہے اس کے اہل وعیال کا اپنے سسرال میں رہنا ایک احسن اور بہتر عمل تصور کیا جاتا تھا۔

اس دور میں ملازمت اختیار کرنا ایک نیا رواج تھا، لوگ عموماً" کاشتکاری یا دوسرے چھوٹے موٹے کاروبار سے وابستہ ہوتے تھے اور اپنے خاندان کی دال روٹی کا کام چلاتے تھے۔ علامہ اقبال کے خاندان کے تقریباً" زیادہ تر افراد تجارت سے اپنی روزی پیدا کرتے تھے۔ صرف ان کے والد میاں نور محمد صاحب درزی کے پیشے سے منسلک ہوئے تھے

-ہمارے دور کے مطابق یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ بچہ ابھی تعلیم کے حصول میں لگا ہوا ہے اور اسے کم عمری ہی میں رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔ اس زمانے میں کم عمری کی شادیوں کا رواج تھا۔ لہذا علامہ اقبال کے ہم عصروں میں کم عمری کی شادیوں کا نقشہ سامنا آتا ہے۔

شاید اس زمانے کے شعور کے مطابق یہ تصور ہو کہ کم عمری میں عائلی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد نئے نویلے جوڑے میں علیحدہ رہنے سے بعض گھریلو مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہ ہو اور والدین ان کی راہنمائی کا فریضہ ان کے اہل وعیال کو اپنی نگرانی میں رکھ کر بہتر طور پر انجام دینے کو ترجیح دیتے ہوں۔ ہندوپاک میں ابھی تک اکثریت اسی طرز زندگی کو اپنائے ہے جبکہ آج کی مہذب دنیا میں شادی شدہ جوڑا اپنے والدین سے علیحدہ زندگی بسر کرنے کا دلدادہ ہے اور اسی لئے زندگی کی سب آسائشیں اور سہولتیں میسر ہونے کے باوجود بعض اوقات علیحدہ زندگی بسر کرنے والے جوڑے

بڑی الجھنوں اور مصیبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اس روش کو اپنائے ہوئے ہیں۔ شاید اکیسویں صدی میں مشرق اور مغرب میں تفاوت مٹ جائے اور مشرق، مغرب کے رنگ میں رنگ جائے بہر کیف میرا مقصد ایک سرسری نظر میں قدیم وجدید طرز معاشرت پر اپنی محدود معلومات کی روشنی میں کچھ عرض کرنا تھا اور میں دراصل آج سے ایک سو سال پہلے پیدا ہونے والے انسان پر کچھ کہنے لگی ہوں۔ تو ایک صدی میں نجانے کتنے انقلاب برپا ہو جاتے ہیں اور رہن سہن کے طور طریقے یکسر بدل جاتے ہیں اور لوگوں کے ذہنوں میں قدیم معاشرت کا نقشہ نہ ہو تو وہ اس دور کی مشکلات یا آسائشوں سے کماحقہ، آگاہ نہیں ہو سکتے۔ بس اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے میں چند سطریں لکھ رہی ہوں اور یہ سطریں اپنے نفس مضمون سے ہٹی ہوئی نہیں ہیں۔

تاریخ پیدائش: مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے بارے میں لوگوں نے ایسی طبع آزمائی کی ہے کہ 'بزم اقبال' نے قارئین کی سہولت کی خاطر اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے اور اس سے پہلے وسیمہ بیگم نے بھی اپنی کتاب 'اقبال دردن خانہ' میں طبع آزمائی کی ہے اور شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی کتاب 'مظلوم اقبال' میں بڑی تفصیل سے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے لیکن عوام کے لئے تاریخ پیدائش کا تعین ۱۹۷۷ء میں قائم ہونے والی ایک کمیٹی نے کر دیا تھا اور اب بھی بعض محققین مجوزہ تاریخ پیدائش پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن یہی وطیرہ آفتاب اقبال صاحب کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختیار کیا جانے والا تھا۔ لیکن خدا کا کرنا کہ رضا لائبریری رام پور (بھارت) کے ناظم جناب اکبر علی خان عرشی زادہ نے

۱۹۷۸ء میں کچھ سوالات آفتاب اقبال صاحب کی خدمت میں روانہ کئے اور ان سوالات کو انہوں نے آفتاب اقبال صاحب سے اپنا تحریری انٹرویو قرار دیا اور انہوں نے لگے ہاتھوں آفتاب اقبال صاحب کی تاریخ پیدائش کے بارے میں بھی پوچھ لیا۔ آفتاب اقبال صاحب نے عرشی زادہ صاحب کے استفسار پر انہیں تاریخ پیدائش ۲۳ جون ۱۸۹۸ء بتائی۔ لوگوں کے ذہنوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی کیونکہ عرشی زادہ صاحب کے پہلے اور آخری تحریری انٹرویو سے پہلے مولانا حامد جلالی صاحب اپنے بالمشافہ انٹرویو میں آفتاب اقبال صاحب کی پیدائش اپنی کتاب 'علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی' میں صرف ۱۸۹۹ء لکھنے پر اکتفا کر گئے تھے اور انہی کی تاریخ پیدائش کو مستند اور ثقہ سمجھتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے 'نقوش' کے 'اقبال نمبر' میں آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش پہلی بار ۱۸۹۹ء نقل کی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ اولین دلیرانہ اقدام تھا کیونکہ اس سے پہلے اقبال کے حالات کے سلسلے میں اچھے بھلے قابل اور مستند مصنف آفتاب اقبال صاحب کی تاریخ پیدائش کو اپنی کتاب میں گول کر گئے۔ میرا اشارہ "روزگار فقیر" کے مصنف فقیر سید وحید الدین صاحب کی طرف ہے وہ آفتاب صاحب اور شیخ اعجاز احمد صاحب سے بخوبی واقف تھے لیکن نجانے کس مصلحت کی بنا پر وہ اپنی کتاب میں آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش سے صرف نظر کر گئے۔ بہر کیف میرے پاس آفتاب اقبال کی اسناد موجود ہیں اور آفتاب اقبال صاحب نے ان اسناد کے ساتھ ایک سرٹیفکیٹ رکھ چھوڑا ہے اور اس سرٹیفکیٹ میں پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے اپنی تاریخ پیدائش کی تصدیق چاہی ہے اور اس سرٹیفکیٹ میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۳ جون ۱۸۹۸ء درج ہے۔

اس موقعہ کی مناسبت سے میں ایک کتاب کا حوالہ دینا ضروری سمجھتی ہوں

کیونکہ کتاب کے مصنف کی پیدائش کا زمانہ تقریباً" آفتاب اقبال صاحب کی تاریخ پیدائش کے قریب قریب ہے اور اس دور کی ایک نئی روش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس کا اثر واقعی آفتاب اقبال صاحب کی پیدائش کے سلسلے میں سو فیصد درست ہے۔

" اپنی تاریخ پیدائش مجھے پہلے پہل اس وقت معلوم ہوئی جب گورنمنٹ ہائی اسکول واقع شہر اناؤ (اودھ ہندوستان) کے (جو میری جائے پیدائش ہے) چوتھے درجہ کے داخلہ کے فارم میں ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء کا اندارج کیا گیا۔ چنانچہ میرے ایس۔ ایل۔ سی (اسکول لیونگ سر ٹیفکیٹ) یعنی میٹرک کے امتحان کے سر ٹیفکیٹ میں یہی تاریخ پیدائش درج ہے۔ میں نے اسکول مذکور سے یہ امتحان ۱۹۲۲ء میں پاس کیا تھا اور اسی سر ٹیفکیٹ میں درج شدہ تاریخ پیدائش مستند ترین سمجھی جاتی ہے۔ یہ اندراج طفیل چچا یعنی بھائی جان (میرے والد صاحب قبلہ) کے حقیقی چچازاد بھائی طفیل احمد صاحب نے کیا تھا۔ جنہوں نے میرا داخلہ کرلیا تھا۔ مگر بھائی جان نے اناؤ کے ڈاک خانے میں میری نوعمری میں میرے نام کا ایک سیونگ بینک کا حساب کھولا تھا اس میں انہوں نے میری تاریخ پیدائش ۲۳ دسمبر ۱۹۰۴ء کی تھی۔ ظاہر ہے میں دو مرتبہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ فرماتے تھے کہ صحیح تاریخ پیدائش یہی بعد والی ہے مگر چونکہ اس زمانے میں ایس۔ ایل۔ سی کے امتحان میں بیٹھنے یا شاید داخلہ کے وقت عمر کی کوئی قید مقرر تھی۔ اس لئے طفیل چچا نے ان کے مشورے کے بغیر میری پیدائش کچھ مہینے پہلے کی لکھا دی تھی "۔(۱)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی دور کی برکات کے جلو میں پڑھے لکھے طبقے میں دو قسم کی تاریخ پیدائش کا تصور پیدا ہوا۔ بعض اوقات بچے کے مستقبل کی خاطر چند ماہ کے آگے پیچھے

نے دو قسم کی تاریخ پیدائشوں کو جنم دیا۔ ایک واقعی اصلی تاریخ پیدائش اور دوسری ایس۔ ایل۔ سی والی تاریخ پیدائش۔

آفتاب اقبال صاحب کی تاریخ پیدائش (۲۳ جون ۱۸۹۸ء) ایس۔ ایل۔ سی والی تاریخ پیدائش ہے۔ میں نے اصل تاریخ پیدائش جاننے کے لئے پنڈ دادن خان میں ایک آدمی بھجوایا۔ اس معتبر شخص (۲) نے اطلاع دی کہ مجھے میونسپل کمیٹی کے اہلکاروں نے بتایا ہے کہ تحصیل (پنڈ دادن خان اس زمانے میں تحصیل تھی) کا پیدائش کا ریکارڈ دس سال کے بعد ضلع کو منتقل کر دیا جاتا ہے اور انجانے میں ریکارڈ کی ضلع کی سطح پر چھان بین کے لئے ہمارے معتبر آدمی نے رابطہ کیا تو وہاں ریکارڈ دستیاب نہ ہوا ۔دراصل زمانہ حال میں پنڈ دادن خان کا ضلع جہلم ہے (چھان بین کے لئے جہلم کا رخ کیا گیا) لیکن پیدائش کے زمانے میں شاہ پور ضلع تھا۔

اس آمدورفت اور خط و کتابت میں کافی وقت صرف ہوا لیکن پھر معا" خیال آیا کہ ایک سو سال تک ریکارڈ کو مغربی اقوام محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ مشرقی اقوام میں 'آثار قدیمہ) پر توجہ دینا عبث خیال کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اس 'پیدائش ،کی مہم کو خیرباد کہنا پڑا۔ پنڈ دادن خان میں "دادن خان،، کے مقبرے کے پاس ہی حکیم غلام رسول صاحب (طبیہ کالج دہلی کے فارغ التحصیل) مطلب فرماتے ہیں اور اب ان کی عمر سو سال سے متجاوز ہے۔ اس عمر میں انسان کی یادداشت کافی متاثر ہو جاتی ہے اور وہ اگر اپنے بچپن کو دستک دینا چاہے تو واقعات کی صداقت اور تعین میں کافی دشواری پیش آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہذا آفتاب اقبال صاحب کے ہم عمر حکیم صاحب سے آفتاب اقبال صاحب کی تاریخ پیدائش کے بارے میں معلومات کو معتبر نہیں قرار دیا جاسکتا۔

کراچی میں خال خال لوگ موجود ہیں جنھوں نے آج سے تقریباً" ساٹھ سال پہلے علامہ اقبال کی نماز جنازہ پڑھی اور وہ علامہ اقبال کے فرزند اکبر آفتاب اقبال صاحب سے واقف ہیں لیکن وہ اب اپنی عمر کی اس سرحد پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کی یادداشت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً" ایک بڑے ہی معتبر انسان (۳) نے فخریہ انداز میں فرمایا کہ انہیں علامہ اقبال کی نماز جنازہ پڑھنے کا اتفاق ہوااور انہیں اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں اس اعزاز کو حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ حالانکہ ان کی بات حقائق کے منافی ہے کیونکہ لوگ واقعی اسلامیہ کالج کے احاطے میں نماز جنازہ کے لئے صف بندی کر چکے تھے لیکن پھر طے پایا کہ نماز جنازہ بادشاہی مسجد کے پاس ہی ادا کی جائے اس طرح افراتفری میں علامہ اقبال کے جسد خاکی کو اٹھا کر لوگ بادشاہی مسجد کی طرف روانہ ہوئے اور وہیں نماز جنازہ ادا کی گئی۔

دوسرے ایک نامی گرامی اور مشہور شخصیت (۴) نے علامہ اقبال کی نماز جنازہ پڑھی لیکن وہ سال غلط بتاتے تھے۔ جب ان کی تصحیح کے لئے ۱۹۳۸ء سن بتایا گیا تو وہ بگڑ گئے۔ دل کے مریض سے بحث میں الجھنا اسے موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ ان دو واقعات کے بعد یہی کہا جاسکتا ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد انسانی یادداشت اتنی متاثر ہوتی ہے کہ اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہت کم افراد ہوتے ہیں جن کی یادداشت بڑھاپے کی آخری حدوں تک بھی متاثر نہیں ہوتی۔

میں اب اس پوزیشن میں نہیں کہ قارئین کے سامنے آفتاب اقبال صاحب کی صحیح تاریخ پیدائش رکھ سکوں۔ ہاں اتنا ضروری ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش کو خاندان کے حوالے سے پرکھا جائے تو اس میں کچھ فرق محسوس ہوتا ہے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب کی تاریخ پیدائش بارہ جنوری سن اٹھارہ سو ننانوے ہے اور آفتاب اقبال صاحب ، شیخ

صاحب سے چند ماہ بڑے تھے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب کے والد محترم شیخ عطا محمد صاحب اپنے ایک مکتوب بنام آفتاب اقبال میں رقم طراز ہیں "آج پرانے کاغذات میں سے ایک فوٹو والد صاحب کا ملا - ان کی گود میں ایک طرف تم اور دوسری طرف اعجاز تھے۔ اس وقت تمہاری عمر ایک سال کی اور اعجاز ۹ ماہ کا تھا ،، (۵)

لیکن ایک روایت کے مطابق ان کی عمروں میں صرف چھ ماہ کا فرق ہے۔ اگر چھ ماہ والے فرق کی روایت کو دیکھا جائے تو آفتاب اقبال صاحب کی تاریخ پیدائش (۲۳ جون ۱۸۹۸ء) بالکل درست قرار پاتی ہے۔ اس تاریخ کو ایس۔ ایل۔ سی اور اصلی دونوں قسموں میں علیحدہ علیحدہ دیکھنے کی جائے ایک ہی سمجھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

میں اپنے "شریک حیات ،، کی صحیح تاریخ پیدائش کے سلسلے میں ۲۳ جون ۱۸۹۸ء والی تاریخ ہی درست اور ثقہ مانتی ہوں۔

Cert. Form No. 519.

UNIVERSITY OF THE PANJAB.

No. 915

Senate Hall, Lahore.

The 23rd August, 1940.

To

Aftab Ahmad Esqr.,

C/O Syed Sajjad Haider, B.A., LL.B.,

Kabir Darwaza, Gujrat (Pb).

This is to certify that the date of birth of Aftab Ahmad

Registered number Nil . Roll number 2814

son of Dr. Mohommed Iqbal was 23rd June, 1898

as shown by him in his Form of Application for admission to the

(Arts Faculty)
Matriculation / Examination held in 1916.

(TWENTY THIRD JUNE, ONE THOUSAND EIGHT HUNDRED AND NINETY EIGHT)

Controller of Examinations,
University of the Panjab.

آفتاب اقبال کی شرارتیں

۱۹۸۵ء میں شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں آفتاب اقبال کی شرارتوں کا بطور خاص ذکر کیا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد بہت سے قارئین نے استفسارا" پوچھا کہ کیا آفتاب اقبال صاحب واقعی بچپن میں شرارتی تھے اور ان سے منسوب شرارتیں درست ہیں۔ میں ان شرارتوں کا ذکر آفتاب اقبال صاحب سے بذات خود سن چکی تھی لہذا ایسے حضرات کے استفسار کا مثبت جواب دیا۔ میں مناسب سمجھتی ہوں کہ شیخ اعجاز احمد صاحب کی کتاب 'مظلوم اقبال'، کے صفحہ ۶۳ پر دی ہوئی شرارتوں کو پیش کر دوں۔

شرارت نمبرا:

گرمیوں کے دن تھے۔ چچا جان عدالت کی تعطیلوں میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے دوپہر کے وقت وہ حسب معمول 'بے جی'، کے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ کمرہ گلی کی طرف ہے۔ عین اس کمرے کے نیچے میدان میں سب لڑکے کھیل رہے تھے ۔ہمارے پڑوس میں آٹھ نو سال کی ایک قبول صورت لڑکی یتیم ہونے کے باعث اپنی پھوپھی کے پاس رہتی تھی۔ اس کا نام اللہ رکھی تھا۔ وہ آئی تو اسے دیکھ کر آفتاب کی رگ شاعری پھڑکی اور اسے مخاطب کرتے ہوئے پنجابی میں یوں قافیہ آرائی کی۔

رکھی... رکھی.... تیرے منہ تے بیٹھی مکھی

لڑکی سخن شناس نہ سہی لیکن اتنا تو سمجھتی تھی کہ چہرے پر مکھی بیٹھنا اس کا قصیدہ نہیں ہجو ہے۔ اس نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر اس کی پھوپھی جو محلہ بھر میں کلہ درازی اور گرم گفتاری کے لئے مشہور تھی آگئی

۔آفتاب بھائی کی قافیہ آرائی کا حال سن کر اس نے "نثر" میں "شاعر" کی سات پشتوں کو پن ڈالا۔ یہ ہنگامہ برپا تھا ملازم لڑکا ہماری طلبی کا حکم لے کر آیا۔

ہم سب ڈرتے ڈرتے چچا جان کے حضور پیش ہوئے۔ یقین تھا کہ سب کی پٹائی ہو گی اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسے گا۔ چچا جان خاموشی سے اُٹھے۔ کھونٹی پر پھوپھی جی کا سفید ململ کا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ اسے لے کر مکھی کا قافیہ باندھنے والے 'شاعر' کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے اور کمرے کے کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد 'بے جی' نے آکر ان کی خلاصی کرائی۔ آفتاب بھائی نے اپنی حیات میں فلسفہ، قانون اور نہ جانے اور کس کس میدان میں اپنے اشعب طبع کو دوڑایا لیکن قافیہ آرائی کے میدان کی طرف پھر رخ نہیں کیا۔ شاید چچا جان کے طریقہ تادیب کا نفسیاتی اثر ہو۔

شرارت نمبر ۲

ابا جان سے جسمانی سزا پانے میں دوسرا نمبر بھائی آفتاب کا تھا۔ وہ لڑکپن میں بے حد شریر تھے اور ان کی پٹائی زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے ہوئی جو بعض اوقات خطرناک قسم کی ہوتیں۔ ایک دن ہمارے مکان کی ڈیوڑھی میں کچھ چھوٹی لڑکیاں گیند سے کھیل رہی تھیں۔ کونے میں ہماری گائے بندھی تھی جس لڑکی کی پشت گائے کی طرف تھی۔ آفتاب بھائی نے چپکے سے اس کی چوٹی گائے کی دم سے باندھ دی۔ گائے نے دم جو ہلائی تو اس کی آزادی میں رکاوٹ کے احساس سے وہ دولتیاں جھاڑنے لگی۔ اس کے ساتھ دم سے بندھی بے چاری لڑکی پٹخنیاں کھانے لگی۔ شکر ہے کہ دو ایک پٹخنیوں کے بعد اس کی چوٹی کا پراندہ جو اون کا تھا اس کھینچا تانی میں ٹوٹ گیا اور لڑکی کی

جان بچ گئی۔

شرارت نمبر ۳

جہاں تک مجھے یاد ہے میرا چھوٹا بھائی مختار اور پھوپھی جی کے دو بیٹے ظفر اور اصغر جو ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ لبا جی سے پٹنے سے محفوظ رہے اور میرا شمار بھی اسی "زمرے میں ہوتا اگر ایک مرتبہ گیہوں کے ساتھ گھن پسنے کا واقعہ نہ ہو جاتا۔ ہوا یوں کہ لبا جان ہم سب لڑکوں کے لئے سٹیفنز کی سیاہی جو ان دنوں بہت چلتی تھی کی ایک بڑی بوتل خرید لائے یہ بوتل ایک قسم کے پتھر کی ہوتی تھی۔ بوتل کے منہ پر کارک ٹھنسا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ احتیاط کے لئے بوتل کے منہ کو لاکھ سے سربہ مہر کیا ہوا تھا۔ لبا جان کی ہدایت تھی کہ وہ خود بوتل کھولیں گے لیکن آفتاب بھائی ایسا کرنے کے لئے بے چین تھے - دوپہر کو جب گھر کے لوگ آرام کر رہے تھے۔ آفتاب بھائی نے مجھے کہا کہ آؤ بوتل کھولیں میں نے منع بھی کیا لیکن وہ نہ مانے۔ بوتل اور کارک اسکرو اٹھا لائے۔ بے جی کا کمرہ خالی تھا۔ اقبال منزل کو تعمیر ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ لبا جی نے اس کمرے کو خاص طور پر آراستہ کیا تھا۔ تقریبا" پورے کمرے میں چوبی تخت بچھے تھے۔ ان پر نئی دری اور اس پر ایک درمیانہ سائز کا ایرانی قالین اور اس پر گاؤ تکیہ، نہ معلوم آفتاب بھائی نے بوتل کھولنے کے لئے خاص اس مسند کو کیوں منتخب کیا۔

اس پر بیٹھ کر اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان سیاہی کی بوتل رکھ لی۔ کارک اسکرو لگا کر زور سے کارک کو کھینچا۔ بوتل لڑھک گئی۔ اس کی سیاہی سے آفتاب بھائی کے

ہاتھ اور ان کے کپڑے رنگین ہونے ہی تھے۔ نیچے قالین اور دری بھی تر بتر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں کی سٹی گم ہو گئی۔ گھبراہٹ میں آفتاب بھائی نے کہا چلو بھاگ چلیں۔

شہر کے وسط میں سالباہن کا قلعہ ایک مشہور جگہ ہے۔ ان دنوں شہر کا تھانہ، میونسپل ہال، میونسپل کمیٹی کے دفاتر، پبلک لائبریری اور گورنمنٹ ہائی اسکول سب قلعہ پر ہوتے تھے اور لڑکوں کے کھیلنے کے لئے ایک کھلا میدان ہوتا تھا۔ گھر سے فرار ہو کر ہم نے وہاں پناہ لی۔ گھر میں جب یہ راز کھلا تو ہمارے لئے ڈھنڈیا پڑی۔ میرے بہنوئی اور پھوپھی زاد بھائی فضل الٰہی مرحوم (۶) ہمیں قلعہ سے پکڑ لائے۔ آفتاب بھائی کے تو ہاتھ اور ان کے کپڑے ارتکاب جرم کی گواہی دے رہے تھے اور میرا جائے واردات سے آفتاب بھائی کے ساتھ فرار ہونا گویا جرم میں شمولیت کا اعتراف تھا لہذا دونوں کو آٹھ آٹھ بید ہاتھوں پر کھانے پڑے اور میرا "سزا یافتہ،، نہ ہونے کا ریکارڈ خراب ہو گیا۔

باب نمبر ۲

ابتدائی تعلیم ، ثانوی تعلیم ، کالج کی تعلیم ، بیرون ملک اعلیٰ تعلیم

ابتدائی تعلیم : (سیالکوٹ) (۱۸۹۸ء - ۱۹۱۱ء)

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب نے اپنی کتاب 'اقبال کی ابتدائی زندگی میں بہت تحقیق کے بعد بہت قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ معلومات نہ صرف اقبال کی ابتدائی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں بلکہ ان کے لخت جگر آفتاب اقبال صاحب کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں بھی بڑی کارگر اور مفید ثابت ہوئی ہیں۔ آفتاب اقبال صاحب کے دور میں (بیسویں صدی کے اوائل میں) شرفا کے بچوں کی رسم تسمیہ ، کا انعقاد عمل میں لایا جاتا تھا اور پھر بچے کو باقاعدہ کسی مکتب میں ناظرہ قرآن اور فارسی کی تدریس کے لئے بھجوادیا جاتا تھا۔

آفتاب اقبال صاحب کے بچپن کے دوست حاجی عبدالسلام مرحوم (۱) نے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے نام ایک خط میں سرسری حوالہ دیا ہے کہ آفتاب صاحب کے دادا جان میاں نور محمد صاحب نے بڑے چاؤ سے اپنے پوتے کی رسم تسمیہ ، منعقد کی تھی اور حاضرین مجلس میں مٹھائی تقسیم کی تھی۔

مکتب کی تعلیم سے فراغت کے بعد صاحب حیثیت لوگ اپنے بچوں کو تعلیمی اداروں میں داخلہ دلوادیتے تھے۔ تقریبا" ہندوستان پر (خصوصا" پنجاب) انگریزوں کے پچاس سالہ دور تسلط نے اپنا رنگ جمانا شروع کردیا تھا اور ضلع سیالکوٹ کے لوگوں میں تعلیم کے حصول کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ حکومت نے پہلی بار تعلیمی اداروں کا جال بچھایا لیکن ساتھ ہی ساتھ عیسائیت کے پرچار کے لئے مقامی لوگوں کی

تعلیم کے لئے مختلف مشنری اداروں نے اپنے مدارس قائم کیے۔ ان مدارس میں تعلیم کا معیار بلند تھا۔ بچوں کو دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور جدید علوم فنون سے بھی آگاہ کیا جاتا تھا۔ سمجھ دار طبقہ نے اس منبع سے مستفید ہونے کی ٹھانی کیونکہ ہمارا دین تعلیم کے حصول کو فرض قرار دیتا ہے۔

سیالکوٹ شہر میں کنک منڈی کے ساتھ ہی ایک مشنری ادارہ قائم ہوا جس میں مولانا سید میر حسن اور جناب غلام علی صاحب (ڈاکٹر جمال بھٹہ مرحوم اور اقبال شیدائی کے والد گرامی) اور دوسرے مذاہب کے اساتذہ صاحبان بھی تدریس پر مامور تھے۔ اس ادارے سے علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور دوسرے نامور لوگوں کے علاوہ آفتاب اقبال صاحب نے استفادہ کیا۔ علامہ میر حسن تقریباً" ساٹھ برس تک اس ادارے سے وابستہ رہے اور اگر وہ بصارت سے محروم نہ ہوتے تو شاید مرتے دم تک تدریس سے منسلک رہنے کا ریکارڈ قائم کر دیتے۔

آفتاب اقبال نے اسی ادارے سے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ اس دور میں ابتدائی تعلیم (پرائمری) تیسرے درجے تک محدود تھی۔ چوتھے درجے سے ساتویں درجے تک وسطانیہ اور آٹھویں سے دسویں جماعت تک ثانوی تعلیم ہوتی تھی۔ دسویں جماعت کا امتحان پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوتا تھا۔ ابھی آفتاب اقبال صاحب وسطانیہ میں تعلیم پا رہے تھے کہ علامہ کے کسی دوست نے ایک نئے ادارے تعلیم الاسلام ہائی اسکول کے اعلیٰ معیار تعلیم اور تربیت کا ذکر چھیڑا۔ اپنے لخت جگر کی معیاری تعلیم اور اعلیٰ تربیت کی خاطر علامہ اقبال نے اسے اس نئے مدرسے میں بھجوا دیا۔

اس مدرسے کا انتظام و انصرام "قادیانی جماعت" کے اکابرین کے ہاتھ میں تھا۔ اس دور میں 'قادیانی جماعت' میں معتدل قیادت تھی اور عوام الناس میں کسی قسم کے

شکوک و شبہات نہ تھے۔

اس اقدام کو علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے علامہ اقبال کی قادیانی جماعت سے عقیدت کا اظہار قرار دیا ہے اور علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اس داخلے میں شیخ عطا محمد صاحب کا ہاتھ بتایا ہے۔

بہر کیف علامہ اقبال ایسا عاشق رسول ایسے حیا سوز اقدام کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے پیش نظر ادارے کا معیار تعلیم اور اعلی تربیت کا انتظام تھا۔ صحاح ستہ کی معتبر ترین کتاب 'صحیح بخاری'، کا آغاز حدیث 'اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'، سے ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں اسلام کی تقریباً" تمام تعلیمات کا نچوڑ موجود ہے۔

محدثین نے اس حدیث کی شرح میں تقریباً" ایک سو صفحات میں مفہوم کو واضح کرنے کی سعی فرمائی ہے۔

علامہ اقبال کی نیت بخیر تھی اور ان کی نیت پر حملہ ٹھیک نہیں۔

میں کم علم عورت ہوں لیکن حضرت آقا جی (۲) اور حضرت اللہ چاپایا (۳) کی تربیت کا فیضان ہے کہ میں اپنے عقیدے پر پختگی سے قائم ہوں۔ اس دور کی ایک عجیب سوغات تھی کہ لوگ تقریباً" قادیانی، اہل تشیع اور اہل سنت کے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور اپنی معاشرتی اور معاشی ضروریات کے پیش نظر دلوں میں دشمنی، کدورت اور کینہ نہیں رکھتے تھے۔

علامہ اقبال کے استاد علامہ سید میر حسن کی پوتی حلیمہ کے حوالے سے سید سلطان محمود حسین صاحب نے اپنی کتاب 'علامہ اقبال کے استاد علامہ میر حسن'، میں ایک بیان نقل کیا ہے کہ ہمارا خاندان (اہل تشیع، قادیانی اور اہل سنت والجماعت میں) بٹا ہوا

ہے اور میں اپنے حنفی عقائد پر سختی سے قائم ہوں۔

اگر علامہ اقبال کے گھر اور مکتب کے ماحول پر ایک نگاہ ڈالیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اتنے گھمبیر ماحول میں اپنے عقائد پر قائم رہنا بڑی ہمت اور اعلیٰ بصیرت کے حامل انسان کا کام ہے۔ ڈھلمل یقین والوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال خود بھی قادیانی جماعت کی سازشوں سے بچے رہے اور ان کی اولاد بھی اس فتنے سے محفوظ رہی۔ اگر ان کے خاندان میں کچھ لوگ اس جماعت سے وابستہ ہوں تو علامہ اقبال پر الزام کیوں۔

خدارا اسلام سیدھا سادہ مذہب ہے اور اس کی تعلیمات پر عمل کیجئے۔ علامہ اقبال اور ان کے خلفوں کو اس مذہب کی سلک میں پرونے کی سعی سے باز رہیئے۔

اس بحث کو اس لئے چھیڑا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں آفتاب اقبال صاحب کو حصول تعلیم اور اعلیٰ تربیت کے لئے قادیان بھیجا گیا اور 'قادیان' میں قیام کی بدولت آفتاب اقبال اس جماعت کے دوسرے خلیفہ جناب مرزا بشیر الدین محمود کے اخلاق سیئہ سے باخبر ہوئے اور انہوں نے مرزا بشیر الدین محمود کے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سے آگاہ کیا تھا کہ میں ایک عورت کے ناطے اپنے قلم سے اس روداد کو بیان کرنے سے لرزہ محسوس کرتی ہوں۔

میرا جامعہ پنجاب کے سابق سربراہ شعبہ تاریخ پروفیسر محمد اسلم صاحب کی تاریخ دانی کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ بغیر تحقیق میرے بیٹے وقار اقبال اور میاں آفتاب اقبال صاحب پر الزامات لگائے ہیں اور اس کتاب میں سید نور محمد (۴) قادری نے اپنے ایک مضمون میں ان کی خوب خبر لی ہے۔ اس کتاب میں مختلف مقامات پر تاریخی خطوط سے اس مذہب کی حقانیت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت مجھے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا ہے اور میں نے اپنے طور پر حقائق کی نقاب کشائی کی ہے اور کسی بات کو گول مول رکھنے سے گریز کیا ہے۔

ثانوی تعلیم: تعلیم الاسلام ہائی اسکول' قادیان

(۱۹۱۱ء-۱۹۱۶ء)

۱۹۱۱ء میں آفتاب اقبال صاحب کو تحصیل علم کے لئے قادیان بھیجا گیا۔ قبل تقسیم ہند ضلع گورداسپور کی حدود ضلع سیالکوٹ سے ملی ہوئی تھیں اور ضلع سیالکوٹ کی ایک تحصیل نارووال (جس کا قصبہ فیض نگر فیض احمد فیض کا پیدائشی مسکن ہے۔ کے ساتھ تحصیل بٹالہ کا قصبہ قادیان آباد تھا۔ قادیان کے ساتھ ہی دینا نگر آباد تھا (جسے سید نذیر نیازی مرحوم کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے)۔ قادیان میں حکیم نور الدین صاحب نے اپنے دور خلافت میں ایک مثالی مدرسہ 'تعلیم الاسلام، ہائی اسکول کے نام سے قائم کیا۔

قادیان میں آفتاب اقبال صاحب تقریبا" پانچ سال تک قیام پذیر رہے۔ اس دور میں والدین اپنے بچوں کو عموما" اپنے گھر کے قریب ہی اسکول میں بھجواتے تھے لیکن علامہ اقبال کو اپنے لخت جگر کی تعلیم کا اس قدر خیال تھا کہ انہوں نے معیاری اور اعلی تعلیم کی خاطر اپنی نرینہ اولاد کو اپنے آبائی شہر سیالکوٹ سے کافی فاصلے پر واقع ایک کم سہولیات سے مزین علاقے میں بھجوادیا۔

اس مثالی ادارے میں تعلیم کے دوران آفتاب اقبال صاحب تعطیلات میں عموما" ریاست مالیر کوٹلہ میں اپنے نانا جان کے ہاں چلے جاتے تھے اور ۱۹۷۸ء میں ریاست مالیر کوٹلہ میں واقع اقبال میموریل ٹرسٹ کے سیکریٹری جناب محمد کفایت اللہ لاہور تشریف لائے تھے اور کسی ذریعے سے ان کا رابطہ آفتاب اقبال صاحب سے ہوا اور انہوں نے آفتاب اقبال صاحب سے ان کے نانا جان کے قیام کے بارے میں اور آفتاب اقبال صاحب کے اصل نام کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ موصوف کے خط کا

بڑا مفصل جواب آفتاب اقبال صاحب نے بھجوایا تھا۔ اپنے خط میں اپنے ایک بہنوئی شمشاد احمد (جو خالہ شہزادہ کی بیٹی سیمیں کے میاں ہیں) کا ذکر کیا ہے جو آج کل وزارت خارجہ میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں اور انہی کی دعوت پر آفتاب اقبال صاحب ایران تشریف لے گئے تھے اور میرے نام ایران سے ایک خط بھیجا تھا جس کا پورا متن 'بیوی کے نام خطوط' میں دیا جارہا ہے۔

بہر کیف ثانوی تعلیم کے دوران قادیان۔ ریاست مالیر کوٹلہ اور سیالکوٹ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال نے والدہ جاوید اقبال صاحب سے نکاح کیا جبکہ آفتاب اقبال صاحب کی بہن معراج بیگم (۶) اپنی والدہ کے ہمراہ سیالکوٹ مقیم تھی۔

اقبال منزل سیالکوٹ میں پھوپھی کریم بی بی صاحبہ اور معراج بیگم نوشت و خواند سے واقف تھیں۔ علامہ اقبال کی اپنی بیٹی معراج بیگم سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی ۔علامہ اقبال اپنی بیٹی معراج بیگم کو بہت چاہتے تھے۔

لیکن جب علامہ اقبال کی دوسری شادی کے چرچے ہوئے اور یہ خبر سیالکوٹ پہنچی تو ہر فرد نے اپنی سمجھ کے مطابق اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن علامہ اقبال شادی پر مصر تھے اور ۱۹۱۰ء میں سردار بیگم والدہ جاوید اقبال سے نکاح بھی کر چکے تھے ۔پھوپھی کریم بی بی صاحبہ نے اپنی بھتیجی معراج بیگم کے ساتھ مل کر اپنے بھائی علامہ اقبال کو کس انداز سے دوسری شادی سے باز رکھنے کا منصوبہ تیار کیا تاکہ وہ اپنی بھاوجہ کریم بی بی صاحبہ (زوجہ اولی علامہ اقبال) کی نظروں میں اپنا مقام پیدا کر سکے۔ اس کا انکشاف 'اقبالیات' کے ضمن میں پہلی بار کیا ہے۔ تنگی اور عسرت کے دور میں پھوپھی کریم بی بی صاحبہ 'اقبال منزل میں اپنے والدین کے ساتھ بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر تھیں۔

علامہ اقبال کی شادیاں دراصل قدرتی حالات کے تقاضے کے تحت انجام پائیں ۔علامہ اقبال کو شریعت کی رو سے چار شادیوں کا چاؤ نہیں تھا بلکہ ان کی دوسری شادی بھی شرعی تقاضوں کے تحت تھی۔ کیونکہ ان کی بیوی بچے علامہ اقبال کے برادر اکبر شیخ عطا محمد صاحب کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے اور ان کے اپنے صاحبزادے کالج کی تعلیم کے لئے دہلی قیام پذیر تھے اور علامہ اقبال انہیں پینتیس روپے ماہوار خرچہ ادا کرتے تھے ۔اور ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد لاہور میں اپنے چچا کے ساتھ رہتے تھے۔

آفتاب اقبال صاحب بچپن میں کافی شریر تھے اور دیکھا گیا ہے کہ ذہین بچے ہی زیادہ شرارتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غبی اور کند ذہن بچوں سے شرارت کی توقع نہیں کی جاسکتی - ذہین اور سمجھ دار بچوں کو اپنے گھریلو ماحول سے عموماً" زیادہ متاثر ہوتے دیکھا گیا ہے۔

علامہ اقبال کی دوسری اور تیسری (بحالت مجبوری) شادی نے سیانے بچوں (اٹھارہ اور چودہ سالوں کے) کو کافی متاثر کیا اور بڑی بہن معراج بیگم پہلے سے بیمار تھیں اور پھر والد محترم کی دوسری اور تیسری شادی اور اپنی والدہ کے دکھوں میں اضافے کا بوجھ نہ سہار سکیں اور بیماری شدت اختیار کر گئی اور وہ لقمہ اجل بن گئیں۔

بیٹے میں تھوڑے سے باغیانہ جذبات پیدا ہوئے لیکن والدہ کی دانش مندی نے اس ماحول کو سنبھالے رکھا حتیٰ کہ آخری دم تک علامہ اقبال کی تعریف و توصیف کرتی رہتی تھیں اور بعض اصحاب نے معراج بیگم کے خطوط کو بنیاد بنا کر ان پر الزام تراشی کی ہے اور اگر علامہ اقبال کی اصلیت سے آگاہ ہونے کی خواہش ہو تو 'اقبالیات' کے ضمن میں 'لیڈی اقبال، مضمون کا مطالعہ بغور کیجئے۔

جس تناظر میں، میں آفتاب اقبال صاحب کی ثانوی تعلیم پر روشنی ڈال رہی ہوں

،وہ اس خاندان کے اندرون خانہ حالات اور جوان اولاد کے جذبات کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہی ہوں۔ بعض حالات سے بے خبر بے پر کی اڑاتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنے بیٹے کو عاق کردیا تھا حالانکہ علامہ اقبال کی دوسری اور تیسری شادی کے موقع پر آفتاب اقبال صاحب تعلیم الاسلام ہائی اسکول کے ہوسٹل میں قیام پذیر تھے اور تعطیلات میں ریاست مالیر کوٹلہ کا رخ کرتے تھے۔ جہاں ان کے نانا اچھا مشاہرہ پاتے تھے اور نواب مالیر کوٹلہ کے ذاتی معالج کی حیثیت سے انہیں بہت سہولیات میسر تھیں۔

۱۹۱۸ء میں آفتاب اقبال صاحب کے نانا جان نے ریاست مالیر کوٹلہ سے سبکدوش ہو کر گجرات کا رخ کیا اور اس زمانے میں آفتاب اقبال صاحب دہلی کے اسٹیفنز کالج میں زیر تعلیم تھے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ آفتاب اقبال صاحب کو سیر وسیاحت کا شوق تھا اور وہ مناظر قدرت کی تصاویر اتارنے میں بھی ماہر تھے اور شاید ان کی ابتدائی زندگی میں سفر نے انہیں سیر وسیاحت کا رسیا بنا دیا ہو۔ اپنی وفات سے ایک سال قبل وہ اپنے عزیز دوست اور پرائیویٹ سیکریٹری جناب ہمایوں اختر صاحب کی ہمراہی میں جرمنی، سوئزرلینڈ اور انگلستان کی سیاحت پر روانہ ہوئے تھے اور خوب سیر سپاٹے کئے اور ڈھیروں تصاویر اتاریں۔

کالج کی تعلیم: سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی

(۱۹۱۶ء - ۱۹۲۰ء)

آفتاب اقبال صاحب کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۷۹ء تک مسلسل سفر میں رہے۔ عام آدمی کی زندگی میں اتنے اسفار کا تصور نا ممکن ہے - وہ تعلیم کے سلسلے میں بھی سیالکوٹ سے قادیان اور قادیان سے دہلی جا پہنچے۔

دہلی کے قیام نے ان کی زندگی میں تنگ نظری اور نفرت کے جذبات کو یکسر نابود کر دیا کیونکہ مشنری اداروں میں نظم وضبط، پابندی اوقات اور حق گوئی و بے باکی پر کافی زور دیا جاتا تھا۔ دہلی کا یہ مشنری ادارہ ہندوستان کا ایک منفرد ادارہ تھا جہاں فلسفہ، تاریخ اور اخلاقیات کی تعلیم کے لئے بہترین اور برصغیر کے مانے ہوئے اساتذہ موجود تھے۔ یورپ کے بہترین پادری تدریس سے وابستہ تھے اور کالج کے عملے میں مقامی اور یورپین عملے کا ایک حسین امتزاج تھا۔

برصغیر کا یہ واحد ادارہ ہے جہاں فلسفہ کی تدریس کے لئے نامور اساتذہ موجود تھے اور ادارے کی خوش قسمتی تھی کہ مقامی و یورپین اساتذہ صاحبان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔

کالج میں ابتدائی سال تو خیریت سے گزر گئے لیکن بعد ازاں بعض انگریز افسران کی ناسمجھی کی بدولت انگریز سرکار کو سنگین حالات سے دوچار ہونا پڑا اگر ہم سیاسی طور پر نگاہ ڈالیں تو آفتاب اقبال صاحب کے داخلے کے وقت پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا اور لڑائی کی وجہ سے لوگ مالی مشکلات میں پھنس گئے تھے اور علامہ اقبال نے اپنے کئی خطوط میں لوگوں کی قلیل آمدنیوں کا ذکر فرمایا ہے اور آفتاب اقبال صاحب کو مزید خرچے کی ادائیگی سے معذوری کا اظہار فرمایا ہے۔ آفتاب اقبال صاحب نے اپنا ماہوار

خرچہ پینتیس سے پچاس مانگا تھا۔ علامہ اقبال نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر اپنے جگر گوشے آفتاب اقبال کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حالات کے تقاضے کے پیش نظر اپنی تعلیم کو ایف۔ اے تک محدود رکھیں اور اگر اعلیٰ تعلیم کا شوق ہو تو اسے نجی طور پر جاری رکھا جائے۔

علامہ اقبال کے اس مشورے کو آفتاب اقبال صاحب نے اپنے نکتہ نظر سے غلط سمجھا اور کوشش کی کہ وہ اپنی والدہ محترمہ اور اپنے نانا جان کی مالی مدد سے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہوں۔ انہیں خیال پیدا ہوا کہ ایک عظیم اور لائق فائق باپ کا بیٹا ادھوری تعلیم سے خود والد محترم کے نام کے لئے ایک بد نما دھبہ ثابت ہوگا۔

آفتاب اقبال صاحب نے اپنے والد محترم سے مشورہ کئے بغیر ہی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں لندن جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور وہ اپنے والد محترم سے اب مشورہ کیا طلب کرتے۔ بہر کیف جس وقت آفتاب اقبال صاحب لندن کے لئے روانہ ہوئے جنگ عظیم کے بادل تو چھٹ چکے تھے لیکن جلیانوالہ باغ کے واقعہ نے انگریزی اقتدار میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ انگریزوں نے مقامی لوگوں سے انتقام اتنا شدید لیا کہ لوگ انگریزوں کے اقتدار کے خاتمے کے لئے کمر بستہ ہو گئے اور سیالکوٹ کے ایک طالب (۹) علم جو علامہ اقبال کے استاد زادے تھے ،انگریزوں نے ان کی گرفتاری کے لئے پورا جتن لگایا ،لیکن انگریزوں کو جھل دے کر وہ ہندوستان سے فرار ہو کر جلاوطن حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ سیاسی رہنما ،طلبا اور عام لوگ انگریزوں سے بد ظن ہو گئے اور ان کی سلطنت میں سورج کے طلوع ہونے کے بھی روا دار نہ تھے۔

آفتاب اقبال صاحب نے ۱۹۳۰ء میں لندن کے ایک "ایٹ ہوم،، میں

انگریزوں کے ملک میں ہی انگریزوں کے خلاف زور دار تقریر کی اور برصغیر کی آزادی کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی۔

دہلی میں انہیں یورپین اور اردو کے اہل زبان اساتذہ سے انگریزی اور اردو میں تقریری اور تحریری استعداد کے بڑھانے کے وافر مواقع نصیب ہوئے۔ اور ان کے زمانے کے ایک مشہور استاد ایف۔سی۔اینڈریوز کا تذکرہ ضروری ہے۔ جناب ضیاء الدین احمد برنی نے اپنی کتاب "عظمت رفتہ" میں ایف۔سی۔اینڈریوز کا خاکہ دیا ہے اور وہ خاکہ اتنا دلکش اور معلومات افزا ہے کہ اس کے مندرجات سے ہمارے دور کے نوجوان طبقے کو روشناس ہونا ضروری ہے۔ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر آفتاب اقبال صاحب کے یورپی استاد ایف۔سی۔اینڈریوز کے خاکہ کو اس کتاب میں شامل کرنے سے گریز کیا ہے۔

آفتاب اقبال صاحب کو اگر سیالکوٹ میں علامہ میر حسن سے فارسی ادب اور عربی پڑھنے کا اتفاق ہوا اور قادیان میں بعض اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا تو دہلی کے مشنری ادارے میں ایف۔سی۔اینڈریوز نے ان کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

اردو فارسی اور انگریزی کی مہارت کی وجہ سے انہیں اپنی زندگی میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آفتاب اقبال صاحب عزم و استقلال کے پہاڑ تھے وہ حق گوئی اور بے باکی کے قائل تھے اور اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور حق کی خاطر دوسروں کو جھاڑ دیتے تھے۔ ان کی یہ خوبی ان کی اولاد میں بھی اللہ نے ودیعت کر رکھی ہے اور حق کی خاطر وہ بھڑ جاتے ہیں۔

میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ "روزگار فقیر" کے مصنف فقیر سید

وحید الدین کو ان کی غیبت کی وجہ سے باآواز بلند اپنی کوٹھی سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ان کی کڑک دار آواز کا کون متحمل ہو سکتا تھا۔ وہ قائد اعظم اور علامہ اقبال کی خلوت کی گفتگو کے عینی شاہد تھے اور وہ خوب جانتے تھے کہ حق کی آواز نسوانی آواز میں نہیں مردانہ آواز میں پیش کی جاتی ہے اور اسی انداز سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔

سینٹ اسٹیفنز کالج میں تعلیم کے دوران انہیں نفسیاتی طور پر کافی الجھنوں کا سامنا تھا لیکن وہ سب الجھنوں سے چھٹکارا بھی چاہتے تھے اور اعلیٰ تعلیم کا خواب بھی پورا کرنا چاہتے تھے۔ اسی دور میں علامہ اقبال نے اپنے دوست راجہ پرشاد کو اپنے بیٹے آفتاب اقبال کے بارے میں لکھا تھا اور خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی بزرگ کی بیعت میں دے دیں گے یا اسے رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیں گے۔ لیکن علامہ اقبال اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے کے لئے کوئی کام نہ کر سکے اور حالات کی وجہ سے آفتاب اقبال صاحب کی شادی موخر ہوتی گئی اور علامہ اقبال اپنے بیٹے کو سہرا باندھے نہ دیکھ سکے آفتاب اقبال صاحب کی والدہ محترمہ اپنے بیٹے کی شادی دیکھ سکیں اور انہیں ایک عرصے کے بعد اپنے بیٹے آفتاب صاحب کے ہمراہ رہنے اور اپنے پوتے آزاد کو کھلانے کا ارمان پورا ہوا اور وہ خوش خوش اس دار فانی سے رخصت ہوئیں۔

ایف۔ سی۔ اینڈریوز

لندن

۱۹۲۴ء- ۱۹۲۱ء ۱۹۳۱ء- ۱۹۲۶ء

آفتاب اقبال صاحب ۱۹۲۱ء میں بڑے چاؤ سے انگلستان میں وارد ہوتے ہیں اور ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوتا ہے کہ انہیں ہندوستان میں اپنے اکلوتے ماموں جناب کیپٹن غلام محمد کی اچانک فوتیدگی کا علم ہوتا ہے۔ وہ ابھی اپنی زندگی کی انتیس بہاریں ہی دیکھ پائے کہ موت کے ظالم ہاتھ نے انہیں دبوچ لیا۔ ان کی رحلت ملازمت سے سبکدوش والد کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ ہوتا ہے۔ اسے وہ عمر کے تقاضے کے مطابق برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے اور بیٹے کی جواں مرگی ان کے لئے پیغام اجل لے آتی ہے۔ اور دوسرے سال یعنی ۱۹۲۲ء میں وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اب بظاہر سبھی مالی سہارے ختم ہوگئے اور آفتاب اقبال لندن میں یکاو تنہا رہ گئے اس صورت میں مس بیک (۱۰) واقف ہوتی ہیں وہ ان کی ڈھارس بندھاتی ہیں اور ایک غیبی مالی سہارے کے طور پر ان کے کام آتی ہیں۔ آفتاب اقبال صاحب کو ان کے ہاں شام کی چائے پینے کا موقع میسر آتا ہے اور مختلف مواقع پر معاشرے کے بااثر لوگوں سے ملواتی ہیں اور ان کی ذہانت اور لیاقت پر بات چھیڑتی ہیں۔

آفتاب اقبال صاحب چونکہ مالی مشکلات سے دوچار ہیں لیکن پوری تندہی اور محنت سے اپنی پڑھائی پر توجہ مرکوز کردیتے ہیں اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں آخرکار ۱۹۲۴ء میں ایم - اے کی ڈگری کے حامل ہوتے ہیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری انہیں دراصل ان کے ایک مقالے کی وجہ سے عطا کی جاتی ہے۔ یہ مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے سے جدا ہے۔ اس دور میں بی۔ اے کے اختیاری مضمون میں تحقیقی کام دکھانے پر لندن یونیورسٹی ایم۔ اے کی ڈگری عطا کردیتی تھی۔

بعض حضرات جناب آفتاب اقبال صاحب کو مقالے کی وجہ سے ڈاکٹر لکھتے ہیں ۔ سر ظفر اللہ خان نے سر اکبر حیدری کو مکتوب تحریر کرتے وقت آفتاب اقبال کا تعارف ایم ۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی سے کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔

آفتاب اقبال صاحب کو لندن میں قابل اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا اور انہوں نے موقع و محل کی مناسبت سے خوب فائدہ اٹھایا اور انکی قابلیت کا لوہا ان کے استاد بھی مانتے تھے۔ آفتاب اقبال نے اپنا مقالہ پروفیسر Hicks کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچایا تھا اور پروفیسر Hicks صاحب نے آفتاب اقبال صاحب کی جی کھول کر تعریف کی ہے اور جب ہندوستان میں انہیں ملازمت کے سلسلے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے تصدیق نامے (Testimonial) سے انہیں سرفراز فرمایا۔ اپنے تین سالہ قیام میں آفتاب اقبال صاحب نے بڑی محنت اور جانفشانی سے پڑھائی جاری رکھی اور وہ لندن یونیورسٹی سے ایم ۔ اے کی ڈگری لے کر واپس ہندوستان لوٹے۔

ہندوستان میں واپسی پر آفتاب اقبال صاحب شعبہ تعلیم میں کسی اعلیٰ عہدے کی خواہش رکھتے تھے اور اس دور میں پنجاب میں حکومت کے کرتا دھرتا لوگ ان کے والد محترم (علامہ اقبال) سے سیاسی اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کی بھینٹ آفتاب اقبال صاحبکی ذہانت اور قابلیت چڑھ گئی۔ آخر دو سال تک اچھی ملازمت کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد وہ واپس لندن لوٹ گئے۔ لندن میں دوبارہ آمد پر مس بیک نے ایک مشفق ماں کا کردار انجام دیا۔

مس بیک کی کوششوں سے آفتاب اقبال صاحب کو لندن یونیورسٹی کے ادارہ السنہ شرقیہ میں اردو پروفیسر کی جگہ مل گئی اور پوری لگن اور محنت سے وہ اس ادارے میں اپنی ذمے داریوں کو نبھاتے رہے اور ساتھ ہی انہوں نے (LINCON's INN) (۱۲)

میں بیرسٹری کے لئے داخلہ لے لیا۔ لندن یونیورسٹی کے ادارے سے وہ ۱۹۲۹ء تک منسلک رہے اور اس ادارے سے ان کی علیحدگی کے متعلق معلومات کا قطعاً" کوئی علم نہیں اس کے بارے میں انہوں نے بات نہیں کی تھی۔

پے در پے مشکلات کی وجہ سے وہ کافی کبیدہ خاطر ہوئے اور گول میز کانفرنس میں حیدر آباد وفد کے اراکین سے آفتاب اقبال صاحب نے اپنی مالی مشکلات بیان کیں تو انہیں ۱۹۰ پونڈ کا قرضہ مل گیا۔ اس قرضے کے بعد وہ فیس کی ادائیگی کے بعد اپنی ڈگری لینے کے قابل ہوئے۔

لندن میں پہلی بار تین سال رہ کر آفتاب اقبال صاحب ایم۔ اے فلسفہ کی ڈگری لے کر واپس ہندوستان لوٹے تھے اور اب دوسری مرتبہ تقریباً" چھ سال قیام کر کے ملازمت بھی کی اور بیرسٹری کے لئے کوشاں رہے بالآخر مارچ ۱۹۳۱ء میں بیرسٹر بن کر واپس ہندوستان لوٹے۔

دوسری مرتبہ انہوں نے مختلف مضامین میں مشہور ماہرین کے خصوصی لیکچرز میں بھی حصہ لیا اور معاشیات و سیاسیات میں اعلیٰ معلومات حاصل کیں۔

لندن میں آفتاب اقبال صاحب کو مالی مشکلات کا کافی سامنا رہا لیکن وہ ہمت نہ ہارے اور مسلسل کوشش کرتے رہے۔ لندن میں اچھے لوگوں سے متعارف ہونے کے باوجود وہ حسب دل خواہ ملازمت نہ حاصل کر پائے اور جب لندن میں دوبارہ واپس لوٹے تو انہیں لندن والی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض اوقات اپنوں میں اچھے مواقع نہیں ملتے اور غیروں میں انسان کی قدر ہوتی ہے۔

لندن میں آفتاب اقبال صاحب پر اتنی مصیبتیں ٹوٹیں کہ وہ کڑی سے کڑی مصیبت میں بھی ثابت قدم رہے اور مایوسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا اور بالآخر لندن ایک مالی مشکلات کی بھٹی تھی جس میں جھونکے جانے کے بعد وہ کندن بن کر نکلے

-اور ۱۹۴۷ء میں ان کے مقدر کا ستارہ گردش سے نکل چکا تھا اور پھر ان کے سامنے روپیہ پیسہ کمانے کے اتنے وسیع مواقع آئے کہ کراچی کی بہت سی فرمیں ان کی موکل تھیں اور اگر ۱۹۵۱ء کے ٹریڈ مارک (۱۳) جرنل پر نظر ڈالی جائے تو تقریبا " تیں کے قریب فرموں کا کاروبار آفتاب اقبال صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ اور اب وہ اوروں کے معاشی حالات کی ابتری کے زمانے میں آسودہ اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے اور اللہ کے فضل و کرم سے وہ موٹر نشین بھی ہو چکے تھے۔

افسوس ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء تک کے حالات سے بے خبر محقق ابھی تک حیدر آباد دکن کے آرکائیوز سے علامہ اقبال اور ان کے فرزند آفتاب اقبال کے خطوط کی برآمدگی کے کار خیر پر سرگرم عمل ہیں۔ اے کاش آفتاب اقبال خود اپنے حالات کو سپرد قلم فرماتے اور لوگوں کو اپنے مالی حالات سے آگاہ فرماتے لیکن ۱۹۴۱ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے علیحدگی کے بعد انہوں نے عملی طور پر چپ سادھ لی تھی۔

اللہ تعالٰی نے انہیں ہر قسم کی سہولت سے نوازا اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہے۔ فلیٹ کی رہائش سے کرائے کی کوٹھی میں منتقل ہوئے اور آخر ۱۹۶۰ء کے زمانے میں اپنی ذاتی اور وسیع و کشادہ کوٹھی میں رہائش پذیر ہوئے اور اس کوٹھی میں مہمانوں کی آؤ بھگت میں، میں جتی رہتی تھی۔ مہمانوں میں بھوپال کی شہزادی (۱۴) بھی شامل تھیں، ان کی آمد والے دن ہمارے گھر میں ایک جشن کا سماں تھا۔ انہی شہزادی کے والد محترم عزت ماب نواب حمید اللہ خان مرحوم نے علامہ اقبال کے جگری دوست جناب راس مسعود صاحب (۱۵) (سرسید کے پوتے) کی کوشش سے علامہ اقبال کو پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ جاری کیا تھا اور ان کی آخری عمر میں مالی مشکلات میں بڑا سہارا ثابت ہوا۔ علامہ اقبال کے انتقال کے بعد ریاست حیدر آباد سے علامہ اقبال کی بیوہ (کریم بی بی صاحبہ والدہ آفتاب اقبال) اور علامہ کے دو نابالغ بچوں جاوید اقبال اور منیرہ کو مبلغ پچاس پچاس روپے کے دو وظائف جاری ہوئے۔

باب سوئم

شاہراہ حیات پر

۱۹۲۶ء۔ ۱۹۲۴ء میں آفتاب اقبال صاحب لندن سے ایم۔ اے فلسفہ کی ڈگری لے چکے تھے۔ اور ہندوستان میں واپس آکر کسی اچھی سی ملازمت کے لئے تگ ودو کرتے رہے لیکن ہندوستان کے سیاسی حالات نے انہیں مناسب ملازمت کے حصول میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ دل شکستہ ہو کر دوبارہ ۱۹۲۶ میں لندن واپس لوٹ گئے۔

انہیں مس بیک کی مساعی سے لندن کے ادارہ السنہ شرقیہ میں تدریس اردو کے لئے لیکچرار کی آسامی پر فائز کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک وہ اپنے تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اس ملازمت سے ان کے اخراجات کا بندوبست ہو گیا اور آفتاب اقبال صاحب نے ملازمت میں رہتے ہوئے بیر سٹری کے لئے لنکنز ان میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ بیر سٹری کا امتحان کامیابی سے پاس کر چکے لیکن رقم کی ادائیگی میں ناکامی کے سبب وہ بیر سٹری کی سند نہ لے سکے۔

بہر کیف چند سال لندن میں ملازمت کے بعد وہ پھر بے روزگاری کے ہاتھوں پریشان رہے اور روپے کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہے اور انہیں پیسوں کے حصول کے لئے کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار ۱۹۳۱ء میں واپس لاہور لوٹ آئے۔

پنجاب کی حدود میں ملازمت نہ ملی تو وہ علامہ اقبال کے دوست مولوی فضل الحق (بنگال میں وزیر تعلیم تھے) کے پاس کلکتہ پہنچے اور مولوی صاحب کی سفارش سے انہیں اسلامیہ کالج کلکتہ (ابوالکلام کالج) اور کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی اور فلسفہ کی تدریس کے لئے پروفیسر کا منصب ملا۔

۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک وہ اسلامیہ کالج کلکتہ اور کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک رہے لیکن لندن اور لاہور میں گزارے دن انہیں ستانے لگے اور وہ اپنے وطن مالوف لوٹنے کے لئے پر تولنے لگے۔

کلکتہ میں انہیں اسلامیہ کالج میں اردو زبان کے بزرگ شاعر رضا علی وحشت کلکتوی کی صحبت میسر آئی۔

وحشت کو علوم شرقیہ کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ ان کی کئی کتابیں انگریزوں کو اردو سکھانے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ انہوں نے علامہ شبلی، خواجہ الطاف حسین حالی اور شیخ علی حزیں کو انگریزی خواں طبقے سے روشناس کرایا ڈاکٹر اے۔ ایچ ہارلے پرنسپل اسلامیہ کالج کلکتہ نے ان کے بعض انگریزی مضامین کا انتخاب رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع کیا۔ وحشت ایک نقاد اور انشا پرداز کی حیثیت سے بھی ممتاز تھے۔

آفتاب اقبال تقریباً" دیار افرنگ میں دس سالہ قیام کے دوران یورپی اداروں میں اردو تدریس کا بھی تجربہ رکھتے تھے۔ لندن میں دوران تعلیم انگریزی زبان میں تحریری اور تقریری ملکہ رکھتے تھے۔ ان کے لئے ہندوستان کے اس انگریزی زدہ شہر میں انگریزی زبان وادب اور یونیورسٹی کی سطح تک فلسفہ کی تدریس کوئی مشکل کام نہ تھا۔

وحشت صاحب کے ساتھ انہیں تقریباً" تین سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کا موقع ملا اور اس دوران علامہ وحشت اور کالج کے پرنسپل ہارلے صاحب سے تبادلہ خیال کا موقع میسر آتا ہوگا۔ بڑی خوش آئند بات ہے کہ علامہ اقبال جس شاعر کی ان الفاظ میں تعریف کریں، اس کے ہمراہ انہیں ایک ساتھی استاد کا درجہ حاصل رہا ہو۔

میں ایک عرصے سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں۔ اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں۔ دیوان تقریباً" سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابل داد ہے۔ فارسی کلام میں آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے، تو یہ بات بدرجہ آپ کے کلام میں موجود ہے۔ (۱)

یہ تبصرہ علامہ وحشت کے مجموعہ کلام 'دیوان وحشت'، مطبوعہ ۱۹۱۰ کے سلسلہ میں ایک شاندار خراج عقیدت ہے۔

کلکتہ سے وہ واپس لاہور لوٹ آئے۔ اس زمانے میں علامہ اقبال بستر علالت پر تھے اور ان کی صحت روز بروز گرتی چلی جارہی تھی اور ان کے دوست سر راس مسعود (سر سید احمد خان کے پوتے) علامہ اقبال کے لئے بھوپال کی ریاست سے کسی معقول وظیفے کے لئے تگ ودو میں لگے تھے تاکہ شاعر مشرق کے گھریلو اخراجات کو پورا کرنے کے لئے انہیں ایک معقول رقم ماہوار ملتی رہے۔

آفتاب اقبال ان دنوں کسی ماہوار یافت سے بہرور نہ تھے۔ ان کے سامنے ان کے والد ایک معذوری کی زندگی گزار رہے تھے اور وہ اشد خواہش کے باوجود بھی کسی طور والد کی کفالت کے اہل نہ تھے۔

آخر پریشانی کے عالم میں اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے اور جب ۲۱ اپریل کو صبح کی اذان کے ساتھ علامہ اقبال نے داعی اجل کو لبیک کہا تھوڑی دیر بعد آفتاب اقبال اور ان کی والدہ (کریم بی بی بنت حاجی خان بہادر عطا محمد) جاوید منزل میں داخل ہوئے

۔ڈاکٹر جاوید اقبال اور منیرہ بانو کی گورنس مس ڈورس نے ان کی آمد کا تذکرہ اپنی کتاب Iqbal as I Know him میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ سب سے پہلے آفتاب اقبال اور والدہ آفتاب اقبال کوٹھی پر پہنچے۔ دوسرے عزیز بعد میں آئے۔ مس ڈورس کی کتاب ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ شیخ اعجاز احمد کی کتاب 'مظلوم اقبال' کی اشاعت کا بھی یہی زمانہ ہے۔

والد کے انتقال کے بعد تقریباً" دنیاوی سہاروں میں سب سہارے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے اور خالق کائنات نے اپنے کلام پاک میں بڑے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

ان مع العسر یسراً

عسرت (تنگی) اور کشادگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی انسان کو علم نہیں کہ اسے کتنے عرصے تک تنگی کے گرداب میں پھنس کر کشادگی کے در کی انتظار میں زمانے کی تیز و تند لہروں کی زد میں رہنا ہوگا۔

والد محترم کی جدائی کے بعد ناراض تایا جان ایک ہمدرد اور بہی خواہ انسان کا روپ دھار کر سامنے آئے اور انہوں نے اپنے بھتیجے سے خط و کتابت کا ڈول ڈالا اور انہیں تسلی اور دلاسے کے خط روانہ کرنے لگے اور آفتاب اقبال صاحب کی ملازمت کے لئے اسلامیہ کالج لاہور کے ارباب بست و کشاد سے رابطہ کر کے نوکری کے بندوبست میں لگ گئے۔ آخر اس بھاگ دوڑ میں آفتاب اقبال صاحب کو اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے پروفیسر کی جگہ مل گئی۔

اسلامیہ کالج میں مشہور ریاضی داں اور شاعر خواجہ دل محمد (۲) پرنسپل تھے۔
انہوں نے آفتاب اقبال کو طلبا سے متعارف کرواتے ہوئے ارشاد فرمایا: جناب آفتاب اقبال ایم۔ اے لندن بہار ایٹ لاء، نامور باپ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نامور بیٹے ہیں۔ وہ ایک پرجوش اسکالر اور فصیح مصنف ہیں۔ ہم انہیں اپنے درمیان خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ان اعلیٰ توقعات پر پورا اتریں گے جو ہم نے ان کی ذات سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ میرے عزیز طلبہ، آپ کو ان کے علم و فضل سے استفادہ کرنے کے متعدد مواقع میسر آئیں گے۔ (مجلہ کریسنٹ نو دسمبر ۱۹۳۹ء (۲۶)۔

ان دنوں مولانا مودودی روزگار کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے اور بادل نخواستہ اسلامیہ کالج میں دینیات کے لیکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔
آفتاب اقبال کو اسلامیہ کالج میں خدمات انجام دیتے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ کالج کا عملہ آپ کی قابلیت کی وجہ سے آپ کے خلاف ہو گیا۔

آفتاب اقبال صاحب کے پاس ایم۔ اے فلسفہ کی ڈگری تھی اور وہ کالج میں انگریزی زبان پڑھانے پر مامور تھے اور انگریزی شعبے کے صدر شعبہ تھے۔ ان کے حاسد پروفیسر صاحبان نے رٹ لگائی کہ قواعد کی رو سے ایک فلسفہ کا پروفیسر انگریزی زبان پڑھانے کا مجاز نہیں۔ آفتاب اقبال صاحب ان حاسدوں کی اس موشگافی کی تہہ میں پہنچ گئے اور انہوں نے کمال ذہانت سے اس کا توڑ سوچ لیا۔ وہ فطری طور پر الجھنے سے گریزاں تھے اور ان کی نظر میں یہ بات احسن تھی کہ وہ چپ چاپ اس ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

لہذا انہوں نے اس ملازمت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا اور یوں اسلامیہ کالج لاہور کی ملازمت ۱۹۴۱ء میں اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس نوکری کے خاتمے میں جو خفیہ ہاتھ سرگرم عمل تھے۔ ان کی نشاندہی مناسب نہیں۔ ویسے اصل حقائق تک میری رسائی ہو چکی ہے لیکن اب گڑھے مردے اکھاڑنے سے کیا حاصل۔ بعض محققین آفتاب اقبال اور مولانا مودودی کے درمیان تعلقات کے بارے میں استفسار کرتے ہیں ۔دراصل کسی ادارے میں کام کرنے والے ارکان آپس میں نظری طور پر یکساں نہیں ہوتے۔ اختلاف رائے ایک فطری بات ہے اور اس لئے آفتاب اقبال صاحب اور مولانا مودودی کے درمیان کسی تعلق کو واضح کرنے کی سعی عبث اور بے کار ہے۔ میں نے اپنے طور پر مولانا مودودی مرحوم کے اسلامیہ کالج لاہور سے علیحدگی کے زمانے کے بارے میں معلوم کیا لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا ویسے آفتاب اقبال صاحب فرماتے تھے کہ مولانا مرحوم کو مبلغ ۳۰۰ روپے ماہوار مشاہرہ ملتا تھا۔

مولانا مودودی مرحوم ایک بہتر اور روشن مستقبل کی خاطر سرزمین دکن سے پٹھانکوٹ (۳) کے لئے ۱۹۳۸ء میں روانہ ہوئے تھے لیکن قدرت نے ان کے بہی خواہ علامہ اقبال کو اچانک اپنے حضور بلا لیا اور مولانا مرحوم کا مشن تشنہ تکمیل رہ گیا ۔لہذا مجبوری کے ہاتھوں مولانا کو اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایک لیکچرار کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ حالانکہ مولانا صحافت کی دنیا کے بندے تھے اور ان کی صحافت مذہبی رنگ کی عکاس تھی۔ مولانا کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اعلیٰ لوگوں کی ٹیم میسر آئی اور انہوں نے اپنی جماعت کے لئے بہت کام کیا۔

آفتاب اقبال صاحب نے ایک ماہر قانون داں اور ایک تجربہ کار پروفیسر ہونے کے باوجود اپنی نان جویں کی خاطر اسلامیہ کالج کا رخ کیا۔ دونوں شخصیات کی زندگی

میں یہ دور ایک بحرانی دور تھا اور حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں قوت لایموت کے لئے کسی ادنیٰ عہدے کو بھی قبول کرنے سے انکاری نہ تھے۔

۱۹۴۲ : یہ سال آفتاب اقبال صاحب نے دہلی میں قسمت آزمائی کے لئے گزارہ۔ دہلی میں ان کے ایک سکھ دوست تھے اور وہ انہیں کے ہاں مقیم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید انہیں دہلی میں کوئی بہتر اور مناسب ملازمت مل جائے۔ اس زمانے میں انہوں نے مشہور لوگوں کی وساطت سے ملازمت کے حصول کے لئے اپنی کوشش جاری رکھی لیکن اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ ان درخواستوں کی نقول میرے پاس محفوظ ہیں لیکن کتاب کی ضخامت کو کم کرنے کی خاطر کتاب میں ان کو چھاپنا اچھا نہیں۔

۱۹۴۳ : یہ سال آفتاب اقبال صاحب کی زندگی کی کایا پلٹنے کا سال ہے۔ اس سال وہ اپنے دوست بیرسٹر تصدق حسین خالد کے ساتھ ان کے کرائے کے بنگلے کے ایک حصے میں مقیم تھے کہ کسی طرح سے ان کی شادی کی بات طے ہوئی اور اپنی عائلی زندگی سے عہدہ برا ہونے کے لئے انہوں نے اپنی نوبیاہتا بیوی کے ہمراہ کلکتہ کی راہ لی۔

کلکتہ میں وہ تین سال کا عرصہ گزار چکے تھے اور اب ان کے محسن بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے اور انہیں توقع تھی کہ اب ان کی وساطت سے بہتر ملازمت کا بندوبست ہو جائے گا۔ ان کا اندازہ ٹھیک تھا اور اس مرتبہ مولوی فضل الحق صاحب کی وساطت سے انہیں محکمہ خوراک میں ایک ڈائریکٹر کا عہدہ ملا اور ان کا ماہانہ مشاہرہ ایک ہزار روپے تھا۔ کساد بازاری کے اس دور میں ایک ہزار کی رقم ایک خطیر رقم تھی۔

ان کی یہ ملازمت ۱۹۴۵ء میں اپنے اختتام کو پہنچی۔ یہ ایک عارضی عہدہ تھا اور دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی اس ملازمت کا انقطاع وابستہ تھا۔ جوں

ہی جنگ نے اپناد امن سمیٹا آفتاب اقبال صاحب کی یہ عارضی ملازمت ختم ہو گئی۔

۱۹۴۵ء: ۱۹۴۵ء میں کلکتہ سے واپسی کے بعد آفتاب اقبال کے ذہن میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ملازمت کے لئے ہاتھ پیر مارنے سے بہتر ہے کہ وہ اپنی نجی پریکٹس کا آغاز کریں اور اللہ کے بھروسے پر یقین رکھتے ہوئے اس پیشے سے منسلک رہیں اور اس میں کچھ نہ کچھ آتا ہی رہے گا اور اگر نجی پریکٹس چمک اٹھی تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔

اس ارادے کے ساتھ آفتاب اقبال صاحب نے باغبانپورہ میں ایک کوٹھی 'لالہ زار، میں اپنی نجی پریکٹس کا آغاز کیا۔ اس پریکٹس کے آغاز میں ان کی والدہ صاحبہ ان کے ہمراہ رہ رہی تھیں اور اپنے بیٹے کے کام کی کامیابی کے لئے دن رات دعاؤں میں مشغول رہتی تھیں۔ تھوڑا وقت ہی گزارا تھا کہ انہیں احساس ہوا کہ پریکٹس میں انہیں حسب منشا آمدنی نہیں ہو رہی اور پھر نجی پریکٹس کے لئے کسی پرانے وکیل کا سرٹیفکیٹ داخل کروانا ہوتا ہے تاکہ رجسٹریشن ہو سکے۔ اس سلسلے میں آفتاب اقبال نے بیرسٹر مرزا جلال الدین کا سرٹیفکیٹ داخل کروایا تھا اور مرزا صاحب سے علامہ کے گہرے مراسم تھے اور آخری ایام میں بول چال بند تھی۔

۱۹۴۷ء: ۱۹۴۷ء میں انہوں نے ساہیوال میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ یہ چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا اور زیادہ تر سکھ آبادی تھی۔ تھوڑے وقت میں ان کی پریکٹس چمک اٹھی اور ان کا کاروبار چل نکلا۔ لیکن پاکستان کی تشکیل کی آواز کان میں پڑی تو اتفاقاً" اپنے بھائی مرزا افضل بیگ مرحوم کی دعوت پر کراچی آئے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد وہ دہلی سے سیدھے کراچی آئے اور جیکب لائنز (۶) میں ان کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔

۱۹۴۷ء: ۱۹۴۷ء کے وسط میں کراچی آئے تو آفتاب اقبال صاحب کا کاروبار چل نکلا اور بہت جلد دولت نے ان کے در پر دستک دی اور سب معاشی دلدر دور ہو گئے اور دن دونی رات چوگنی ترقی والا محاورہ سمجھ میں آ گیا۔

اللہ نے کاروبار کو اتنا چمکایا کہ ۱۹۴۷ء میں ہی اپنی ذاتی گاڑی خرید لی اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارنے لگے۔

ہندو اپنی جائیدادیں فروخت کر کے ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ کاروباری لوگ اپنے ٹریڈ مارک کی وجہ سے آفتاب اقبال کے پاس آنے لگے اور یوں کام نپٹانے کے لئے رات گئے تک مجھے بھی کلرک کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ کام کا احاطہ کار کراچی سے لندن اور سوئزرلینڈ تک وسیع ہوا اور پھر اپنی ماں کی دعاؤں کے طفیل آفتاب اقبال ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور دولت کی ناراض دیوی ان کے گھر کا بے تحاشا رخ کرنے لگی۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء تک آفتاب اقبال صاحب اپنی کاروباری سرگرمیوں میں اتنے مگن ہوئے کہ انہیں کسی سے اپنی حاجت روائی کے لئے ایک کلمہ نہ کہنا پڑا۔ ان کے حالات کے سلسلے میں ان کی معاشی بدحالی کا قبل تقسیم کا نقشہ چند خطوط کی صورت میں سرکاری کاغذات میں محفوظ رکھنے والوں سے استدعا ہے کہ وہ آفتاب اقبال صاحب کی ۱۹۴۷ء کے بعد کی معاشی حالت پر ایک نظر ڈالیں۔ ان کے علم میں بس کتابی باتیں ہیں اور نزاعی مسائل ہیں۔

علامہ اقبال سے ایک فطری اختلاف ہے جسے امتداد زمانہ کے ساتھ نئے محققین نے نئے نئے رنگوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے پیش نظر گھسی پٹی باتیں ہیں اور ان کے حوالوں کی روشنی میں وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات ان کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ ایسے لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے ۱۹۵۱ء کے ٹریڈ مارک جرنل کمپنیوں کے اندراج کی ایک فہرست دے رہی ہوں جن کا

حالات ان کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

میں اس مقام پر آفتاب اقبال صاحب کی کاروباری فرموں کے نام ٹریڈ مارک جرنل کے ۱۹۵۱ء کے شمارے سے دینے سے گریز کر رہی ہوں۔ کیونکہ اب ہمیں نمود و نمائش کی چنداں ضرورت نہیں۔

۱۹۷۹ء میں آفتاب اقبال صاحب کی وفات کے بعد اپنی ذاتی جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے کو رفاہی اور فلاحی کاموں میں مصروف رکھتی ہوں۔ آفتاب اقبال صاحب کی حیات مستعار میں مولانا حامد جلالی صاحب نے ایک کتاب علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی ترتیب دی۔ رواروی میں اس میں کچھ غلط باتیں بھی راہ پا گئیں۔

لیکن اس کی اشاعت سے آفتاب اقبال صاحب کی زندگی کے بہت سے گوشے لوگوں کی نظروں کے سامنے آئے اور آہستہ آہستہ آفتاب اقبال صاحب اور ان کی اولاد (آزاد اقبال' وقار اقبال' نوید اقبال) لوگوں سے متعارف ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں پہلی بار ہندوستان کے ایک موقر جریدے میں آفتاب اقبال صاحب کا ایک تحریری انٹرویو شائع ہوا۔ بمبئی کے موقر جریدے "شاعر" نے ایک ضخیم "اقبال نمبر" ترتیب دیا اور اس میں بہت سی مفید معلومات کے ساتھ ساتھ غلط معلومات کا اندراج ہوا۔

میں ایک عورت ہوں عورت کو صنف نازک کہا جاتا ہے میں چاہ رہی تھی کہ شریک حیات کے بارے میں جو افواہیں پھیلائی گئی ہیں ان کے توڑ کے لئے ایک کتاب ترتیب دوں کبھی سوچا نہ تھا کہ اپنے خاندان اور میاں کی مدافعت کے لئے مجھے قلم سنبھالنا پڑے گا۔ کچھ عرصہ پہلے پروفیسر ایوب صابر صاحب نے "اقبال دشمنی ایک سرسری مطالعہ" میں بہت سی باتیں غلط لکھ دیں جن پر کھل کر اظہار خیال کیا۔

باب پنجم

شاہراہ حیات پر مستقل ڈیرہ

آفتاب اقبال صاحب کا کاروبار

آفتاب اقبال صاحب نے ۱۹۴۵ء میں لاہور ہائی کورٹ میں وکالت کا آغاز کیا اور ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں بھی انھوں نے ملازمت کے خاتمے کے بعد قانونی پریکٹس کا ارادہ کیا لیکن نجانے کس وجہ سے وہ آغاز نہ کر سکے۔ ۱۹۴۷ء میں ساہیوال میں سیشن کورٹ میں وکالت کا آغاز کیا لیکن چند ماہ کے بعد وہ کراچی چلے آئے اور ۱۹۴۷ء میں کراچی ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ انھوں نے مصنوعات کی رجسٹریشن میں اسپیشل کورس کیا اور پھر اس شعبے میں وکالت شروع کی اور ان کا کاروبار کافی چمکا اور میں نے صرف ۱۹۵۱ء کے جرنل میں سے تیس کمپنیوں کے نام دیکھے ہیں۔ جن کے مقدمات کی پیروی پر وہ متعین تھے اور یہ کمپنیاں سوائے ایک کے برطانوی تھیں۔

میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ ابھی تک جاپان کے کچھ جزائر میں جنگ عظیم دوم کے فوجی جنگ کے خاتمے سے بے خبر ہیں اور خود کو جنگی حالت میں محسوس کرتے ہیں یہی حالت آفتاب اقبال صاحب کے بعض نقاد حضرات کی ہے کہ وہ بڑے تزک واحتشام کے ساتھ باپ بیٹے کے خطوط ،نواسے اور نانا کے خطوط اور دوسرے حیدر آباد میں ۱۹۳۷ء تک کے خطوط کو بڑی معتبر دستاویزات قرار دے کر آفتاب اقبال کو ایک قلاش اور مفلس انسان ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

حالانکہ اس کتاب کے ایک باب مشاہیر کے خطوط میں سید نذیر نیازی نے ان کی فارغ البالی کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور علامہ اقبال اور ان کے بیٹے کے مابین

مفائرت پر قلم چلانے والے ادیبوں کو ڈانٹا ہے کہ وہ علامہ اقبال کی نجی زندگی پر خواہ مخواہ کیوں قلم اٹھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے مزاج میں سختی اور نرمی موجود تھی اور اگر وہ اپنے نوجوان بچے سے بگڑے تو اس میں دوسروں کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ وہی آفتاب اقبال اپنے والد ماجد کے کلام کی انگریزی میں تشریح بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ اپنے بیٹوں کے نام کے آخر میں اقبال کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں اور ۱۹۲۲ء میں اپنے نام آفتاب احمد سے احمد کو خارج کر کے 'اقبال' کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی پیروی ان کی اولاد بھی کرتی ہے۔ ان کے بچوں کے ناموں میں اقبال کا لاحقہ موجود ہے۔

خدارا اپنی ذہنیت میں کچھ تبدیلی پیدا کیجئے۔ غلط باتوں کی ٹوہ میں رہنے کی بجائے کسی تعمیری کام میں جٹ جائیے۔

جس آفتاب اقبال میں آپ کیڑے نکالنے کے ماہر ہیں وہ آج سے انیس برس پہلے بڑی خوشحال زندگی بسر کر کے رخصت ہو گئے۔

رجال اقبال میں عبدالرؤف عروج مرحوم نے آفتاب اقبال کے بارے میں اچھی معلومات فراہم کیں لیکن وہ چوک گئے کہ وہ لندن میں قیام پذیر تھے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

اور بھی لوگوں نے بڑی پیاری اردو میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن وہ بھٹک جاتے ہیں اور غلط معلومات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کی خاطر آفتاب اقبال ایک عظیم مسافر لکھ کر آفتاب اقبال کی نقل و حرکت پر نگاہ ڈالی ہے اور اس طرح ان کی زندگی کے لمحات فوراً" قاری کے ذہن میں اتر جاتے ہیں اور اسے کوئی وحشت نہیں ہوتی ہے۔

آفتاب اقبال کے اہل و عیال

رشیدہ بیگم صاحبہ

بقلم ماسٹر اکرام

رشیدہ بیگم صاحبہ علامہ اقبال کے فرزند اکبر آفتاب اقبال کی بیگم اور علامہ اقبال کی بہو ہیں۔ خاندان مغلیہ کے ایک عظیم آدمی مرزا دولت بیگ کی اولاد میں ہیں جو عہد شاہ جہاں میں سپہ سالار کے عہدہ پر مامور تھے۔ نسبتی یگانگت کے علاوہ شاہ جہاں سے قرابت کی عزت بھی انہیں حاصل تھی۔ مشہور تاریخی شہر شاہ جہاں پور انہی کا بسایا ہوا ہے۔ اپنے آقا کے نام پر شاہ جہاں پور اس کا نام بانی شہر کا رکھا ہوا ہے۔

رشیدہ بیگم کے باپ دادا مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے رہنے والے تھے۔ ٹھیکیداری پیشہ تھا۔ رشیدہ بیگم کے والد بزرگوار مرزا روشن بیگ اپنے والد کے انتقال کے بعد برما میں ٹھیکیداری کے دھندہ میں منہمک ہو گئے۔

بیگم صاحبہ ۱۰ اگست ۱۹۲۱ء کو برما کے ایک شہر مگوئی میں پیدا ہوئیں۔ بیگم صاحبہ کے بڑے بھائی مرزا افضل بیگ اور چھوٹے بھائی مرزا اسلم بیگ کے سوا باقی بہن بھائی برما کے شہر مگوئی میں ہی پیدا ہوئے۔ ذرا بڑی ہوئیں تو ابتدائی تعلیم کے حصول کے لئے انگلش میڈیم اسکول میں جانے لگیں۔ ابھی ابتدائی تعلیم کے مراحل سے گزر رہی تھیں کہ ان کے والد کے ایک گہرے دوست ڈاکٹر سی مارٹن کو حبشہ کے بادشاہ ہیل سلاسی نے حبشہ کے دارالحکومت عدلیس بابا میں طلب کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی حبشہ کے بادشاہ سے قرابت داری تھی اور بادشاہ انہیں دراصل ملک کے وزیر اعظم کا منصب عطا کرنے کے لئے طلب کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سی۔ مارٹن سے مرزا روشن بیگ کے گہرے مراسم تھے اور انہی مراسم کی وجہ سے ڈاکٹر مارٹن مصر ہوئے کہ مرزا روشن بیگ

صاحب ان کے ہمراہ حبشہ چلیں۔

مرزا روشن بیگ اپنے اہل و عیال کو جالندھر بھجوا کر خود حبشہ چلے گئے۔ حبشہ میں ان کی بہت پذیرائی ہوئی اور جنگلات کے ٹھیکے انہیں دیئے گئے اور انہوں نے نیک نیتی اور ایمانداری سے حبشہ کی خدمات انجام دیں اور انہیں کافی مال و دولت ہاتھ لگی۔ لیکن مقدر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ چند ہی سال کے بعد اٹلی نے حبشہ پر یورش کر دی اور ملک حبشہ کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ بادشاہ اور وزیر اعظم ڈاکٹر سی مارٹن بذریعہ طیارہ لندن چل دیئے۔ غیر ملکیوں پر ایک ناگہانی مصیبت ٹوٹی اور وہ اپنی جان کے تحفظ کے ہر ممکن اقدام اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ جائیداد کے علاوہ کافی زر مبادلہ سے انہیں ہاتھ دھونے پڑے۔ علامہ اقبال نے ضرب کلیم میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔

بیگم صاحبہ کے گھر والے مرزا روشن بیگ کی زندگی کے لئے دست بدعا تھے اور تقریباً" حملے کی شدت سے حواس باختہ تھے کہ ایسے کٹھن حالات میں زندگی بچانا تقریباً" ناممکن تھا۔ ان دنوں جالندھر میں حضرت اللہ بچایا تشریف لائے ہوئے تھے لہذا ان سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے اپنی روحانی قوت سے یہ مژدہ سنایا کہ مرزا روشن بیگ زندہ ہیں اور چند دن تک بحفاظت اپنے وطن لوٹ آئیں گے اور اس وقت نہایت قلیل رقم ان کے پاس تھی۔ مالی خوشحالی کا دور اب معاشی بدحالی کی خزاں سے دوچار تھا ۔۱۹۳۸ء میں تقریباً" جالندھر کی بود و باش کو چھوڑ کر یہ گھرانہ لاہور میں آباد ہو گیا ۔لاہور میں بیگم صاحبہ کے بڑے بھائی مرزا افضل بیگ مولانا عبدالمجید سالک کے روزنامے انقلاب سے بطور مدیر معاون وابستہ ہوئے۔ جالندھر میں صرف بارہویں جماعت تک تعلیمی سہولتیں میسر تھیں۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے لوگ لاہور ہی کا رخ کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے خاندان کے کافی افراد لاہور منتقل ہو چکے تھے۔

آزاد اقبال صاحب

رشیدہ بیگم

وقار اقبال صاحب

ڈاکٹر نوید اقبال صاحب
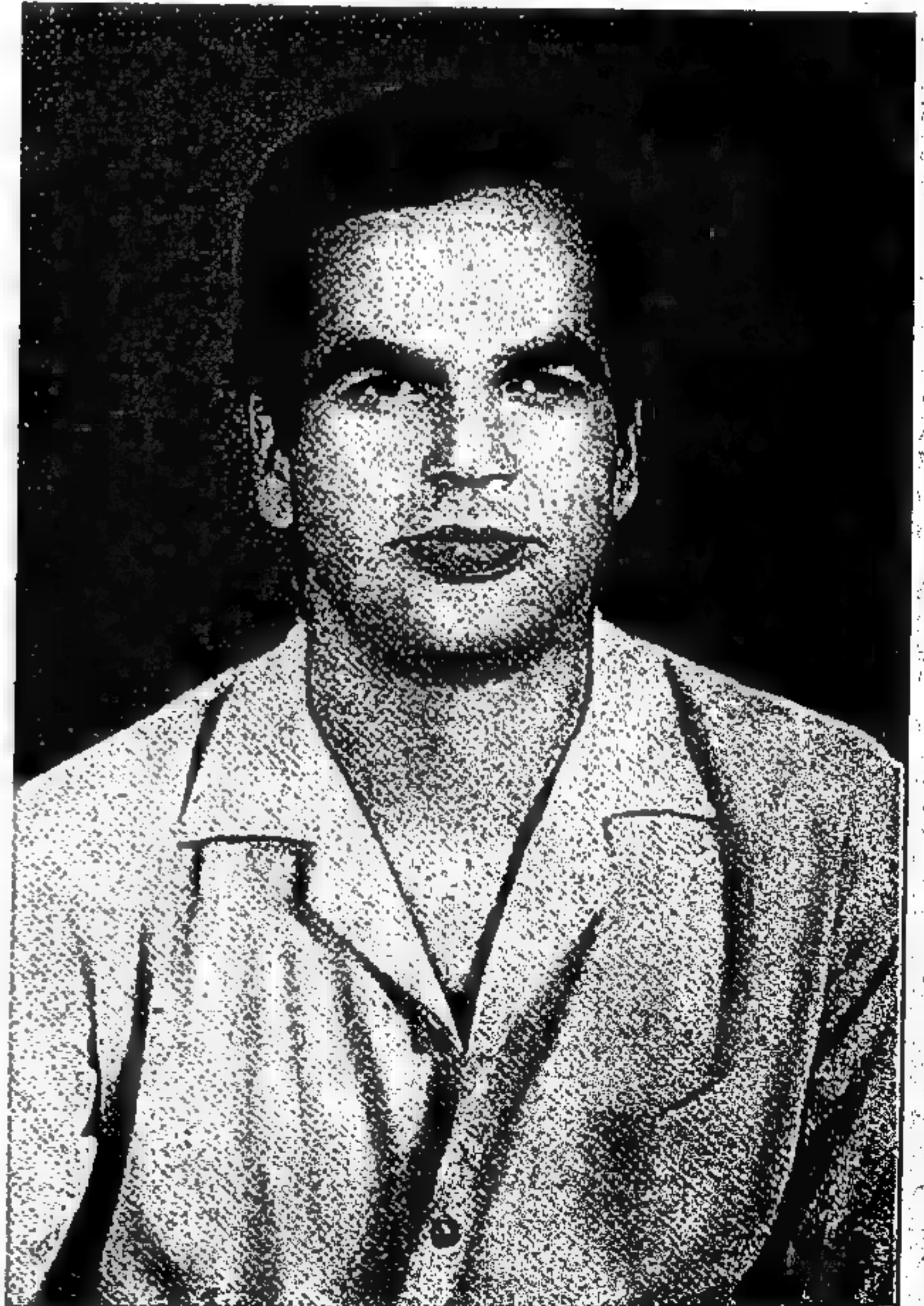
اب شادی کا قصہ بیگم آفتاب اقبال کی زبانی سنئے

میری شادی

آفتاب اقبال صاحب سے میری شادی ، اپنی سادگی اور فضول رسوم سے اجتناب کی وجہ سے سنت نبوی پر کلی نہیں تو جزوی تقلید کا ایک نمونہ ہے۔ مہندی کی رسم ، نہ ڈھولک نہ ناچ گانا ، نہ لمبی چوڑی برات ، نہ جہیز ، نہ بری ، نہ ولیمہ ، نہ دیگوں کا جھنجال ، نہ باجوں وشہنائیوں کی نغمہ سرائی ، نہ طوائفوں کے ناچ کا تکلف۔ میرے رگ وپے میں مدرستہ البنات کی دینی تعلیمات کی بالادستی نے اپنا مستقل ڈیرہ جما دیا تھا۔ میرے علم وعرفان میں یہ بات بسی ہوئی تھی کہ تمام انسان خدا کی نگاہ میں ایک ہیں۔ ایک ہی جوڑے آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ خدا اور رسول نے ذات پات اور فرقہ بندی کا سبق نہیں سکھایا۔ فضول رسم ورواج کا اجرا ، ذاتوں اور فرقوں میں تقسیم ، ہماری خود ساختہ چیزیں ہیں۔ ہمارے پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں انسانیت کو راہ راست پر گامزن رکھنے کے لئے وہ مثالی باتیں فرمائیں جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان غلط راہوں پر نہ بھٹک سکتے تھے اور دنیا کے گم راہوں کو راہ مستقیم پر لا سکتے تھے۔ اپنے آقا کی باتوں سے روگردانی کی وجہ سے ہم ذلت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی ذلت اور خواری میں بسر ہونے والی زندگی پر ہر ذی ہوش اور ذی فہم مسلمان نے نوحہ خوانی کی لیکن علامہ اقبال نے ایک منفرد انداز میں بڑے ہی دلنشین لب ولہجے میں اس گمراہ قوم کو عظمت رفتہ سے روشناس کرانے کے لئے ایک ایسا نسخہ کیمیا پیش کیا جس میں قرآن اور حدیث کی تعلیمات کا نچوڑ موجود تھا۔

علامہ کی بصیرت کو عام کرنے کا وظیفہ اس قوم کو انحطاط اور زوال کی پستیوں سے
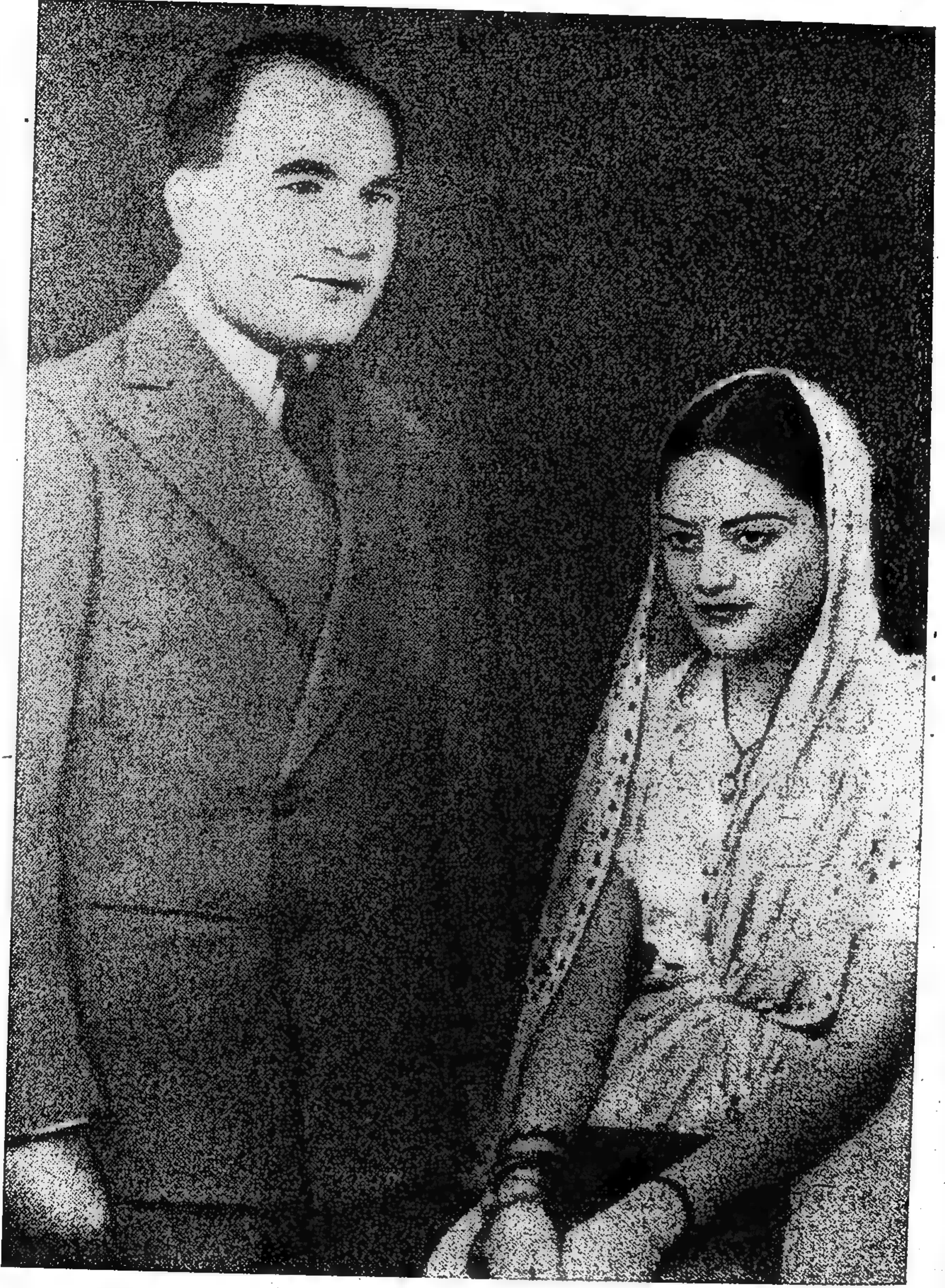
شادی کے موقع پر لی ہوئی تصویر (۱۹۴۳ء)

نکال سکتا ہے۔ معاشرتی برائیوں سے کنارہ کشی ،وقت کی آواز ہے۔ جواب شکوہ میں فرماتے ہیں:

منفعت ایک ہے اس قوم کا نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں ذات پات کے بتوں کو پاش پاش کر کے رہوں گی۔ مخالفت کو خاطر میں نہیں لاؤں گی۔

میں اپنے گردوپیش دیکھتی تھی کہ بہت سی بچیاں اپنے خاندان میں رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے جوانی کی منزل کو بھی عبور کر چکی ہیں اور محض مغل لڑکا ہی شریک حیات بن سکتا ہے۔ دوسری ذات کے لڑکے کا وجود ایک طعن و تشنیع ہے۔ اس بے جا اصول اور رسم کو توڑنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔

میں نے اس رسم کو توڑنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ مغل خاندان میں اس رسم کو توڑنے کا کام اللہ نے میرے سے لیا۔

میں جب بلوغت کو پہنچی اور میرا اٹھارہ بیس سال کا سن ہوا اور میرے رشتہ کے لئے پیغام آنے لگے تو میں نے ہمت اور بے باکی سے کام لیتے ہوئے اعلان کیا کہ میں مغل قوم میں شادی نہیں کروں گی بلکہ غیر مغل قوم میں کروں گی۔ دقیانوسی رواج کا خاتمہ کروں گی اور اپنی قوم کی دوسری لڑکیوں کے لئے راہ ہموار کردوں گی۔ میرے

ارادے کو بھانپ کر خاندان میں ہلچل مچ گئی۔ بعض نے سمجھا کہ شاید ایسا فیصلہ میرے خلل دماغ کا نتیجہ ہے۔ میرے عزیز و اقارب مجھے برا بھلا کہنے لگے۔ مجھے بے حیا اور گستاخ تک کہا گیا۔ میرے بڑے چچا مرزا احمد بیگ (محمود نظامی مرحوم کے والد) میرے پاس آئے۔ مجھے بڑے پیار سے سمجھایا کہ خاندان کی عزت بچاؤ۔ خدارا اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔ میرے لڑکے محمود نظامی میں کیا کمی ہے۔ اس کی تعلیم اور قابلیت کا تذکرہ فرمایا۔ میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے بڑی جرات سے انکار کر دیا اور کہا: میں مغل قوم کی یہ رسم توڑنا چاہتی ہوں جو خدا اور رسول کے فرمان کی صریح خلاف ورزی ہے۔ میں اس سلسلے میں سب مخالفتیں برداشت کروں گی۔ اس بات پر وہ سخت ناراض ہوئے۔ مجھے دھمکیاں دینے لگے کہ ایسی گستاخ لڑکی کو ہم زندہ دفن کر دیں گے۔ اپنی ذات اور عزت کو خاک میں ملنے نہ دیں گے۔

میرے والدین اور بھائی بہنوں نے خاموشی اختیار کی۔ میرے بڑے بھائی افضل بیگ مدرستہ البنات کی کمیٹی کے رکن تھے۔ حضرت مولانا عبدالحق عباس بانی مدرسہ کے دوست اور مددگار تھے۔ اسلام کی تعلیمات سے مکمل آگاہی رکھتے تھے اور دینی بصیرت سے کام لیتے تھے۔ بلوغت کے بعد بالغ لڑکی کے حقوق پر ان کی نگاہ تھی۔ وہ طبقہ اناث کو بے زبان جانوروں کے زمرے میں رکھنے کے قائل نہ تھے۔ اسلام نے بالغ لڑکی کو عائلی زندگی کے میدان میں قدم رکھنے کے لئے کچھ حقوق سے نوازا ہے اور حقوق کا استعمال شریعت میں احسن ہے اور اگر معاشرہ کج فہمی کی بنا پر ضد پر اتر آئے تو بالادستی ہر حال میں شریعت کی مانی جائے گی۔

بیگم سلمیٰ تصدیق حسین ایک سیاسی اور سماجی کارکن اور میری بڑی بہن وحیدہ روشن کی دوست تھیں اور عمر کے لحاظ سے سلمیٰ تصدق حسین بڑی تھیں۔ بیگم سلمیٰ کے میاں

ایڈووکیٹ تھے اور آفتاب اقبال کے دوست۔ بیگم سلمیٰ کے بنگلے کے ایک حصے میں آفتاب اقبال بھی کرایہ دار تھے۔ دوستی اور ہمسائیگی کے ناتے ایک دوسرے کی خیر خبر رکھتے تھے۔ ایک روز بیگم سلمیٰ نے میری بہن وحیدہ روشن سے آفتاب اقبال کا ذکر چھیڑا کہ اگر آپ کی بہن شادی پر آمادہ ہو جائے تو یہ رشتہ بڑا مناسب رہے گا۔ وحیدہ بہن نے سب سے پہلے رضامندی کی خاطر مجھ سے بات کی۔ اول تو میں شادی کے لئے تیار نہ تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کے لئے اپنی زندگی وقف کردوں میری پڑھائی کے سلسلے میں بھی خاندان کے افراد مخالف تھے لیکن میرے بھائیوں نے ساتھ دیا۔ اور ان کی وجہ سے میں ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کر چکی تھی۔

۱۹۴۳ء میں ان کی بہن وحیدہ نے بتایا کہ آفتاب اقبال صاحب خود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور تمہاری تعلیم میں رکاوٹ نہیں بنیں گے تو میں شادی پر راضی ہو گئی۔

ان کی عمر ۲۲ سال تھی اور آفتاب اقبال صاحب کی عمر ۴۵ سال تھی۔ عمر میں واقعی بڑا فرق تھا لیکن یہ تو ایک دقیانوسی رسم کو توڑنے کا پختہ ارادہ رکھتی تھیں۔ آفتاب اقبال صاحب کسی معمولی باپ کے بیٹے نہیں تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوبصورت جوان تھے۔ ان کی بہن وحیدہ نے والدین اور بھائیوں سے بات کی۔ پہلے تو بھائیوں نے بھی حیل حجت سے کام لیا۔ عمر کے فرق پر اعتراض وارد کیا۔ مزید ان کا استدلال تھا کہ لڑکے کے پاس رہنے کے لئے ذاتی مکان نہیں اور نہ کہیں مستقل نوکری کا بندوبست ہے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا: ان کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں۔ میرے ساتھ میری قسمت ہے۔ میں مغلیہ خاندان کی چشم و چراغ ہوں۔ شہزادیوں کی طرح والدین نے پالا پوسا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میری قسمت سے ان کی تقدیر بھی بدل دے گا

اور بہت رزق دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ مجھے اپنی قسمت پر ناز تھا۔ ویسے بھی بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا اور وہ ہمارے مرشد حضرت قاری اللہ بچایا نے تعبیر بتائی تھی کہ میرے پاس بہت دولت ہوگی اور دنیا کی سب نعمتیں مجھے میسر آئیں گی۔ اور کسی مشہور آدمی سے میری شادی قرار پائے گی۔ اس خواب کے بعد مجھے یقین تھا کہ آئندہ زندگی میں دولت ضرور ہاتھ آئے گی اور خوش و خرم زندگی بسر کرنے کی نوبت ضرور آئے گی۔ آفتاب اقبال ہمیشہ تنگدست نہیں رہیں گے۔

خیر ان کے بھائی اور والدین کو تھوڑی بہت حیل حجت کے بعد ان کی شادی پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ لیکن ان کے چچا احمد بیگ صاحب سدّ راہ بن گئے اور مخالفت پر اتر آئے ان کے چچا علامہ اقبال کے دوست بیرسٹر مرزا جلال الدین صاحب کے داماد تھے اور ان کے سسر صاحب کا علامہ اقبال کے ہاں آنا جانا تھا۔ خاندانی روابط کی وجہ سے بہت سی اندرون خانہ باتوں سے آگاہی رکھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ علامہ اقبال کے اپنے بیٹے سے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔ باپ بیٹے کے مابین بعض گھریلو وجوہات کی بنا پر تعلقات کا بگاڑ ہو سکتا ہے اور یہ ناراضگی اور خفگی عارضی ہوتی ہے۔ کسی خاص مرحلے پر آکر پھر فطری طور پر یہ رشتہ مستحکم ہو جاتا ہے تعلقات کی خرابی، ان کا خاندانی معاملہ ہے۔

کاش علامہ اقبال زندہ ہوتے اور یہ خود آفتاب اقبال کو ان کے پاس لے کر جاتیں اور اقبال ان سے مل کر خوش ہوتے۔

پھر ان کے چچا جان نے آفتاب اقبال صاحب کی عمر کی بات اٹھائی۔ وہ عمر میں ۲۳ سال بڑا ہے۔ یہ کوئی مناسب جوڑ کی بات نہیں ہے۔ پھر انہوں نے آقا نامدار کا حوالہ دیا

جن کے صدقے دین ہم تک پہنچا ہے اور ان کے اسوہ حسنہ کی پیروی کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے۔ آقا نامدار ہمارے لئے سب راستے کھول گئے ہیں اور ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ آپ کی پہلی شادی ۱۵ سال بڑی عمر کی عورت حضرت خدیجہ سے ہوئی۔ دوسری شادی حضرت بی بی عائشہ سے ہوئی تھی اور حضرت کی عمر اور بی بی عائشہ کی عمروں میں بہت تفاوت تھا۔

الغرض میں ان کی حجت کا جواب اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں جواب دے رہی تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک جنگ ہو رہی تھی۔ عزیزوں کی اس حجت اور بحث کے دوران شادی کی تاریخ طے ہو گئی ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء ہمارے خاندان میں میری شادی موضوع بحث بن گئی اور مجھے عورتیں کوسنے لگیں کہ شاید ایک غیر مغل سے شادی کے فیصلے سے میں نے مغل قوم کو رسوا کیا ہے۔

شادی کا دن آیا تو میرے سب رشتہ داروں اور چچاؤں نے شادی میں شرکت سے انکار کر دیا۔ میری شادی بڑی سادگی سے ہوئی اور اس قسم کی سادگی کسی شادی بیاہ میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

میری شادی میں ، میرے والدین ، بہن بھائی ، میری دو سہیلیاں ایک شمیم جالندھری (بہت بڑی ادیبہ اور کئی کتابوں کی مصنفہ) دوسری ان کی بہن منصوریہ۔ وہ مدرستہ البنات میں میری ہم جماعت تھی۔ آج کل مسز منصور افضل ہیں۔ افضل صاحب ضیاء الحق دور میں وزیر تعلیم رہ چکے ہیں اور آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

تیسری سہیلی عظمت فضل الحق تھیں۔ گورنمنٹ کالج جالندھر میں میری ہم کالج تھیں۔ ان کے میاں بھی محکمہ خوراک میں اعلیٰ افسر تھے۔ دونوں میاں بیوی اس

دنیا میں نہیں ہیں۔

مولانا عبدالحق عباس (بانی مدرستہ البنات) ان کے ساتھ ان کے ساتھی ذاکر حسین صاحب تھے۔ مولانا عبدالحق عباس صاحب جنہیں ہم آقاجی بھی کہا کرتے تھے ۔انہوں نے نکاح پڑھا۔ برات میں دولہا اور صرف ایک دوست شاہ محمد جو جالندھر میں مقیم تھے۔ نکاح کے بعد کھانا گھر میں ہی کھلایا گیا۔ شامیانے لگے نہ دیگیں چڑھیں۔ شادی کے بعد میں آفتاب اقبال صاحب کے ساتھ لاہور آگئی۔ وہ مجھے اپنی خالہ حمیدہ کے گھر لائے۔ وہاں گجرات سے ان کی خالائیں ،ان کے بچے اور آفتاب اقبال صاحب کی والدہ آئی ہوئی تھیں۔ کوئی دھوم دھام کا ولیمہ نہیں ہوا۔ صرف گھر میں عمدہ کھانا تیار ہوا اور اپنے خاندانی رشتہ دار شامل تھے۔

آفتاب اقبال کا وعدہ

آفتاب اقبال صاحب نے شادی کے وقت وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔ انہیں اپنے وعدے کا پاس تھا لیکن وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں نکلیں اور میں کالج کا رخ کروں یہ بھی گرہستی کی زندگی میں ایک بدنما دھبہ تھا بہر کیف مجھے نئے سرے سے ایف۔ اے میں داخلہ لینا پڑا۔ میں نے مولوی فضل الحق کے قائم کردہ لیڈی بریبن کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں دو تین لڑکیاں ہم کالج تھیں۔ ایف اے کے بعد بی۔ اے پرائیویٹ کے لئے تیاری شروع کردی کیونکہ اس زمانے میں کلکتہ ایسے بڑے شہر میں بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ اغوا اور لوٹ مار کی وارداتوں میں سرگرم عمل تھے اور آفتاب صاحب ان گروہوں کی وارداتوں سے پوری طرح باخبر تھے اور انہوں نے مشورہ دیا کہ کالج سے بی۔اے کرنے کی بجائے گھر پر

تیاری کر کے امتحان پاس کروں۔ میں بی۔اے کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھی کہ آفتاب صاحب کی ملازمت کا انقطاع رونما ہوا۔

اب بھی اس زمانے کی کالج کی ساتھی بہنوں سے خط و کتابت سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ بٹوارے کے بعد کراچی آ گئیں اور کچھ کلکتہ ہی میں مقیم ہیں اور اب فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت سے بھی سبکدوش ہو چکی ہیں اور بعض فارغ اوقات میں تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں۔ ان کی ایک ساتھی آپا فضیلت علامہ اقبال پر بنگلہ زبان میں ایک کتاب ترتیب دے رہی ہیں اور اس طرح سے کلام اقبال کی تفہیم کا سلسلہ بنگال کی سرزمین پر رواج پا جائے گا۔ اسلام آباد میں دعوت اکیڈمی میں ایک محقق کام کر رہے ہیں اور وہ اپنے خطوں میں انکشاف کرتے رہتے ہیں کہ کلام اقبال کی تفہیم کے لئے بنگلہ زبان میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور انہیں علامہ اقبال پر کام کرنے والوں سے آگاہ ہونا چاہئے کہ کن کن زبانوں میں لوگ کام کر رہے ہیں اور کس قدر کتب زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں اور اقبال اکیڈمی کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔ علامہ اقبال کی خوش قسمتی ہے کہ برصغیر ہندوپاک کے وہ پہلے شاعر اور مفکر ہیں جن کے کلام اور فکر کی پذیرائی اتنے وسیع پیمانے پر عمل میں آئی ہے۔ جس کی نظیر کوئی شاعر پیش نہیں کر سکتا۔

ایک خامی کا اظہار

وہ اپنی ایک خامی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ کہ گھر میں ریندھنے پکانے کے کام سے انہیں قطعاً" دلچسپی نہ تھی۔ والدہ صاحبہ کہتی رہتی تھیں کہ بیٹی ریندھنے پکانے میں مہارت عورت کے لئے بہت ضروری ہے۔ انہیں تو ہر وقت یہی شوق

دامن گیر تھا کہ مجھے ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہے۔ سوچا تھا کہ خود ڈاکٹر بن کر نوکری کریں گے اور کھانا نوکروں سے پکوالیا کریں گے۔

آفتاب صاحب کو کلکتہ میں بسنے کے بعد گھر کا کھانا نصیب نہ تھا۔ کیونکہ انہیں کھانے پکانے کا کوئی سلیقہ نہ تھا۔ ایک پنجابی پڑوسی کے گھر سے ان کا ناشتہ اور دو وقت کا کھانا آجاتا تھا۔ کبھی ہوٹل کا رخ کرتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کی بہن وحیدہ روشن کلکتہ انہیں ملنے آئیں۔ وہ گھر کا چلن دیکھ کر سیخ پا ہو گئیں۔ اور انہیں بڑی بری طرح ڈانٹنے لگیں کہ میاں کو شادی کے بعد اپنی بیوی کے ہاتھ کے کھانے کی خواہش ہوتی ہے اور کھانے کی لذت سے عورت اپنے میاں کا دل موہ لیتی ہے اور لوگ بھی اسے سگھڑ اور سلیقہ شعار خاتون سمجھتے ہیں۔ ورنہ عورت کا پھوہڑپن سب کی نفرت کا سبب بن جاتا ہے اور عائلی زندگی میں ایک بدمزگی کا عنصر شامل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور یوں تلخیوں کی چھاؤں میں زندگی گزارنے کا دور شروع ہو جاتا ہے اور اس قسم کی شروعات نیک شگون نہیں ہوتیں۔

ایک ناقابل فراموش داستان

اپنے والد مرزا روشن بیگ کے انتقال پر بیگم صاحبہ کلکتہ سے لاہور آئیں۔ لاہور میں ڈیوس روڈ پر ملٹری میں بھرتی ہونے والوں کے لئے دفتر تھا۔ اس دفتر میں ضروری اندراجات کے بعد انہیں بھرتی کر لیا گیا اور ٹریننگ کے لئے انبالہ روانہ کر دیا گیا۔ آفتاب صاحب کو ان کے کلکتہ آنے کی اطلاع دی گئی۔ کافی دنوں تک یہ کلکتہ نہ پہنچیں آفتاب صاحب نے ان کے والدین کو ان کے کلکتہ نہ پہنچنے کی اطلاع دی تو سب بھائی پریشان ہوئے۔ ان کی تلاش میں سب جٹ گئے۔ آخر ان کے بھائی اسلم بیگ کی ذہانت

۱۹۴۴ء میں فوج میں بھرتی ہونے کے موقع پر لی ہوئی تصویر

کی بدولت بہت جلد اس معمہ کو حل کر لیا گیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان کی بہن فوج میں بھرتی ہو کر اپنی قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتی تھی اور ہو سکتا ہے کہ وہ ملٹری میں بھرتی نہ ہو گئی ہو۔ وہ اس طرح انبالہ جا پہنچے اور ان کا سراغ لگا لیا اور جب اس مشن میں ان کی بہن وحیدہ روشن کی شرکت کا پتہ چلا تو سبھی بھائی بڑی بہن پر بگڑے ۔فوری طور پر آفتاب صاحب کو اصل صورتحال سے آگاہ کیا گیا اور وہ کلکتہ سے سیدھے انبالہ پہنچے اور انھوں نے متعلقہ ریکروٹنگ دفتر کو میاں کی مرضی کے بغیر فوج میں بھرتی کرنے کی غیر قانونی حرکت میں ملوث ہونے کی وجہ سے لتاڑنے کی ٹھانی - یہ فوجی لباس میں ملبوس انبالہ کے اسٹیشن پر موجود تھیں اور فوجی وردی کم عمری کی وجہ سے ان کے جسم پر خوب پچ رہی تھی۔ لیکن آفتاب صاحب کو ان کا ملٹری میں جانا ناپسند تھا۔ بہر کیف وہ انہیں واپس کلکتہ لے گئے اور جب ۱۹۴۵ء کے آخر میں یہ لاہور واپس پہنچیں تو انھیں ملٹری میں گزارے وقت کی تنخواہ ادا کی گئی۔

زندگی میں نجانے کیسے کیسے موڑ آتے ہیں اور پھر جوں جوں شعور میں پختگی آتی ہے تو بعض خواہشات کا خود بخود گلا گھٹتا چلا جاتا ہے۔ ہر لمحہ مر رہا ہے اور ہر روز نئے لمحوں کی موت کا سامان ہوتا ہے۔ پھر کراچی کے قیام کے دوران ایک اور واقعہ پیش آیا۔

ایک واقعہ

شروع شروع میں انہیں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اور آہستہ آہستہ عائلی زندگی کے جھمیلوں میں پڑ کر یہ شوق سرد پڑ گیا لیکن جب ۶۵ء کی جنگ میں ہمارا ملک جنگ کی لپیٹ میں آیا تو نرسوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک مختصر کورس شروع کیا گیا۔ یہ اس کورس میں شریک ہوئیں اور چند ہفتوں کی ٹریننگ کے بعد انہیں جناح ہسپتال کے

ڈائریکٹر جناب خواجہ کرنل عبدالرشید صاحب کے ہاتھ سے سند ملی تو خواجہ صاحب نے انہیں پہچان لیا اور فرمانے لگے : بھابھی آپ نے بھی یہ ٹریننگ مکمل کی ہے بہرکیف زندگی میں ڈاکٹر نہ بن سکیں لیکن عارضی سہی نرس کا کورس کرچکی ہیں اور اب بھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت اب آفتاب صاحب کی رحلت کے بعد ایک رفاہی ادارے کی صدر ہیں اور باقاعدگی سے اس کے کاموں میں شرکت کرتی ہیں۔ یعنی ادارہ "عقد بین المسلمین"۔

وحیدہ روشن ٹرسٹ

لاہور میں اپنی بہن وحیدہ روشن کے انتقال کے بعد ان کے گھر روشن ہاؤس کو ایک ٹرسٹ میں منتقل کروا کر اور وحیدہ روشن دارالقرآن ٹرسٹ کا نام دے کر اس کے جملہ اخراجات برداشت کرتی ہیں۔ ادارہ بخیر و خوبی چل رہا ہے اور ملک کی بہترین قاریہ ان کے ادارے سے وابستہ ہیں یعنی قاری غلام رسول صاحب کی بیٹی قاریہ نسرین صاحبہ۔ کراچی میں بھی ایک رفاہی ادارہ چلا رہی ہیں اور ہفتہ میں ایک بار ضرور ادارے تشریف لے جاتی ہیں۔ ادارے کا نام Begum Aftab Iqbal National Welfare Trust ہے اس طرح مختلف اداروں کی امداد فرماتی ہیں۔ بچپن ہی سے مذہبی اور رفاہی کام کرنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔

آزاد اقبال صاحب "دار القرآن" کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں
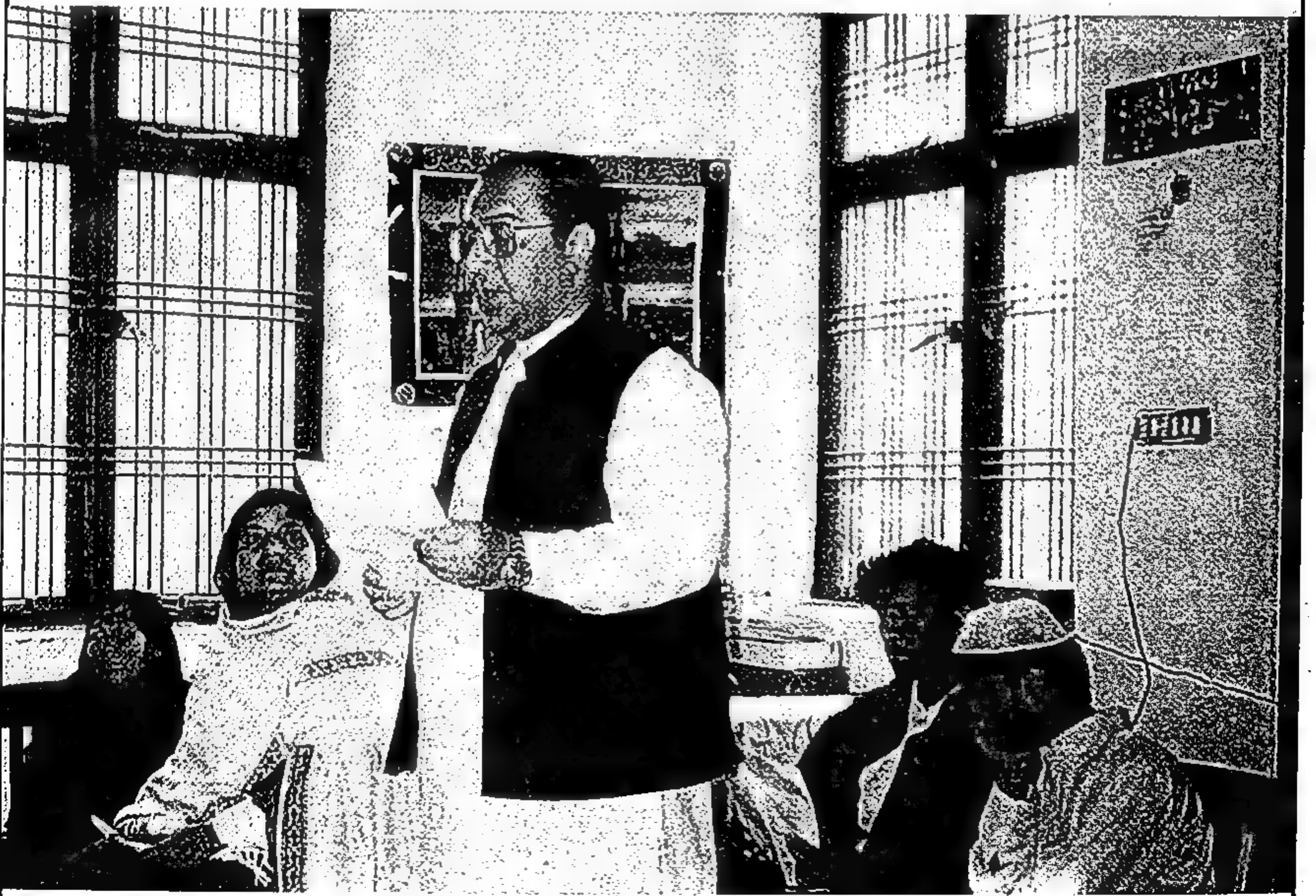
آزاد اقبال صاحب نئی عمارت کی تکمیل کے بعد افتتاحی تقریب سے خطاب فرما رہے ہیں

رشیدہ بیگم صاحبہ وحیدہ روشن دارالقرآن ٹرسٹ کی ایک تقریب میں شیخ محمد صادق
اور ٹرسٹ کے سیکرٹری جناب ملک رحمت اللہ صاحب

وحیدہ روشن دارالقرآن ٹرسٹ میں ایک تقریب میں لاوارث بچے

شادی کے بعد کے واقعات (رشیدہ بیگم کی زبانی)

شادی کے بعد آفتاب اقبال صاحب اپنا سامان لینے دہلی چل دیئے۔ تقریباً" ایک ماہ کے بعد واپس لوٹے بعد ازاں وہ مجھے لے کر کلکتہ چل دیئے۔ کلکتہ اپنے ورود کے بعد ہم آفتاب اقبال صاحب کے پھوپھی زاد بھائی فضل الٰہی (ان کی زوجہ اکبری بیگم بھی آفتاب اقبال کی تایا زاد بہن تھیں۔ بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی کے بعد انہی کو اپنی رفیقہ حیات نہ بنانے کی پاداش میں شیخ عطا محمد صاحب نے علامہ اقبال اور ان کے بیٹے آفتاب اقبال کے درمیان دوری کی خلیج حائل کر دی تھی اور بعد میں دوسرے عناصر بھی شامل ہوتے گئے اور باپ بیٹے کے درمیان مغائرت بڑھتی گئی) کے گھر چند دن ٹھہرے۔ وہ کئی سالوں سے کلکتہ میں مقیم تھے اور ایک پامسٹ کا پیشہ اپنا کر اپنی روزی کماتے تھے۔ ان کا کام خاصہ چلتا تھا اور انہیں اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ وہ بافراغت زندگی گزار سکیں۔

شیخ فضل الٰہی صاحب قدو قامت کے کوتاہ تھے اور اپنی شادی کے اوائل میں ذرا شوخی کا انداز اپناتے ہوئے ہم میاں بیوی نے ان کی عرفیت بھاہ بیڑا رکھ دی اور ان کی عدم موجودگی میں اسی عرفیت سے ان کے بارے میں گپ شپ میں مصروف رہتے تھے۔ شامت اعمال ما، ایک روز ان کے گھر سے روانہ ہونے کے بعد ان کی عرفیت کو اپنی گفتگو میں استعمال کر رہے تھے کہ وہ اچانک گھر لوٹ رہے تھے اور انہوں نے اپنے کانوں سے بھاہ بیڑا سن لیا تھا۔ وہ اس بات سے سیخ پا ہو گئے اور ان کے غصے کا عجیب عالم تھا۔ آفتاب اقبال صاحب ماشااللہ ان کی نسبت تعلیم یافتہ اور نفسیات انسانی سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اب ان کے ہاں قیام کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ آفتاب اقبال صاحب اپنے والد کے دوست اور مداح شیر بنگال مولوی فضل الحق (بنگال کے وزیر اعلیٰ

تھے) کے ہاں پہنچے۔ مولوی صاحب نے ایک پوش علاقے میں ہمیں ایک فلیٹ دلوایا فلیٹ کے کرائے کے علاوہ وہ اپنی جیب خاص سے ڈھائی سو روپے ماہانہ گزارہ کے لئے ادا کرتے تھے۔ تقریباً" تین ماہ کے بعد آفتاب اقبال صاحب کو فوج کے محکمہ خوراک میں ڈائریکٹر کی ایک عارضی آسامی پر فائز کردیا گیا۔ اس ملازمت کے حصول میں مولوی صاحب کی سعی کو دخل تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ زوروں پر تھی۔ کرفیو بھی لگتا تھا اور رات کو بلیک آؤٹ بھی ہوتا تھا۔ کلکتہ کے پارک اسٹریٹ کی ایک بلڈنگ میں فلیٹ تھے۔ کرفیو اور بلیک آؤٹ کی وجہ سے کافی خوف وہراس کا سامنا رہتا تھا۔ میری شادی تھوڑے عرصہ پہلے ہوئی تھی اور شادی کے فوراً" بعد کلکتہ ایسے دور دراز شہر میں قیام ایک عجیب تجربہ تھا۔ تنہائی ستاتی تھی تو مولوی صاحب (ان کا گھر ہمارے فلیٹ سے پانچ منٹ کی مسافت پر واقع تھا) کے پڑوس میں چند پنجابی گھرانے فلیٹوں میں آباد تھے۔ ان سے دوستی ہوگئی تھی اور اپنا غم غلط کرنے کے لئے ان فلیٹوں کا رخ کرتی تھی۔ میں مولوی صاحب کے گھر میں چلی جاتی تھی۔ مولوی صاحب کی تیسری بیوی کا تعلق یو۔ پی سے تھا اور دوسری بیوی بنگالی نژاد تھی اور اس سے کلثوم نامی ایک بیٹی تھی۔ بہر کیف مولوی صاحب کے گھر میں ان کے اہل خانہ سے خوب گپ شپ رہتی۔

آفتاب اقبال صاحب دفتر سے لوٹتے تو سیر تفریح کی غرض سے شہر کا رخ کرتے ایک دفعہ جناب ہمایوں اختر صاحب کی زیورات کی دکان پر زیور دیکھنے گئے۔ باتوں باتوں میں علامہ اقبال کے بیٹے کے حوالے سے ہمایوں اختر صاحب سے دوستی ہوگئی اور پھر ان کے گھر پر ملاقات ہونے لگی۔ اب ہمایوں اختر صاحب اس دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کے اہل خانہ سے ابھی تک پچاس پچپن سالہ دوستی کا رشتہ قائم ودائم ہے۔

کلکتہ کے قیام کے دوران ایک دوسری شخصیت مظہر علی علوی صاحب (جن کا تعلق یو۔ پی کے ایک خاندان سے تھا) سے ملنا ہوا۔ علوی صاحب کی اہلیہ تہذیب بیگم صاحبہ بڑی ملنسار اور ہنس مکھ عورت تھیں۔ پھر علوی صاحب کی اہلیہ کے ذریعے ان کے بھائی اور بھاوجہ سے بھی دوستی ہو گئی۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد علوی صاحب اور ان کی بیگم کے بھائی بھاوجہ بھی کراچی چلے آئے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں عباسی صاحب ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور تقاریب میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب یہ سبھی لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے اور بس ان کی یادیں رہ گئی ہیں۔

۱۹۴۵ء میں عالمگیر جنگ اختتام کو پہنچی اور آفتاب اقبال صاحب کی نوکری بھی اپنے اختتام کو پہنچی۔ نوکری کا دور ختم ہوا تو ہم میاں بیوی عازم لاہور ہوئے۔ ہمارے لاہور آنے کے بعد اماں والدہ ماجدہ آفتاب اقبال گجرات سے لاہور آگئیں۔ ہم جرنیلی سڑک پر واقع لالہ زار کوٹھی میں کرایہ پر رہنے لگے۔ آفتاب اقبال صاحب نے اپنی پریکٹس شروع کر دی۔

یکم جولائی ۱۹۴۵ء کو اللہ نے ہمیں ایک چاند سی بچی شبنم سے نوازا۔ وہ پھول آٹھ روز اپنی بہار دکھلا کر کملا گیا اور اس گڑیا کی اچانک وفات نے لماں کو غم واندوہ کے طوفان میں پھانس لیا۔ بچی کو باغبان پورہ کے قبرستان (آج کل معراج دین قبرستان کہلاتا ہے) میں دفن کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد ۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو لالہ زار کوٹھی میں ہی آزاد اقبال پیدا ہوئے۔ لماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ آزاد کے کئی نام تجویز ہوئے۔ لاہور کارپوریشن کے دفتر پیدائش کے رجسٹر میں ضمیر اقبال لکھوا لیا گیا۔ میری والدہ صاحبہ نے سلیم اقبال تجویز کیا۔

آفتاب اقبال صاحب کو یہ نام پسند نہ آیا۔ آخر انہوں نے اپنے دوست ابوالکلام آزاد

کے نام پر آزاد اقبال رکھا۔ ان کی سوچ تھی کہ اقبال نے غلام ہندوستان میں آنکھ کھولی اور ان کا پوتا آزادی (ہندوستان کی آزادی ہر شخص کی زبان پر تھی) کے بعد آزاد اقبال ہوگا۔

آزاد کی پیدائش کے آٹھ ماہ بعد اماں کا دل کے دورے سے ۴۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں معراجدین قبرستان میں پوتی کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔ میں ہر سال لاہور جاتی ہوں۔ فاتحہ خوانی کرتی ہوں اور قبر پر پھول چڑھاتی ہوں۔ آفتاب اقبال کی زندگی میں ہم دونوں فاتحہ خوانی کو جاتے تھے۔

اماں کے انتقال کے بعد ہندو مسلم فسادات زوروں پر تھے۔ باغبان پورہ مسلمانوں کا علاقہ تھا اور اس کے ساتھ ہی سنگھ پورہ ہندوؤں اور سکھوں کا علاقہ تھا۔ ویسے ہمارے ہمسائے سردار جوگندر سنگھ سکھ تھے۔ میری بڑی بہن وحیدہ، اماں کے گجرات سے آنے کے بعد ہمارے ہاں ہی رہتی تھیں۔ ان دنوں سردار محمد گرلز ہائی اسکول نیا ہی بنا تھا اور وہ اس اسکول میں معلمہ تھیں۔ یہ اسکول علامہ اقبال روڈ پر واقع تھا۔ میری بہن وحیدہ کی اس سکھ گھرانے سے دوستی تھی۔ ویسے بھی یہ اچھے لوگ تھے۔ ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے کوئی بغض نہیں تھا۔ ایک روز محلے میں خبر پھیل گئی کہ آج رات ہندو اور سکھ مسلمانوں کے محلہ پر شب خون مارنے والے ہیں۔ خوف و ہراس کے عالم میں اس سکھ پڑوسی کے گھر میں ہم نے پناہ لے لی۔ اس وقت ہم نیچے رہتے تھے۔ پھر اوپر والی منزل میں منتقل ہوگئے تاکہ دشمن فوری طور پر ہمیں نشانہ نہ بنا سکے۔ جب خطرہ ہوتا کہ آج مسلمان ہندو سکھوں پر ہلہ بولیں گے تو وہ سکھ گھرانہ ہمارے ہاں پناہ لے لیتا۔ اور ہم ان کی حفاظت کرتے۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں آزاد آٹھ ماہ کے پیٹ میں تھے کہ اماں ہمیں داغ مفارقت

دے گئیں۔ اور ادھر آفتاب اقبال صاحب کی پریکٹس بھی زیادہ نہ چلی۔ لاہور میں جو بیرسٹر اور وکیل اچھی پریکٹس کر رہے تھے۔ انہوں نے آفتاب اقبال کو مشورہ دیا کہ وہ کسی چھوٹے شہر میں پریکٹس شروع کریں۔ پس ہم منٹگمری (موجودہ ساہیوال) آگئے ۔اس زمانے میں ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ یہاں سکھوں کی آبادی زیادہ تھی۔ پریکٹس چل نکلی۔ مقدمات آنے لگے۔ ہماری کوٹھی کے برابر سکھوں کی کوٹھی تھی۔ آفتاب اقبال صاحب عدالت چلے جاتے اور میں آزاد کے ساتھ گھر پر تنہا ہوتی تھی۔ ہر وقت خوف طاری رہتا تھا کہ کوئی سکھ ہمیں ہلاک نہ کر دے۔ ہمارے پڑوسی بڑے اچھے تھے۔ ایک روز ان کے گھر میں فوتید گی ہو گئی۔ آفتاب اقبال صاحب نے مجھے ان کے گھر تعزیت کے لئے بھیجا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے گھر میں قدم رکھتے ہی مار نہ ڈالیں ۔ لیکن آفتاب اقبال صاحب کے دباؤ میں آکر چار و ناچار ان کے گھر جانا ہی پڑا۔ وہ لوگ مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر خوش ہوئے اور غم میں شریک ہونے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ آفتاب اقبال صاحب کو ملنے آئے۔ پھر بھی نجانے کیا بات تھی کہ میرا وہاں دل نہیں لگتا تھا۔

آخر ۱۴ اگست کو ہمیں آزادی ملی اور آزادی کے دوسرے روز میرے بڑے بھائی افضل بیگ صاحب کا خط موصول ہوا۔ وہ ہندوستان کے محکمہ اطلاعات میں بطور ڈائریکٹر وابستہ تھے۔ اور اپنی مرضی کے مطابق دہلی سے تبادلہ کروا کر پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں آگئے تھے اور کراچی کے خوبصورت شہر میں ہمیں آنے کی دعوت دی۔ اپنے خط میں انہوں نے کراچی کی خوبصورتی اور صفائی ستھرائی کا بطور خاص ذکر کیا تھا۔ موسم کی خوشگواری اور ہنگاموں سے پاک شہر کا تذکرہ۔ ہمیں اس شہر کی سیاحت پر آمادہ کرنے کے لئے یہ چیزیں مہمیز ثابت ہوئیں۔

ضروری سامان باندھا اور چند روزہ سیاحت کے پروگرام کے تحت کراچی روانہ ہو گئے۔ ساہیوال سے کراچی تک کا فاصلہ اس زمانے میں دو دن اور ایک رات میں طے ہوا۔ جگہ جگہ گاڑی رک جاتی تھی۔ گاڑیوں پر ہندو اور سکھوں کے حملے جاری تھے۔

کراچی پہنچ کر پہلی بار سمندر دیکھا۔ بچپن کی دید ایک خواب سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ میرا مطلب ہے کہ جب بچپن میں ہمیں ابا جان مرحوم کے حبشہ جانے کے بعد جالندھر جانا پڑا تو برما سے ممبئی تک ہم بحری جہاز سے آئے تھے۔ خدا لگتی بات ہے کہ مجھے یہ شہر بہت پسند آیا۔ میرے بھیا یہاں تھے اور ہمارے کلکتہ کے دوست ہمایوں اختر صاحب بھی یہاں بس گئے تھے۔ ایک روز بندر روڈ پر ہمایوں اختر صاحب سے آفتاب اقبال کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ بڑی مشکلوں سے کلکتہ سے کراچی پہنچے تھے اور آرام باغ کے علاقے میں ایک الاٹ شدہ مکان میں بڑے کنبے کے ہمراہ رہائش پذیر تھے۔

چند روزہ قیام کے بعد میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ہمیں اس شہر میں بس جانا چاہئے میں نے اپنا ہم خیال بنانے کے لئے آفتاب اقبال پر زور ڈالا تو وہ کراچی قیام پر راضی ہو گئے۔ وہ واپس منٹگمری اپنا سامان لینے گئے۔ ضروری اشیاء لیں اور غیر ضروری سامان نوکر کے حوالے کیا اور کراچی لوٹ آئے۔

آفتاب اقبال صاحب نے اللہ کا نام لے کر بندر روڈ پر واقع ایک بلڈنگ سیفی چیمبرز میں اپنا ذاتی دفتر قائم کیا اور وکالت کا کام شروع کیا۔ ان دنوں ہندو اور سکھ کراچی سے بھاگ رہے تھے۔ اور مکانوں کے بہت سے مقدمے آنے لگے۔ دل میں ٹھانی کہ کوئی بڑی سے کوٹھی لے لیں لیکن اگر وسیع مکان ہوا تو تنہائی میں رہنے کا خوف رہے گا۔ چاروناچار پاکستان چوک کے قریب گل مینشن اسٹریچن روڈ پر ایک فلیٹ پگڑی پر لے لیا۔ بلڈنگ میں بہت سے فلیٹ تھے اور دوسرے فلیٹ والوں سے دوستی ہو گئی۔

۱۹۴۷ء کی آخری سہ ماہی میں ہم کراچی وارد ہوئے تھے۔ اس زمانے میں یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا۔ اس دور میں شہر سے ہوائی اڈے جاتے ہوئے راستے میں سنسان اور ویران جگہیں تھیں، اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ دن کی روشنی میں لوگ چلتے پھرتے تھے اور رات کو ایک دم سناٹا چھا جاتا تھا۔

آفتاب اقبال صاحب کا کاروبار چل نکلا۔ جائیدادوں کے مقدموں کے علاوہ Patent کا کام بہت نکل آیا۔ غیر ممالک کی مشہور کمپنیوں کے ہندوستان میں ٹریڈ مارک رجسٹر تھے۔ لیکن اب نئے ملک کے معرض وجود میں آنے کے بعد انہیں نئے ملک میں رجسٹر کروانے کا قانونی مرحلہ درپیش تھا۔ اور یوں دنیا کے مختلف ممالک خصوصاً" برطانیہ، سوئزرلینڈ اور جرمنی سے انہیں دھڑادھڑ کام آنے لگا۔ رات گئے تک کام میں جٹے رہتے اور کئی بار دو تین بجے رات تک کام سے فراغت ملتی تھی۔ دفتر میں صبح کام کرنے کے باوجود شام کو کلرک گھر پر آجاتا اور بعض اوقات میں بھی ان لوگوں کا ہاتھ بٹاتی۔

ایک وقت تھا کہ مجھے پریکٹس کے دوران پیسے کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ اور ایک وقت آیا تیس اور پینتیس ہزار روپے ماہوار آمدنی ہونے لگی۔ ایک آدھ سال میں خدائے بزرگ و برتر کی شان کریمی کے صدقے آفتاب اقبال کروڑ پتی بن گئے۔

۱۹۴۸ء میں وقار اقبال کی پیدائش سے ہمارے رزق میں کشائش کے دروازے کھل گئے۔ اب نقشہ ایسا بدلا کہ آفتاب اقبال صاحب کو اپنے کام کے سلسلے میں یورپی ممالک کے دورے کرنے پڑتے۔ آخر اللہ کے فضل و کرم سے کوٹھیوں، گاڑیوں اور پلاٹوں کا مالک بنا دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے شادی کا منظر آگیا کہ مجھے شادی کے موقعہ پر ایک

ڈھائی سو روپے کا چھوٹا سا سیٹ ملا تھا اور اب میرے پاس اعلیٰ قسم کے کئی سیٹ موجود تھے۔ خوشحالی کا ایسا دور دورہ تھا کہ گھر میں نوکر چاکر، ذاتی مکان اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ بھجوا لیا۔

آزاد اقبال نے برطانیہ سے نہ صرف بی۔ اے، ایل، ایل، بی کیا بلکہ لنکنز ان سے بیرسٹری کی سند بھی لی۔ نوید کو چھوٹی عمر میں ایچیسن کالج لاہور میں داخل کروایا اور بعدہ ۱۹۶۴ء میں تینوں بھائیوں کو یورپ کے مشہور اداروں میں داخلہ دلوا لیا۔ نوید اقبال سیکنڈری تعلیم سے پہلے ہی برطانیہ روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے لندن کے Harrow اسکول میں تعلیم پائی۔ وہاں سے اے لیول کے بعد کوئین میری کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا اور بعد ازاں دو سال کے لئے فرانس گئے۔ وہاں سے فرانسیسی میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ فرانس سے مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ روانہ ہو گئے۔ امریکہ میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے امتحانات پاس کئے۔

یہ اسی آفتاب اقبال کے فرزند تھے۔ جسے علامہ اقبال نے ایف۔ اے تک تعلیم دلوا کر کہہ دیا تھا کہ میں آپ کا پینتیس روپے ماہانہ خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔ مزید تعلیم کا شوق پورا کرنا ہو تو چھوٹی موٹی ملازمت کر لو۔ لیکن آفتاب اقبال صاحب نے اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑی۔ سینٹ اسٹیفنز کالج سے بی۔ اے کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ چلے گئے۔

اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود وہ اپنے ملک ہندوستان (اس وقت پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا) میں اپنی ڈھنگ کی ملازمت نہ مل سکی۔ نوکری کے حصول کے لئے ہر ممکن طریقے کو اختیار کیا۔ لیکن صرف تین بار ملازمت کا موقعہ ملا۔ ۱۹۳۳-۳۶ء تک اسلامیہ کالج کلکتہ اور کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی ادب اور فلسفہ کی

تدریس بحیثیت پروفیسر انجام دی۔ دوسری بار ۴۱-۱۹۳۹ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں بطور پروفیسر اور صدر شعبہ انگریزی خدمات انجام دیں اور تیسری ۴۵-۱۹۴۳ء تک کلکتہ میں بطور ڈائریکٹر محکمہ خوراک میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے ذاتی کاروبار سے اتنی دولت کمائی کہ ان کے خاندان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آفتاب کے پاس مال دولت کی اتنی ریل پیل ہو سکتی ہے۔ بہرکیف جب اللہ کی ذات نے اسے مال و دولت سے نوازا تو اس نے اپنوں اور بیگانوں کو دل کھول کر نوازا اور وہ آخری دم تک بحث مباحثوں میں نہ الجھے۔ حتی کہ بھارت کے اقبال شناس اکبر علی خان عرشی زادہ اور پاکستان کے اقبال شناس اور منجھے ہوئے شاعر اعظم علی خان خسروی نے انہیں بہتیرا اکسایا کہ وہ کسی طرح اپنے اور اپنے والد حضرت علامہ اقبال کے درمیان مفائرت سے پردہ اٹھائیں۔ لیکن انہوں نے خاموشی اختیار کی اور کبھی تنہائی میں اپنے دو عزیز دوستوں سے اپنے دل کی بات کہہ گزرتے تھے۔ ایک ہمایوں اختر تھے جو ایک کامیاب تاجر، مستند حکیم اور انگریزی زبان کے صحافی تھے اور وہ ایک کامیاب مترجم بھی تھے۔ ان سے بعض اوقات ان کی گفتگو ڈیڑھ دو بجے تک طول کھینچتی تھی۔ وہ آفتاب اقبال صاحب کے رازداں تھے اور ہیں۔ ان سے تقاضہ کرتی رہی کہ وہ آفتاب اقبال صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کریں ان سے تاثرات کے سلسلے میں کسی کو ان کے پاس بھجوا رہی تھی کہ ان کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ ان کے دوسرے دوست جناب عریضی صاحب ہیں اور ان کی شرافت و دیانت اور لیاقت کے مداح تھے۔ عریضی صاحب نے اپنے تاثرات میں اپنے یار غار کی شبینہ محفلوں سے کچھ احوال رقم کروائے ہیں۔

جب میرے رشتہ داروں کو میری مالی فارغ البالی کا علم ہوا تو انہوں نے رشتہ

داری کو جوڑنے کی سبیل کی۔ میرے سگے چچا جنہوں نے تقریباً" سات سال تک میرے سے بات تک نہ کی تھی ،وہ صلح کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے بڑھاپے کو دیکھتے ہوئے میں نے ان سے صلح کرلی۔ آخر کار سب کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ وہ اپنی مغل لڑکیوں کے ہاتھ غیر مغل لڑکوں کو دینے لگے اور غیر مغل لڑکیوں کو اپنی بہو بنانے لگے۔

میں اس وقت ایک ادارے عقد بین المسلمین کی صدر ہوں اور لوگوں کو یہی بات سمجھاتی ہوں کہ اب ذات پات کے بندھنوں سے اپنے کو آزاد کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ اب لوگوں میں تبدیلی آرہی ہے۔ وہ لڑکے کے پڑھا لکھا ہونے اور برسر روزگار ہونے کو دیکھتے ہیں۔ ذات پات کے جھمیلوں میں نہیں پڑتے۔

شیر بنگال فضل الحق صاحب کا احسان میں عمر بھر نہیں بھول سکتی۔ بڑے آڑے وقت میں انہوں نے ہمیں سنبھالا دیا۔ دل میں یہ بات ٹھانی تھی کہ جب موقعہ ملا تو اس خاندان کی مدد کریں گے۔

فض الحق صاحب کی پہلی شادی کسی نواب خاندان میں ہوئی تھی اور ان کی بڑی بیٹی رئیسی بیگم ۱۹۴۳ء میں کسی بڑے آدمی کی اہلیہ تھیں اور بڑے عیش کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں نوکر چاکر تھے۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا وہ اپنے میاں سے علیحدہ ہوگئیں۔ میری بہن وحیدہ کی اس سے بڑی دوستی تھی۔ جب ملک تقسیم ہوا تو وہ ڈھاکہ چلی گئیں۔ ڈھاکہ میں ان کے مالی حالات میں بگاڑ پیدا ہوا۔ انہوں نے ایک معمولی آدمی سے شادی کرلی تھی۔ وہ کلکتہ والے ٹھاٹھ باٹھ رخصت ہوئے۔ اتفاقاً "۱۹۶۰ء میں رئیسی بیگم سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری بہن سے ملنے لاہور گئیں ۔وحیدہ بہن نے ان کی کافی مدد کی۔ پھر وہ کراچی میں فیڈرل بی۔ ایریا کے ایک چھوٹے

سے کرائے کے مکان میں رہائش پذیر ہو گئیں۔ اس کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ میں فورا" اس کے ہاں پہنچی اور ایک نواب زادی کی مالی پستی کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اسے اپنے ہاں لے آئی اور تقریبا" دو مہینے تک اسے اپنے گھر رکھا۔ اس کی ہزاروں روپے سے مدد کی آخر اس کے محسن والد مولوی فضل الحق کے احسان اتارنے کا ایک موقعہ ہاتھ لگا اور ہمیں اس کی مدد کرتے ہوئے بڑی مسرت ہوئی۔

بیگم صاحبہ کے بیان کردہ ان واقعات کے بعد میں چند باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔

میں نے بیگم آفتاب اقبال صاحبہ میں مردم شناسی کا جوہر کچھ زیادہ ہی پایا ہے۔ بات بڑی ناپ تول کر کرنے کی عادی ہیں۔ کسی اجنبی پر اندھادھند طریقے سے اعتبار نہیں کر لیتیں۔ بڑا ٹھوک بجا کر، پرکھ کر اپنا فیصلہ صادر کرتی ہیں۔ جلدبازی سے کام لینے سے انہیں نفرت ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے ان کی مجلس میں کچھ وقت بیٹھنے کا موقع نصیب ہو تا رہتا ہے۔ ان کی مجلس میں علامہ اقبال سے لے کر اور کئی علما کا تذکرہ سنا ہے اور انھیں کتب بینی کا جنون کی حد تک شوق ہے اور ان دنوں ان کی طبیعت ناساز ہے لیکن کوئی کتاب ان کے ہاتھ لگ جائے تو اپنی بیماری کو بھول جاتی ہیں۔ کتاب کی چیدہ چیدہ باتیں نوٹ کر لیتی ہیں اور اپنے مطالعے کی روشنی میں اس پر بحث کرتی ہیں۔ علم انسان میں خوابیدہ صلاحیتوں کو جگانے کا کام انجام دیتا ہے اور ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال حکمت سے ارشاد فرمایا ہے کہ علم اپنی ماں کی گود سے قبر تک حاصل کرو۔ علم کے حصول کے لئے کسی مخصوص وقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں پورے شرح صدر سے کہتا ہوں کہ آج کے دور میں بڑے گھرانے (امارت اور علم کے ناتے) کی عورتوں میں اگلے وقتوں کے لوگوں کی خوشبو اور مہک نہیں ملتی۔ میں

حیران ہوں کہ بیگم رشیدہ صاحبہ جب دینی معلومات اور تصوف پر بات کرتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی وہ حافظ قاری اللہ چاپا کی مریدہ اور دارالبنات کی طالبہ رہی ہیں۔ ان کی ذات میں دین اور دنیا کو ایک ساتھ ضم ہوتے دیکھا ہے۔

ایک روز ایسے ہی نہ جانے کس زعم میں میرے منہ سے نکل گیا کہ آج کل حالات بڑے خراب ہیں اور ہر وقت کسی حادثے اور آفت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ آپ رات کو حصار کر کے سویا کیجئے۔ فرمانے لگیں: میں رات کو اپنے گھر کے حصار کے ساتھ ہی اپنے بیٹوں کے گھروں کا بھی حصار کر کے سوتی ہوں۔ میں ہکا بکا رہ گیا کہ ہماری جدید تہذیب کی عورتیں اسے دقیانوسی بات سمجھ کر ٹال دیتی ہیں اور مکان کی حفاظت کسی گارڈ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہیں اور اگر گارڈ کے بیچ کے رکو نکال کر حرف گاڈ کے بھروسے پر رہیں تو وہ زیادہ بہتر ہے اور حصار دراصل اپنے مکان کا محافظ اللہ تعالیٰ کو ٹھہرانا ہے۔ اور ہمارے سارے بگاڑ کا بنیادی سبب خدا فراموشی ہے اور جیسے خدا پرستی کا دور آئے گا۔ ہر بات بہتر ہو گی اور ہماری بہت سی پریشانیاں ختم ہو جائیں گیں۔

اب وہ زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہیں جہاں خود بیزاری اور مردم بیزاری کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ اپنے مہمانوں کا استقبال بڑی خندہ پیشانی سے کرتی ہیں اور انہیں مردم بیزاری نہیں بلکہ مردم داری کا جویا پایا ہے۔ وہ ایک نہ برداشت کرنے والے انسان کو بھی برداشت کر لیتی ہیں۔ اگر نوکروں کی نادانیوں سے دل برداشتہ ہوں تو تھوڑی دیر بعد پھر اسے نظر انداز کر دیتی ہیں۔ انہیں نوکروں کی بعض خامیوں کو محض ان کی چند اچھائیوں کی وجہ سے نظر انداز کرتے دیکھا ہے۔ زندگی اور موت کے مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتی ہیں۔ میرے سامنے ان کے بڑے ہی قریبی عزیز اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے اور میں نے انہیں روتے دھوتے، بین کرتے

اور گم سم نہیں دیکھا۔ خدا کی رضا اور مرضی کے سامنے کون کچھ کہہ سکتا ہے۔ میں نے انہیں ایسے مواقع پر غم کے دریا میں غوطہ زن نہیں دیکھا بلکہ اجنبی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں جس ہستی کے روبرو بیٹھا ہوں اس کا قریبی عزیز موت نے دفعتاً اچک لیا ہے۔

عمروں کی ادائیگی کا انہیں ایک جنون سا ہے۔ اور امسال (۹۸) اپنی بیماری کی وجہ سے وہیل چیئر پر بیٹھ کر عمرہ ادا کر آئی ہیں۔ اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر سعودی عرب سے عمرے کی ادائیگی کے بغیر نہیں لوٹیں۔ وقت کی پابندی میں نے ان سے سیکھی ہے ویسے فضائیہ کی ملازمت (۱۹۶۴ء) نے جسم کو پابندی اوقات کا خوگر بنا دیا تھا لیکن ان کی پابندی اوقات کے سامنے ہم ہیچ ہیں۔

کھرے آدمی میں عام لوگوں کو ایک عیب نظر آتا ہے کہ وہ فوراً" غلط بات کی تردید کر دیتا ہے اور اپنے عزیزوں کی دلجوئی کی خاطر منافقت کو نہیں اپناتا۔ غلط بات کو کبھی صحیح ماننے کے لئے وہ تیار نہیں ہوتیں۔ سختی کا عنصر ان کی ذات میں نسلی طور پر شاید بدرجہ اتم موجود ہے۔ جب وہ کسی کے غلط کام اور غلط رویے پر بگڑتی ہیں تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی ہیں۔ ایسے مرحلوں پر وہ کسی سے رُو رعایت برتنے کی روادار نہیں۔

میں مختصراً" یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انہیں عربوں کے مقولے پر عمل پیرا دیکھا ہے کہ آپ اتنے سخت نہ بنیں کہ پتھر کی طرح آپ کو توڑ دیا جائے اور آپ اتنے نرم نہ بنیں کہ آپ کو لیموں کی طرح نچوڑ دیا جائے۔ ان کی ذات کو ان دونوں کے بین بین دیکھا ہے اور ان کا رویہ اور حسن سلوک کا صدقہ ہے کہ وہ پاکستان سے قبل کی دوستیوں اور تعلقات کی پاسداری کو نبھا رہی ہیں۔ میں انہیں اقبال کے خاندان کی ایک مثالی عورت قرار دیتا ہوں۔ اللہ انہیں سلامت با کرامت رکھے۔

سپاسنامہ

خدمت عالیہ محترمہ مکرمہ جنابہ رشیدہ بیگم آفتاب اقبال ایم۔ اے لندن بیرسٹر اینڈ ایڈووکیٹ چیف کورٹ کراچی۔

ہماری معزز مہمان!

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ آج حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے گھر کا آفتاب یہاں لمعہ فگن ہے۔ ہم سب انتہائی مسرت اور محبت کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں کیونکہ آپ کی دو گونہ وابستگی نہ صرف ہمارے لئے باعث فخر ہے بلکہ مدرسہ کی قدیم طالبات کے لئے بھی وجہ انبساط ہے۔

ہمیں فخر ہے کہ آپ کو حکیم الامت کی بہو کہلانے کا شرف حاصل ہے اور مدرستہ البنات کو اس پر بجا طور پر ناز ہے کہ آپ اس درسگاہ کی ایک قدیم طالبہ ہیں۔

آپ کو علم ہے کہ حکیم الامت، ترجمان حقیقت، حضرت علامہ اقبال مرحوم کی پوری زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں بسر ہوئی ہے اور ہماری قوم ان کے عظیم احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ مدرستہ البنات ان کے روح پرور پیغام کی ایک عملی تصویر ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے۔

از کلید دیں در دنیا کشاد
ہمچو او بطن ام گیتی نزاد

ان کے اس ارشاد میں مدرستہ البنات کا پورا مقصد پنہاں ہے جس کی تکمیل کے لئے ہم سب کوشاں رہتے ہیں۔ ہماری زندگیاں اس عظیم درس گاہ کی وسعت و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے وقف ہیں۔ کیونکہ ہمیں علامہ اقبال مرحوم کا یہ ارشاد ہمیشہ یاد

رہتا ہے کہ

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است کتنی بڑی صداقت اور حقیقت ہے۔ ہم سب کی زندگی کا واحد نصب العین یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا چراغ ہر قیمت پر روشن رکھیں۔ کیونکہ دنیا میں ہماری آبرو اسی سے ہے اور ہماری زندگی کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

گلدستہ محبت

بخدمت اقدس محترمہ بیگم رشیدہ آفتاب اقبال

کھل گئی ہے روشنی کی ایک کتاب
صبحدم جس طرح نور آفتاب
اٹھ گیا روئے مسرت سے نقاب
ہر طرف ہے کیا نرالی آب و تاب
رونق محفل رشیدہ آئی ہیں
یا ضیائے قلب و دیدہ آئی ہے
کوئی قسمت کا دھنی یاں آیا ہے
ہے خوشی کے رقص میں ہر ایک شے
ہر نفس ہے نغمہ تازہ کی لے
یہ صدا آئی ہے دل سے پے بہ پے
تو ہمیشہ انجمن آرا رہے
یہ سماں دلکش رہے پیارا رہے

منجانب انجمن قدیم طالبات مدرستہ البنات لاہور

بتقریب سالانہ کنوینشن

میری عزیز بہن!

اگرچہ آپ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی میں جاچکی ہیں۔ اس لئے آپ کے کندھوں پر بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ لیکن یہ فرائض اور ذمہ داریاں مادر درسگاہ سے آپ کا رشتہ منقطع کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گی کیونکہ اس کے آغوش تربیت نے آپ کو شعور زندگی بخشا ہے۔ اس لئے اپ پر اس درسگاہ کا حق فائق ہے۔ آپ نے یہاں کی زیر تعلیم نسل کے سامنے درخشندہ مثالیں قائم کرنا ہیں تاکہ وہ بھی ان کی روشنی میں اپنے مستقبل کی طرف سفر کرسکیں۔ میرا مرہم سب کے لئے بے حد مسرت انگیز ہے کہ آج یہاں آپ کی تشریف آوری سے محبت واخوت کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے اور آج اس ناقابل شکست رشتے کی تجدید ہوئی ہے۔ جسے وقت کے گردوغبار نے قدرے دھندلا دیا تھا۔ ہمیں فخر ہے کہ آپ مدرستہ البنات کی ہیں اور یہ درسگاہ آپ کی ہے۔ اس کا مستقبل آپ کو بھی اتنا ہی عزیز ہے جتنا کسی اور کو ہے۔ اس لئے آئیے ہم سب مل کر اس کی تعمیر جدید کے کٹھن کام میں ہاتھ بٹائیں اور دنیا پر یہ ثابت کردیں کہ مدرستہ البنات ایک زندہ جاوید عزم ہے جسے وقت کے تندوتیز طوفان کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

آج آپ کی صدارت میں اس عہد کی تجدید کریں کہ ہمارے لئے اس وقت تک عشرت منزل حرام ہے۔ جب تک ہم اس درسگاہ کو ہمدوش ثریا نہیں بنا دیتے۔

یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنی مصلحتوں اور مجبوریوں کے نام پر اس درسگاہ کے بنیادی مفادات کو قربان نہ ہونے دیں اور دولت دنیا کے کسی بھی ہندھن کو زنجیر پا بننے کی اجازت نہ دیں کیونکہ دولت دنیا ایک لرزتا ہوا سایہ ہے۔ جو سورج کی دھوپ چھاؤں کے سہارے زندہ رہتا اور فنا ہوجاتا ہے۔ اس کی یہ فطرت ہے

کہ یہ ہر ایک نیک کام کے راستے میں رکاوٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اس سائے کو صرف سایہ ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ عمل کی دنیا تعمیر کرنے والوں کے لئے یہ بے وفا سایہ فریب نظر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ حکیم الامت نے فرمایا ہے۔

امید نہ رکھ دولت دنیا سے وفا کی
رم اس کی طبیعت میں ہے مانند غزالہ

مکرمہ و محترمہ!

آخر میں ہم سب ایک بار پھر آپ کی تشریف آوری کے لئے رسمی نہیں۔ دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ کی ایثار پسندی، مروت اور اس درسگاہ سے لگاؤ کی بدولت ہماری یہ تنظیم اور زیادہ مضبوط اور فعال صورت اختیار کرلے گی تاکہ ہم اپنے قومی فرائض سے بطریق احسن سبکدوش ہو سکیں۔

اولڈ گرلز ایسوسی ایشن،

مدرسۃ البنات ۵ ایک روڈ لاہور

۸ جنوری ۱۹۶۱ء

بیگم آفتاب اقبال نے مدرسۃ البنات کے جلسہ کی صدارت کی تھی۔ مدرسہ کی اساتذہ انہیں اسٹیج کی جانب لے جا رہی ہیں

آزاد اقبال

آزاد اقبال (ضمیر اقبال) شیخ محمد اقبال کے سب سے بڑے پوتے اور شیخ نور محمد کے سب سے بڑے پڑ پوتے ہیں آزاد اقبال کی پیدائش گھر پر ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلوٹھی بچی شبنم سے ۲۹ اگست ۱۹۴۵ء کو نوازا تھا اور وہ بچی بڑی احتیاط کے باوجود نمونئے کا شکار ہو گئی۔ اس زمانے میں ایچی سن ہسپتال میں پہلی زچگی کا کیس کر والیا لیکن بڑی حفاظت اور احتیاط بھی بچی کو موت کے منہ سے نہ بچا سکی اور خوبصورت سی بچی آٹھ روز گزار کر راہی ملک بقا ہوئی۔

شبنم کی فوتیدگی سے ہمارے دل سہم سے گئے اور ہمارا مصمم ارادہ تھا کہ آئندہ اللہ تعالیٰ خوشی کا موقعہ لائے تو ہسپتال کا رخ نہ کیا جائے۔ لہٰذا ایک ماہر ہندو لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں ۱۷ جولائی ۱۹۴۶ء آزاد اقبال باغبان پورہ کی ایک کوٹھی لالہ زار میں تولد ہوئے اور آزاد اقبال کی پیدائش پر دادی اماں (کریم بی بی صاحبہ) پھولی نہ سماتی تھیں اور وہ اپنی پہلوٹھی پوتی شبنم کا غم بھول گئیں۔

ننھیال والوں نے آزاد کا نام سلیم تجویز کیا تھا۔ اور آفتاب اقبال صاحب نے آزاد اقبال تجویز کیا تھا۔ آفتاب اقبال صاحب کے ذہن میں یہ مفروضہ تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد غلام ہندوستان میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور اب تحریک پاکستان کے آثار بتا رہے ہیں کہ اس ملک کے باشندگان کو آزادی کی نعمت سے ذات خداوندی نوازنے والی ہے اور اس مناسبت سے اپنے بیٹے کا نام آزاد اقبال تجویز کیا۔ بعض اذہان میں یہ بات بھی آئی کہ مولانا آزاد کی ذہانت، سیاست اور مذہبی حیثیت نے آفتاب اقبال کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے اپنے نو مولود بچے کا نام ان کے نام کی رعائت سے آزاد اقبال تجویز کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب لاہور میونسپل کارپوریشن میں بچے کے نام کا اندراج کروالیا

گیا تو وہ آزاد اقبال کی بجائے ضمیر اقبال لکھوا لیا گیا۔ آزاد اقبال کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد دادی جان کا انتقال اور پھر غموں کے سائے تلے اور مالی مشکلات میں پھنسے ہوئے خاندان نے ساہیوال کا رخ کیا۔ گردش دوراں کے ہاتھوں ستائے ہوئے گھرانے کو دوبارہ آزاد اقبال کے نام کے صحیح اندارج کا موقعہ نہ مل سکا اور اب بھی ضمیر اقبال کے نام سے یہ اندراج موجود ہے۔ اس حیات فانی کا کیا بھروسہ میں نے اپنے بیٹے کو ایک کیسٹ میں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں نام کی تصحیح کا بندوبست کر لے۔

بہت قلیل عرصے میں آزاد اقبال کو منٹگمری ، لاہور اور کراچی میں اپنے ابتدائی دن گزارنے کا موقعہ ملا۔ پاکستان کی تشکیل نے ہماری اقتصادی خوشحالی کا دروازہ کھول دیا تھا اور جس وقت افراتفری کے عالم میں لوگ نان جویں کو ترس رہے تھے۔ آفتاب صاحب کو قدرت نے بے انتہا دولت سے نوازا اور یوں آزاد اقبال منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا تو نہ ہوئے لیکن ہوش سنبھالنے پر ان کے منہ میں سونے کا چمچہ تھا۔ کراچی کے مرکزی علاقے پاکستان چوک کے قریب اسٹریچن روڈ پر ایک بڑی بلڈنگ گل مینشن کے ایک فلیٹ میں ہم لوگ رہائش پذیر تھے اور اپنی سہولت کی خاطر ایک فرانسیسی ساخت کی گاڑی بھی خرید لی تھی۔ ایک میمن لڑکا باقری ہمارا شوفر تھا اور اس لڑکے نے کم سنی میں ہی آزاد اقبال کو گاڑی چلانا سکھا دیا تھا۔ ہمارے پاس گاڑی کھڑی کرنے کے لئے گیراج کی سہولت میسر نہ تھی اور ہم مجبوری کی وجہ سے گاڑی اپنی ایک سہیلی کے گھر کھڑی کرتے تھے۔

پاکستان چوک کے قریب والی اقامت گاہ میں ہم تقریبا" بارہ سال تک مقیم رہے اور پھر اپنی ضروریات کے پیش نظر خالد بن ولید کی ایک کوٹھی فوزیہ میں منتقل ہو گئے

اور یوں پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں رہائش کا موقعہ ملا۔

فوزیہ میں تقریباً" ۲ سال کا عرصہ گزارنے کے بعد رازی روڈ کی ایک کوٹھی M-44 میں چلے گئے۔ آخر ۱۹۶۰ء میں ۳۳۔ ٹیپو سلطان کی رہائش گاہ میں اٹھ آئے۔ اس زمانے میں یہ علاقہ بڑا سنسان تھا۔ اور اکادکا کوٹھیاں نظر آتی تھیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک انگریز گھرانہ رہائش پذیر تھا۔ صفائی اور ستھرائی کے تو یورپین دلدادہ ہوتے ہیں۔ لہذا بڑا اچھا وقت گزر رہا۔

اس کوٹھی میں بسے تقریباً" چار سال کا عرصہ گزرا تھا کہ آفتاب صاحب نے اپنے تینوں بیٹوں (آزاد اقبال، وقار اقبال اور نوید اقبال) کو یورپی اداروں میں داخلے کروانے کے لئے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ ہم وکٹوریہ نامی بحری جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہوئے تھے۔ نوید اپنی عمر کے صرف دس سال ہی پورے کرنے پایا تھا کہ اسے بھی بیرون ملک تعلیم کے لئے بھیج دیا گیا۔

نوید اقبال ابھی تقریباً" ساڑھے چار سال کے پیٹے میں تھا کہ اسے لاہور کے ایچیسن کالج میں داخلہ ملا اور لاہور کے ایچیسن کالج میں صرف پانچ سال گزارنے کے بعد وہ اپنے بھائیوں کی معیت میں انگلستان روانہ ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم آزاد اقبال نے کراچی کے مشہور ادارے گرامر اسکول سے حاصل کی اور پھر مزید تعلیم کے لئے ۱۹۶۵ء میں انگلستان روانہ ہوئے۔ ESSEX کی ایک خصوصی اقامتی تعلیم گاہ، کوپ فورڈ کیب اسکول سے آپ نے O اور A لیول کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی آف لندن سے قانون میں ایل۔ بی۔ (آنرز) کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں اپنے والد اور دادا کی طرح Lincon's Inn سے بیرسٹرایٹ لا کی سند حاصل کی۔ اس کے فوراً" بعد آزاد اقبال پاکستان واپس

آ گئے۔

کالج کے زمانے میں ہی ایک فرانسیسی لڑکی سے ملاقات ہوئی اور یوں ۱۹۷۱ء میں انگلستان میں ہی آزاد اقبال نے اپنی پسند کی شادی رچالی۔ لڑکی کا اصل نام کیتھرین تھا لیکن شادی کے موقعہ پر اس کا اسلامی نام ثمرہ رکھا گیا اور نکاح مسجد میں پڑھا گیا۔

وہ لڑکی اچھے اطوار کی تھی اور ہم لوگوں نے اسے قبول کر لیا تھا اور اس کے بطن سے یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں یاسمین اور تانیہ پیدا ہوئیں۔ لڑکی کی ماں بضد ہوئی کہ لڑکی کو پیرس یا لندن میں رکھا جائے۔ ہمیں لڑکی والوں کی یہ شرط منظور نہ تھی۔ دونوں میاں بیوی ٹھیک ٹھاک تھے۔ بس لڑکی کی ماں کی ضد اس ہنستے بستے گھر کو لے ڈوبی اور یوں دونوں میاں بیوی میں علیحدگی ہو گئی۔ دونوں لڑکیاں یاسمین اور تانیہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے نانا کے ہاں پیرس میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے نانا فرانس کے ایک شہر کے میئر تھے اور اب پیرس میں ہی مقیم ہیں۔

آزاد کو کیتھی کی جدائی بڑی شاق گزری اور وہ بڑی آزردگی اور افسردگی کے عالم میں گھر میں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا اور آخر اس کی دوسری شادی کے لئے کوششیں تیز کر دی گئیں لیکن وہ کسی لڑکی کو پسند نہ کرتا تھا۔ آخر ۱۹۸۱ء میں چودھری محمد اقبال صاحب کی لڑکی فریدہ دکھائی گئی اسے لڑکی پسند آئی اور ۱۹۸۱ء میں کراچی میں شادی ہو گئی۔ ۱۹۸۱ء میں ہی نیویارک میں نوید اقبال نے ریشماں (جو پی۔ آئی۔ اے میں ایک ایئر ہوسٹس تھیں) سے پسند کی شادی رچالی۔ ریشماں کی دوسری شادی تھی اور ان کے پہلے میاں سے ایک بارہ سالہ لڑکا تھا۔

پاکستان میں ۱۹۷۴ء میں آنے کے بعد آپ نے اپنے والد کی کامیاب قانونی پریکٹس میں شریک ہو گئے۔ آزاد اقبال کو رجسٹریشن کے لئے چیف جسٹس وجیہ الدین

صاحب نے کریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کیا۔ آزاد اقبال کو مشہور قانون داں فضل غنی صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ جو عدالت عالیہ کے سابق جج تھے۔ آزاد اقبال ابتدا میں ضلعی عدالتوں اور بعد میں عدالت عالیہ پاکستان میں پریکٹس کرتے رہے۔

آزاد کو اللہ نے بالترتیب دو بچوں جہاد اور جیہاں سے نوازا اور اب جہاد اپنی خاندانی روایات پر چلتے ہوئے لندن میں تعلیم حاصل کرنے چلے گئے ہیں۔ اس وقت علامہ اقبال کے بعد تیسری نسل قانون کی تعلیم کے لئے انگلستان میں موجود ہے۔ آزاد نے اپنے دونوں بچوں کی پیدائش کے مواقع پر اشعار کہے ہیں۔ وہ بھی اس مضمون کے آخر میں موجود ہیں۔

۱۹۸۳ء میں سعودی عرب کی علیان گروپ نامی ایک عالمی تجارتی تنظیم نے جس کے دفاتر تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آزاد اقبال کو قانونی مشیر کے عہدے کی پیشکش کی جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ آزاد اقبال نے تنظیم کے ساتھ پانچ برس گزارے اور عالمی قانون میں تجربہ حاصل کیا۔ ۱۹۸۹ء میں آپ بحیثیت قانونی مشیر بن لادن گروپ کی جانب منتقل ہوگئے اور تاحال اسی عہدے اور اسی ادارے سے منسلک ہیں۔ بن لادن گروپ عالمی تجارتی منصوبوں پر مشتمل شرق اوسط کا ایک بڑا تعمیری گروپ ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی مقدس مساجد کی تعمیر، دیکھ بھال اور توسیع بھی اس کمپنی کے ذمے ہے۔ آزاد کا فنی اور ادبی ذوق بھی قابل ذکر ہے۔ قادر الکلام شاعر ہیں۔ آزاد کی شاعری میں آپ کے دادا کے کلام کا رنگ جھلکتا ہے۔

آزاد کا دیوان انشاء اللہ حالات کے ذرا سدھرنے کے بعد جلد منظر عام پر آجائے گا آزاد نے انگریزی اور اردو شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ شعروشاعری اور فن موسیقی

سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا اور آزاد کو باقاعدہ ایک ماہر استاد کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

آزاد کی گائیکی سے خاندان کے افراد آشنا ہیں اور وقتاً" فوقتاً" شکوہ اور جواب شکوہ کی فرمائشیں کی جاتی ہیں۔ اسی کتاب میں شیخ اعجاز احمد مرحوم کا ایک خط آزاد اقبال کے نام دیا گیا ہے۔ جس میں شیخ اعجاز احمد نے آزاد اقبال سے شکوہ اور جواب شکوہ کی گائیکی اور فوٹوگرافی کی تعریف کی ہے۔

آزاد اقبال کو مذہب سے گہرا لگاؤ ہے اور اسی ذوق کی وجہ سے اپنے دادا علامہ اقبال کی طرف سے حج بدل ادا کیا۔ علامہ اقبال کو حج کا بہت شوق تھا۔ لیکن مختلف تکالیف اور عوارض کی وجہ سے اپنی حیات میں حج نہ کر سکے۔ خدا کی شان دیکھئے کہ ان کے قدموں میں بیٹھنے والے نوکر علی بخش کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت سے نوازا۔

تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ حج کو چلے جاتے تو واپس ہندوستان نہیں آسکتے تھے کیونکہ سید غلام بھیک نیرنگ نے علامہ اقبال کا عشق رسول اور آپ کے نام نامی پر رقت طاری ہونے کا منظر دیکھا تھا۔ انہوں نے بجا فرمایا تھا کہ ایسا عاشق رسول رقت کے طاری ہوتے ہی اپنی جان دے سکتا ہے۔ لہذا اگر انہیں حج کی ادائیگی کی سعادت میسر آتی تو آپ کا مرقد جنت البقیع ہی ہوتا۔ ماہر القادری اور علیم الدین صدیقی صاحب کا مدفن جنت البقیع ہی ہے۔

سعودی عرب میں تقریباً" گزشتہ دس برس سے قیام پذیر ہیں اور یوم اقبال کی تقریبات میں انہیں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا ہے اور وہ اگر ادارے کی طرف سے رخصت کی اجازت مل جائے تو ضرور ایسی محافل میں شریک ہوتے ہیں اگر کوئی مجبوری حائل ہو جائے تو اپنی تحریری تقریر بھجوا دیتے ہیں۔

آزاد اور سعودی عرب

(چند جھلکیاں)

تعارف ڈاکٹر محمد جنید پی۔ ایچ۔ ڈی

جناب آزاد اقبال شاعر مشرق علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے سب سے بڑے پوتے ہیں۔ ۱۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہ آفتاب اقبال مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ جو پاکستان کے معروف قانون داں تھے۔ آزاد اقبال پاکستانی اور برطانوی شہریت رکھتے ہیں۔ شادی شدہ اور دو بچوں جہاد اقبال اور جیہان اقبال کے والد ہیں۔ ملنسار اور بااخلاق انسان ہیں اور جدہ کی معروف سماجی شخصیت ہیں۔ آزاد اقبال نے ابتدائی تعلیم کراچی گرامر اسکول سے حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء کے عرصے میں انگلستان کے شہر ایسکس کے کوپ فورڈ گلبی اسکول سے او اور اے لیول کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی آف لندن سے ایل ایل بی آنرز کیا۔ ۱۹۷۴ء میں اپنے والد اور دادا علامہ اقبال کی طرح لنکنز ان سے بیرسٹر ایٹ لاء کی سند حاصل کی۔ اس طرح ایک طویل عرصے تک انگلستان میں قیام کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں پاکستان واپس آگئے۔ آزاد اقبال اس بات کے معترف ہیں کہ ان کی تربیت اور سیرت سازی میں ان کے والدین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کے علاوہ وہ انگلستان کے مشہور اور مستند قانون دان اور جج لارڈ ڈیننگ کی شخصیت سے متاثر ہیں ان کی کتابوں ان کے قانونی فیصلوں اور ان سے ذاتی تعارف کو اپنی تربیت میں دخیل گردانتے ہیں۔

انہوں نے اپنے پیشے کا آغاز برطانیہ کے شعبہ ماحولیات کے قانونی ادارے سے کیا پاکستان واپس آکر اپنے والد بیرسٹر آفتاب اقبال کے قائم کردہ ادارے میں شمولیت اختیار کرلی اور قانون کی پریکٹس شروع کردی۔

۱۹۸۳ء میں سعودی عرب کی علیان گروپ نامی ایک عالمی تجارتی کمپنی نے آزاد اقبال کو قانونی مشیر کے عہدے کی پیشکش کی۔ پانچ برس کے بعد ۱۹۸۹ء میں سعودی بن لادن گروپ نامی کمپنی میں بحیثیت مشیر قانونی شمولیت اختیار کرلی اور تاحال اس عہدے پر فائز ہیں۔ آزاد اقبال خود بھی شعر کہتے ہیں۔ دیوان تکمیل کے مراحل میں ہے۔ آزاد اقبال کلاسیکی موسیقی کے دلدادہ ہیں اور ایک باصلاحیت موسیقار بھی ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی کلاسیکی موسیقی میں مشہور موسیقار بابا عنایت سے باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے۔ شاعری اور کلاسیکی موسیقی کو آپ خدمت اسلام کے مقصد اور مشن کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ آپ شاعر مشرق علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے کلام میں سے خاص اجزا کا انتخاب کر کے اپنی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں کمپوز کر کے آڈیو کیسٹ پر لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آزاد اقبال وطن واپس جاکر سماجی کام بھی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لاہور میں دارالقرآن نامی تعلیمی مرکز قائم کر کے اس کام کی ابتدا کردی ہے۔ جس کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کررہے ہیں۔

وہ سیاسی عزائم نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ہر اس پارٹی کے ساتھ ہیں جو پاکستان کی ترقی و بہبود کے لئے کام کرنے والی ہو اور ایسی تمام سیاسی جماعتوں کا ساتھ دینے سے انکار کرتے ہیں جو ملک کی سالمیت اور ترقی و بہبود کے لئے نقصان دہ ہوں۔ آزاد اقبال اور ان کے اہل خانہ سعودی عرب میں گزشتہ ۱۲ برس سے مقیم ہیں اور یہاں کے بارے میں خوشگوار تاثرات رکھتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس مدت میں آپ کے دینی علم و شعور میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

آپ ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ سعودی عرب آئے تھے۔ اس وقت کے مقابلے میں آج کی شاندار سماجی، تعلیمی اور معاشی ترقی سے بے حد متاثر ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ ملک بفضل خدا ترقی کی مزید منزلیں طے کرے گا۔

اردو نیوز۔ جمعہ یکم مئی ۱۹۹۸ء

جدہ (ابو عمران) سابق سعودی وزیر اطلاعات ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے کہا ہے کہ اسلام کا پیغام مکمل ہے۔ اسلام کے نشاہ ثانیہ سے دنیا کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے انہوں نے کہا کہ علامہ محمد اقبال عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار تھے۔ ہمیں فخر ہے کہ سرزمین پاک نے علامہ اقبال ، محمد علی جناح اور مولانا مودودی جیسے انسان پیدا کیے جو ہمارا ورثہ ہیں۔ یہ سلسلہ اقبال پر نہیں رک جانا چاہئے بلکہ امت مسلمہ کو ابھی کئی اقبال پیدا کرنا ہوں گے تاکہ پوری انسانیت تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے مہران ریستوران میں پاکستان رائٹرز فورم کی یوم اقبال تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر عبدہ یمانی نے کہا کہ علامہ اقبال مغرب میں رہتے ہوئے بھی وہاں کے نظام یا لوگوں سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ہمیشہ عوام سے کہا کہ مغرب سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اقبال نے جو پاکستان بنانے کا خواب دیکھا۔ وہ قائد اعظم اور دوسرے رہنماؤں نے پورا کیا۔ انہوں نے کہا کہ علامہ نے مساوات کا سبق سکھایا۔ تقریب سے علامہ اقبال کے پوتے آزاد اقبال نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دور حاضر میں مسلمانوں کی افسوسناک صورتحال کو دیکھ کر اقبال کی روح تڑپتی ہوگی۔ آج قوم ترقی کے بجائے تنزلی کی طرف جا رہی ہے۔ آج وقت کا تقاضا ہے کہ اس لازوال شخصیت کے پیغام سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

یکم مئی ۹۸ء کے سعودیہ کے ایک مقامی پرچے میں اس تقریب کی کارروائی دی گئی ہے ،اس تقریب میں آزاد اقبال کا خطاب دیا جا رہا ہے جو ہمیں براہ راست ٹیلیفونک رابطے سے موصول ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الصلوۃ والسلام سید المرسلین

مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی (سابق سعودی وزیر اطلاعات)

وحضرات گرامی قدر!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

میرے لئے عظیم سعادت کا مقام ہے کہ علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منعقد کی جانے والی اس تقریب میں مجھے اظہار خیال کا موقعہ دیا گیا ہے۔ میں اس عزت افزائی کے لئے منتظمین کا بے حد شکر گزار ہوں اور ان کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔

آج کی شام ہم اس باکمال شخصیت کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ جنہیں پاکستان کا روحانی باپ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس دار فانی سے رخصت ہوئے انہیں ساٹھ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحانی طور پر آج بھی وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم ان کے قریب ہو رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے جو کچھ آج سے ستر یا اسی برس قبل اپنے شاعرانہ تخیل کے ذریعے دیکھا اور محسوس کیا تھا اس کا احساس آج ہمیں اپنی قومی زندگی میں ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں خصوصی طور پر اور ساری دنیا عمومی طور پر انہیں زیادہ بہتر انداز میں دیکھے گی جیسا کہ ہم آج انہیں دیکھتے ہیں۔

حضرات! علامہ اقبال کی باکمال شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ ان کو جاننے کے لئے ہمیں ایک طویل اور صبر آزما تحقیق اور ان کے اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی حالات

کے بغور مطالعہ کی ضرورت ہے جن میں علامہ نے اپنی زندگی گزاری۔ ارباب سیر اور محققین اس بات کے شاہد ہیں کہ علامہ اقبال ایک عظیم اسلامی مفکر اور جری و بے باک انسان تھے۔ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے داعی تھے۔ انہوں نے مذہبی، سیاسی اور سماجی اصلاح کے محاذ پر نہ صرف اپنے دشمنوں کی مخالفتوں کا سامنا قوت برداشت سے کیا بلکہ ان لوگوں کی مخالفتوں کا سامنا بھی کیا۔ جن سے انہوں نے مدد طلب کی۔ اور جن کی اخلاقی حمایت پر انہیں بھروسہ تھا۔ حضرات! علامہ اقبال امت مسلمہ کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کے شاعر بھی ہیں۔ دنیا کے عظیم شاعر کی حیثیت سے ان کی برتری سے انکار ناممکن ہے۔ لیکن تاریخ انسانی اور خصوصاً" فلسفہ اسلامی کی تاریخ میں انہیں زندہ جاوید بنانے والی چیز ان کی شاعری ہی نہیں بلکہ ان کی وسیع علمیت، غیر معمولی فہم و فراست، فکر کی گہرائی اور مصورانہ تخیل بھی ہے۔

حضرات! فکر اقبال کا محور اسلام ہے۔ فکر اقبال کیا ہے۔ یہ سچائی سے ان کی محبت، ذات الٰہی کا عرفان، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے والہانہ لگاؤ، نظریہ اسلامی کا پرجوش پرچار مسلمانان ہند کے سیاسی و سماجی حقوق کی بے خوف وکالت اور دنیا کے سامنے اسلام کو فکر جدید کے طور پر پیش کرنے کی بے مثال خدمت ہے۔ جس نے علامہ کو ایک مستقل مقام دیا ہے۔

میں آپ کے سامنے علامہ اقبال کی فکر کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ ایک مقام پر وہ خدا سے مخاطب ہو کر دعا مانگتے ہیں اور ہر چہ اس دعا سے واقف ہے۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

اس شعر میں زندہ تمنا کے الفاظ نہایت معنی خیز ہیں۔ زندہ تمنا دراصل ■ بیدار

احساس زندگی ہے جو خود آگاہی (SELF AWARNESS) عزت نفس (SELF RESPECT) اور کسب کمال (Achievement of Perfection) جیسے خوبصورت جذبات کے ہم آہنگ امتزاج سے پیدا ہوتی ہے میں جب خودی کو ان رنگوں میں دیکھتا ہوں جن میں علامہ نے اسے رنگا ہے تو زندہ تمنا خودی کا نقطہ آغاز بن کر نگاہوں کے سامنے ابھرتا ہے اور محو افکار ایک جست میں اس زندہ تمنا کو نقطہ معراج پر جوں دکھاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ وہ مقام ہے جہاں تدبیر و تقدیر میں خوشگوار رفاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تقدیر کا ہاتھ تدبیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ میں نے سوچ سمجھ کر زندہ تمنا کی مختصر سی تمہید باندھی ہے۔ ایک طرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندہ تمنا ہی روح زندگی ہے۔ زندہ تمنا سازگار متحرک کی صورت میں کارفرما ہوتی ہے تو زندگی حقیقی معنوں میں زندہ ہو جاتی ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو زندہ تمنا سے روشناس کیا تھا۔ اس مبارک دور میں زندگی عزت و کامرانی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ دوسری طرف یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ دور حاضر کے مسلمانوں کی افسوسناک حالت دیکھ کر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جتنی اب مسلمانوں کو زندہ تمنا کی ضرورت ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔

حضرات! علامہ اقبال کا جسم آج مٹی کا ڈھیر بن چکا ہوگا لیکن ایک شاعر، مفکر اور معلم انسانیت کی حیثیت سے ان کے روحانی اثرات زماں و مکاں کی قید سے آزاد مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کو یکساں طور پر امید، جرات اور یقین کا

روحانی فیض دیتے رہیں گے۔

حضرات! علامہ اقبال کی لازوال شخصیت کا پیغام آج بھی مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ مملکت خداداد پاکستان آج جن مذہبی ،سیاسی ،سماجی اور معاشی مسائل میں گرفتار ہے۔ وہ کسی بھی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آج ہمیں اپنی قومی شیرازہ بندی اور اسلامی جمہوری فلاحی ریاست کے حصول کے لئے فکر اقبال سے روشنی حاصل کرنے کی جتنی ضرورت ہے۔ شاید اتنی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ آج بھی اگر علامہ کے فلسفے کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ گھروں اور تعلیمی اداروں میں عام کیا جائے اور اپنی قومی زندگی میں جذب کیا جائے تو یہ انسانی تاریخ میں ایک بڑی کردار ساز قوت کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

دنیا میں شاید ہم سے زیادہ بدقسمت قوم کوئی نہ ہو گی جس کے پاس قرآن شریف جیسی عظیم کتاب موجود ہو۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جیسا عظیم ہادی وراہنما موجود ہو اور اقبال جیسا مفکر موجود ہو۔ اس کے باوجود بھی یہ قوم ترقی کے بجائے تنزلی کی طرف جارہی ہے۔ علامہ اقبال کی روح آج بھی ان کے بے چین اشعار میں تڑپ رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ اپنے گوش ودل سماعت کے لئے تیار کریں۔

آخر میں تصویر درد والی نظم کے کچھ خاص چنے ہوئے اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ علامہ کی شاعری کی نوعیت انہی کے الفاظ سے نمایاں ہو۔

پہلا شعر

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

دوسرا شعر

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگین بیانوں میں
کہ بام عرش کے طاہر ہیں میرے ہم زبانوں میں

تیسرا شعر

چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

چوتھا شعر

سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

پانچواں شعر

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

چھٹا شعر

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

ساتواں شعر

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

آٹھواں شعر

مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کرکے چھوڑوں گا

نواں شعر

پروتا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آسان کرکے چھوڑوں گا

دسواں شعر

مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کرکے چھوڑوں گا

گیارہواں شعر

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کرکے چھوڑوں گا

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

پاکستان زندہ باد۔ پائندہ باد

کلام آزاد

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

برنی صاحب نے بمبئی کے موقر جریدے (شاعر) میں آزاد اقبال کا کلام شائع کروایا۔ ۱۹۹۶ء میں علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے ترمیم شدہ ایڈیشن میں بھی کلام چھاپا اور پچھلے دنوں چوہدری ریاست علی نے سیالکوٹ کے ماہنامے "ہلال استقلال" بابت ۴ نومبر ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں آزاد اقبال کا تعارف اور کلام بھی چھپوایا۔

میں اس کتاب میں وہ کلام دے رہی ہوں جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ آزاد کے کلام کے ساتھ نوادرات میں ان کے بیٹے جہاد اقبال کی چار انگریزی نظمیں بھی شائع کروا رہی ہوں۔ جہاد اقبال آج کل اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں انگلستان میں موجود ہے۔

روح خیال

گلشن ہستی کی بس یہ مختصر روداد ہے
نغمہ بلبل جہاں ہے، وہ چمن آباد ہے
وہ شہیدوں کے لہو کی دے سکے گا داد کیا
جو گرفتار ہوس ہے، خوگر الحاد ہے
عام ہے رسمی عبادت، اس عمل کی ہے کمی
جو ہمارے دین ودنیا کی قومی بنیاد ہے
کاروان زندگی کو جستجو ایسوں کی ہے
جن کے دست وپا میں شامل سیرت فولاد ہے
بھول کر فیض رسالت خوش نہ ہوں اہل زمیں
آسماں والوں کو اعجاز محمد یاد ہے
کیسی صبح زندگی تھی، کیا ہے شام زندگی
کیا بڑوں کی شان تھی، کیا حالات اولاد ہے
عرش کی پرواز سے مانوس ہو روح خیال
ذہن کی پستی سراسر فرش کی ایجاد ہے
اور اے غافل کسے کہتے ہیں پاداش عمل
ساز فطرت سے تسلسل توڑنا بیداد ہے
دے چمن والوں کو توفیق فروغ زندگی
اے خدا یہ بلبل ناشاد کی فریاد ہے
اے مسلماں ! طائر لاہوت کا پیغام سن
قوت ایمان محکم ہے تو تو آزاد ہے

پھول اور کانٹے کی باتیں

بیانِ گل

پھول نے اک دن کہا کانٹے سے میرے ہم سفر!
آکہ میں باتیں کروں کچھ اپنے دل کی تو بھی کر!
کب سے ہیں خاموش دونوں ہم نشیں ہوتے ہوئے
کیوں نہ ہم رکھ دیں سکوتِ بے رخی کو توڑ کر!
دیکھنے والے زبانِ حال کے قائل نہیں
چاہئے مرغ تخیل کھولے اپنے بال و پر!
گو کہ ہم دونوں ہیں اجزائے متاعِ گلستاں
گو کہ ہم دونوں شریکِ زندگی ہیں شاخ پر
گاہے ہم دونوں پہ آتی ہے بہارِ گلستاں
گاہے آتے ہیں خزاں کے دور کے زیرِ اثر
کوہسار و گلستاں میں، دشت میں یا بحر میں
ہم رہے ہیں آشنا، زندہ ہے ذاتِ برگ و بر
زیست کا آئین کرتے ہیں عیاں ہر دور میں
گو کہ اس آئینِ ہستی سے ہے انساں بے خبر
ہاں مگر ہے نوعیت میری جدا، تیری جدا
یہ حقیقت ہے، اسے اے خار! تو تسلیم کر!
آج گویائی پہ اکساتی ہے توفیقِ سخن
میں کہاں تک ٹھیک ہوں، یہ تو بتا دے سوچ کر

اس جہاں میں ہے تشخص مختلف ہر چیز کا
بعض کا کردار ہوتا ہے زیادہ معتبر
دیکھنا یہ ہے کہ ہم دونوں میں بہتر کون ہے۔
مجھ سے گل پر باغ نازاں ہے کہ تجھ سے خار پر !
میں پیام حسن ہوں رنگوں میں ہے میرا نمو
چشمہ خوشبو میرا رکھتا ہے کوثر کا اثر !
زندگی کی اوج گاہوں میں ہوں خرم میں ادھر
تو تجرد کا قلندر خار بیٹھا ہے ادھر !
تیری ذات مضطرب تو خوگر تنہائی ہے
میری صورت سے عیاں شان خدا ، علم وہنر !
ہے اگر تیری نگاہوں میں جراحت ایک فن
میری پتی کاٹ تو سکتی ہے ہیرے کا جگر
ورنہ بالکل بے ضرور ہے میرا نازک سا وجود
تیری فطرت میں مگر ہے سب کو پہنچانا ضرر !
میری فطرت میں ہے جھکنا شان قدرت کے لئے
تیری فطرت میں اکڑ کر بیٹھنا ہے شاخ پر !
آخرش کس بات پر اکڑا ہوا رہتا ہے تو۔
کیا سمجھ بیٹھا ہے تو خود کو زور آور ، بھول کر۔
کیا تجھے گوشہ نشینی کا بھلاوا تو نہیں۔
کیا ملے گا خشک صوفی کا لبادہ اوڑھ کر۔
ظاہر وباطن ہے میرا ایک جیسا بالیقین !
میں دکھا دیتا ہوں سب کو اپنا سینہ کھول کر !

میرے چہرے سے عیاں ہے صنعت حسن ازل
دور تک جاتا ہے میری خاص خوشبو کا اثر !
تیری صورت دیکھنا کس کو گوارا ہے۔ بتا !
لوگ سینے سے لگا لیتے ہیں مجھ کو ، چوم کر
تیری یکسوئی کا عالم کچھ سمجھ آتا نہیں۔
جس طرح ہم رنگ ہوں تیرے لئے شام و سحر !
آمد خورشید کی کرتا ہوں میں آؤ بھگت
میرے چہرے پر چمک ہوتی ہے اس کو دیکھ کر
کتنا دل کش ہے نظارہ پردہ مشرق سے جب
رات کی تاریکی سے ہوتا ہے سورج جلوہ گر
اک سرور و ولولہ اٹھتا ہے جسم و جاں پر
غنچہ خوابی کو زندہ کرتا ہے آب شکر !
ہر سبوئے کو کب غنچہ میں کھل جاتا ہے رنگ
خاک پر بیٹھے ہوئے ہے عرش پہ سب کا گزر
ذرہ ذرہ گلستاں کا ہوتا ہے محو وضو
پاک ہو جاتا ہے شبنم سے ہر ایک پھول و شجر
میں وضو کرتا ہوں خالق کی عبادت کے لئے
قطرہ شبنم نہیں ٹلکا ہے تیری نوک پر !
طائروں سے داد پاتا ہے مرا حسن عمل !
خوشنوا نغمے فضا میں گونجتے ہیں جھوم کر !
رفعت خالق بسی رہتی ہے میرے قلب میں
آسماں کو چومتی ہے اس لئے میری نظر !
دیکھتا جاتا ہوں جب تک دیکھنا آسان ہے"

شام تک بیدار رہتا ہے مرا ذوق نظر!
میرے دم سے فائدہ ہے حضرت انسان کو
میرے ہی دم سے معطر ہے فضائے بام و در
کی وفا میں نے ہمیشہ حضرت انسان سے
ساتھ اس کی موت میں اور ساتھ اس کے عمر بھر
میں تبرک ہوں خدا کی ہر عبادت گاہ کا
اس قدر میرا وجود بے ریا ہے معتبر!
میرے ہی دم سے ہیں رنگیں سب روایات ادب
میں ہی رہتا ہوں مسلط شاعروں کے ذہن پر!
میں نے بخشا ہے جہاں کے شاعروں کو فلسفہ
ہوں خیالوں میں نہاں میں، ہوں کتابوں میں امر
میں مریضوں کو دیا کرتا ہوں پیغام شفا!
کتنے نسخے بنتے رہتے ہیں میرے ہی نام پر!
میں مٹھاس شہد ہوں میں شوخی حکمت بھی ہوں
روشنی ہوں، جیسے میری روشنی شمس و قمر
میکدہ باغ میں میں ہوں شراب میکدہ
قدسیوں کا ہار ہوں، دہقان محنت کا ثمر
ناز والے شوق سر پہ بٹھاتے ہیں کسے۔
کس کی ہوتی ہے نمائش گیسوئے خم دار پر۔
کون ہے نقش ظرافت، ارمغان انجمن۔
کون ہے تصویر عشرت، باغبانوں کا گہر۔
اہمیت کس کی زیادہ ہے، ہتا اے خار تو۔
میں کہ تو ہے اس جہاں میں مرکز ذوق نظر۔

جواب کانٹا

غور سے سنتا رہا کانٹا یہ گل کی داستاں
تھی متانت اس کے انداز سماعت سے عیاں

تھا جواب گل ضروری اس لئے اس نے کہا
"واقعی تو نے دکھایا ہے مجھے زور بیاں

یوں تو تو نے خود ستائی اپنی کی ہے زور سے
کم نگاہی سے مجھے دیکھا ہے تو نے بے گماں!

اہل دل کو بس یہی خامی کبھی بھاتی نہیں
کم نگاہی سے ہوا کرتا ہے اپنا ہی زیاں

کم نظر ہرگز حقیقت آشنا ہوتا نہیں
کم نظر ہی دوسرے لفظوں میں ہے ناقدر داں!

یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں رہے ہیں ہم سفر
رشتہ محکم ہمارا ہوچکا ہے جاوداں

تیری فطرت سے درخشاں ہے ثبات رنگ وبو
کاروبار باغ ہے تیرے تبسم سے رواں

مانتا ہوں میں کہ تو ہے زینت گلشن مگر
بھول ہے تجھ کو کہ تیرا درجہ ہے مجھ سے گراں

گر کبھی خلوت میسر ہو تو چشم نور سے
دیکھ اس ہمسایہ زاہد کی جانب تو یہاں

غور سے سن آج میرا تصنیفات فلسفہ

کس قدر ہیں فرق گہرے تیرے میرے درمیاں
ہم نشیں کہتے ہوئے ہلکا بنایا ہے مجھے
میں تو ہوں دراصل تیرا پاسدار وپاسباں!
یہ حقیقت ہے تو کیا ہم یہ بھی کہہ سکتے نہیں۔
تو بہار باغ، میں وجہ بہار گلستاں!
تو پیام حسن ہے میں ہوں پیام پختگی
تو چراغ نور، میں انگارہ آتش فشاں!
حسن ہے تجھ میں اگر، مجھ میں ہے تاب زندگی
عارضی ہے حسن، تاب زندگی ہے جاوداں!
موسم گل میں ہوا کرتے ہیں دونوں ہم سفر!
یہ بتا اے گل کہ ہوتا ہے خزاں میں تو کہاں۔
اس سے یہ ثابت ہوا میں ہوں زیادہ معتبر!
عارضی سے حسن پر کیسے ہو نازاں گلستاں۔
واقعی میری نظر میں ہے جراحت ایک فن
آبلہ پاؤں پہ روشن ہے میرا فیض رواں!
لیٹ جاتا ہوں زمین پر، تو نے کیا دیکھا نہیں۔
تا نہ پہنچے بے خبر راہی کو مجھ سے کچھ زیاں
جس کو کہتا ہے اکڑ تو، وہ ہے فرض منصبی!
اس پہ کیوں آئین قدرت کا نہیں ہوتا گماں۔
اے گل ناداں! میری انگلی ہے سوئے آسماں

میں گواہی دے رہا ہوں ، ایک ہے رب جہاں !
خشک صوفی یا قلندر کی جگہ اے گل ! تجھے
کاش ملتا میری ہستی میں مجاہد کا نشاں
پڑھ جسارت کا صداقت کا شجاعت کا سبق
ہے یہی تاریخ ہجرت کے شراروں کا نشاں
میری فطرت نے مجاہد کو دیا جنگوں میں دم
ہوں مجاہد کا میں خنجر ، عظمتوں کا آستاں
ہے میرا کردار دینا حوصلوں کا امتحاں
تجھ کو کیا معلوم کہ ہوتا ہے کیا ضبط فغاں
ہے میری تاثیر میں ہر سمت جذبہ ظفر
مضطرب ملتفت ہوں فکر فردا کی زباں
چاک سینہ پیش کرتا ہے غلط انداز میں
اس میں وحشت کا اثر ہے ، جو ہے بالکل رائیگاں
تیری صورت سے عیاں ہے۔ صنعت خالق اگر
میری صورت بھی تراشی ہے اسی نے بے گماں !
آدمی کا دیکھنا نہ دیکھنا ، کیا شرط ہے۔
آدمی سے لاکھ قدرت کے کرشمے ہیں نہاں !
میری یکسوئی کا عالم کیوں سمجھ آتا نہیں!
اہمیت شام وسحر کی کچھ نہیں میرے یہاں !
آمد خورشید ہو یا رخصت خورشید ہو

مرکز انوار ہے میرے لئے رب جہاں!
قطرہ شبنم کا ٹکنا تو نہیں شرط وضو!
کون کہتا ہے کہ میں ہوتا نہیں تسبیح خواں۔
خوشنوا نغمے فضا میں گونجتے ہیں صبح دم
وہ نہیں ہے داد تیری، حمد ہے، اے کج گماں!
میری فطرت میں نہیں جھکنا کسی کے سامنے
ہے کوئی مسجود میرا تو خدائے مہرباں!
شام تک بیدار رہتا ہے ترا ذوق نظر
میری انگلی کا اشارہ مستقل ہے، بے گماں!
ذکر تیرا شاعری میں، فلسفے میں، ہے بجا
میں قلم ہوں وہ، امر جس نے کیا تیرا بیاں
شاعروں نے بے وفا تک کہدیا اے گل تجھے!
میرے دامن تھام لینے پر ہے شعروں میں بیاں
عاشقانہ صحبتوں میں تو چراغ عشق ہے
میں ضمیروں کی نوا ہوں، فطرتوں کا راز داں
نازش میخانہ جام چمن ہے تو اگر
میں خمار جام بھی ہوں اور ہوں پیر مغاں
تیرا سوز وساز ہے مضراب بلبل کے لئے
میرے نغمے سننے والے ہیں" زمین وآسماں
خوگر آب شکر تو، خوگر ساحل بھی تو

میں درونِ بحر میں رکھتا ہوں اپنا آشیاں
تیرے سینے میں رواں ہے اک حریری آب جو
میرے سینے میں ابلتا ہے لہو قوت فشاں
حسن کا زنداں ، شکارِ غفلتِ دنیا ہے تو
ہے محافظ کون تیرا بول جانِ ناتواں !
آہ غافل ! تو چمکتا جھلملاتا طفل ہے
میں تجرد کا ولی ہوں ، دانائے علم نہاں
تو سمجھتا ہے کہ تیری ہی نظر ہے کو بکو
ہے اجاگر دید میں میرے بھی نورِ کہکشاں
زندگی ہر پھول کی ہوتی ہے بالکل مختصر
موت ہے ہمراہ میرا آئے طوفاں یا خزاں
پوچھ انسان سے ، سکھائی کس نے تدبیرِ رفو !
تیری لاعلمی کے باعث ہے مضر نوکِ زباں !
خود ستائی سے نہ کر ارزاں عبادت گاہ کو
بھول مت کہ حق شناسی کی ضرورت ہے وہاں !
تو نمائش کو سمجھتا ہے متاعِ زندگی !
جو برائے مقصدِ ہستی ہے بالکل رائیگاں
تو نہیں اے گل ! رموزِ خیر و شر سے باخبر !
لب کشائی ہو مناسب تو اگر ہو راز داں !
میں کہ تو ، کی الجھنوں سے باز آنا چاہیے
چاہیے توفیق جو دیتا ہے ربِ دو جہاں !
کون سی تو بھول میں بیٹھا رہا ہے صبح شام
ہیں جہاں کچھ اور بھی جن میں ہیں لاکھوں امتحاں !

وقار اقبال

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ہم اپنے فرزند آزاد اقبال کو لے کر ساہیوال سے کراچی پہنچے تو آفتاب صاحب کا وکالت کا دھندہ اچھا خاصا چل نکلا اور ہمیں اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ اور ۱۹۴۸ء میں اللہ نے ہمیں وقار اقبال سے نوازا تو اس بچے کے مبارک قدموں نے دولت کی فراوانی کو اتنا بڑھایا کہ میرے پاس قدرت کی بے پایاں عنایات اور احسانات کی شکر گزاری کے لئے مناسب الفاظ نہیں۔

میری بہن وحیدہ روشن شاعرہ ، ادیبہ ، سماجی کارکن اور ماہر تعلیم تھیں۔ اعلیٰ اسناد کی حامل تھیں اور انہوں نے میرے بچوں کے ناک نقشوں کی مناسبت سے ان کے عرفی نام تجویز کئے تھے۔ آزاد اقبال موٹا تازہ اور خوبصورت اور قبول شکل تھا۔ اس زمانے میں بسکٹ کے ڈبے پر ایسے صحت مند بچے کی تصویر دیکھ کر بہن نے آزاد اقبال کو بسکٹ کا عرفی نام دیا اور وقار اقبال کے چہرے مہرے کو دیکھ کر اس پر کسی ترکی جرنیل کا گمان گزرتا تھا۔ لہذا اسے پاشا کے عرفی نام سے نوازا۔ ہمارے ملنے والے ہمارے بچوں کو عرفی ناموں سے زیادہ پکارتے ہیں۔ نوید اقبال کا عرفی نام سپر د ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرفی ناموں پر چند کلمات ادا ہو گئے اور چونکہ وقار اقبال کے انتقال پر میری مرحومہ بہن نے ایک مرثیہ کے انداز میں نظم کہی ہے اور اس میں وقار نہیں پاشا ہی کا نام لیا گیا ہے

جب اسکول کی عمر کو پہنچے تو وقار کو آزاد کے ساتھ گرامر اسکول میں داخل کروادیا وہاں ان کا وقت پڑھائی میں کم اور شرارتوں میں زیادہ صرف ہوتا تھا لہذا گرامر اسکول سے کسی دوسرے اسکول میں داخل کروالیا۔ وہاں بھی وہ خاطر خواہ طریقے سے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ آخر اسکاٹ لینڈ کے ایک مخصوص ادارے میں انہیں داخل

کروانے کا منصوبہ بنا۔

اسکاوٹ لینڈ کی سردی نے ان کو کافی پریشان کیا اور انہیں نمونیہ کا حملہ ہوا اور ان کی صحت کافی متاثر ہوئی۔ ان کی صحت کی خرابی کی بنا پر انہیں اسکاوٹ لینڈ سے واپس بلالیا گیا۔

گھر پر ٹیوشن کا انتظام کیا گیا اور وقار اقبال کے ماموں مرزا اختر بیگ صاحب انہیں پڑھانے لگے۔ اس ٹیوشن کی بنا پر وقار اقبال اس قابل ہوئے کہ ■ میٹرک کا امتحان دے سکیں۔ پھر مزید تعلیم کے لئے اس پر زور نہیں دیا گیا۔

وقار اقبال مذہبی تعلیم پر زیادہ توجہ دینے لگے ان کا میلان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ وہ مذہبی باتوں میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور وظیفے پڑھنے کا بھی اسے کافی شوق تھا۔ اس کے پاس پانچ سو دانے کی ایک تسبیح تھی جس پر وہ عموماً" مختلف وظائف کا ورد کیا کرتا تھا

آہ پاشا

زندگانی دوسرے لفظوں میں ہے عمر رواں
اور اس کی منزل مقصود مرگ ناگہاں
غور سے دیکھیں تو ہے طرفہ تماشا زندگی
موت کی زد سے نہیں بچتا کوئی پیر وجواں
کچھ سمجھ آتی نہیں آئین، ہستی کی مجھے
مقصد قدرت یقیناً ہے کوئی راز نہاں
اس جہان رنگ وبو میں ہے مسافر آدمی
موت وہ منزل ہے، رکتا ہے جہاں ہر کارواں
زندگی اک امتحان ہے آدمی کے واسطے
بعد مرنے کے نتیجہ اس پہ ہوتا ہے عیاں
کامیاب زندگی ہے، جسم خاکی چھوڑ کر
روح کا طائر اگر جنت میں پائے آشیاں
یہ پتہ پرواز کرنے پر چلے گا روح کو
کتنے درجے ہیں زمین وآسماں کے درمیاں
یوں تو ہر انسان یہاں آتا ہے، جانے کے لئے
موت لیکن نوجوانی کی گزرتی ہے گراں
آہ پاشا! تھا سفر گلشن میں تیرا مختصر
گھومنا تیرا رہا پھولوں کے اکثر درمیاں
تو نے دیکھی ہے بہت ہی کم بہار زندگی

کاش گلشن میں نہ آجاتا ابھی دور خزاں
آزمائش عہد طفلی میں بہت قدرت نے کی
باوجود اس کے تجھے پایا ہمیشہ شادماں
تیری دلجوئی ہمیشہ کی تیرے ماں باپ نے
پرورش تیری بہت عمدہ ہوئی تھی بے گماں
یہ گھرانا ناز ونعمت کا حسین گہوارہ تھا
حق تعالٰی نے دیا تھا ساز گاری کا سماں
تو میرے بچپن کا ساتھی ، ہمدم خوش دل بھی تھا
وہ تیری باتیں مسرت خیز بھولیں گی کہاں
تیری صورت تیری رونق ہے نظر کے سامنے
آہ پاشا ! تیرے دم سے تھیں بہت رنگینیاں
تیری ان باتوں کو جس میں دل کشی موجود تھی
ہم بنا لیتے ہیں اکثر ان کو زیب داستاں
وہ پرانی محفلیں وہ ساز و نغمے یاد ہیں
چل بسا تو چھوڑ کر پیچھے سنہرا گلستاں
تیرے جانے کا اثر صحن تخیل پر ہوا
جیسے گلشن پر مسلط ہوگیا رنگ خزاں
اے میرے پاشا ! مرے بھائی مرے قلب وجگر
دے گیا ہے تو مجھے اک زخم فرقت کا نشاں
یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے

ابرِ غم چھائے تو سیلِ اشک ہوتا ہے رواں
دشتِ تنہائی میں اک روتا ہوا راہی ہوں میں
صبر سے محروم ہوں ، آساں نہیں ضبطِ فغاں
جبکہ تو رخصت ہوا ہنستے ہوئے گاتے ہوئے
روح تیری نغمہ زن ہوگی درونِ آسماں
تو نے چھوڑا یہ جہاں جنت میں جانے کے لئے
ایسی جنت جس میں ہوتی ہے بہارِ جاوداں
ایسی جنت پھل جہاں ہوتے ہیں لذت آفریں
ایسی جنت حور و غلماں پائے جاتے ہیں جہاں
ایسی جنت ذکر جس کا ہے کلام اللہ میں
ایسی جنت جس میں ہیں بس خوبیاں ہی خوبیاں
تو جگہ پائے رسولِ پاک کے جھنڈے تلے
ہیں خوشا ارواح بھی تیرے بزرگوں کی وہاں
جو قریبی رشتہ داروں نے سنائی ہی مجھے
موت کی چھوڑی ہے تو نے اک نرالی داستاں
سیر کی، بستر پہ لیٹا، نیند آئی، سو گیا
بس اسی حالت میں آیا انقلابِ جسم و جاں
یعنی بالکل پرسکون حالت میں تو نے جاں دی
دیکھنے میں اتنی آسان موت آتی ہے کہاں
تیری پوشیدہ صلاحیت اجاگر ہوگئی

چن لیا اللہ نے تجھ کو سمجھ کر ارمغاں
ہر طرف تیری لحد کے اک عجب خوشبو سی ہے
اس سے ظاہر ہے کہ راضی ہے خدائے مہرباں
اے وقار اقبال آکر خواب میں مجھ کو بتا
تیری دنیا میں ہے، کیسی صورت حفظ واماں
تاکہ حاصل ہو تسلی اس دل مغموم کو
تیرا مژدہ بن سکے گا باعث آرام جاں
سایہ رحمت میں تیری روح کو رکھے خدا
دل سے جو نکلے دعا جاتی نہیں وہ رائیگاں
ہے دعا میری تجھے ایسا ٹھکانہ مل سکے
دیکھ سکتا ہو جہاں سے تو فراز لامکاں
لا مکاں وہ ہے جہاں ذات خدا ہے، جلو گر
تجھ کو حاصل ہو سکیں نور خدا کی جھلکیاں
روح کو پروان چڑھتا ہے، خدا کے نور سے
یہ حقیقت عین ممکن ہے کہ ہو تجھ پر عیاں
یاد تیری منسلک ہوگی دل آزاد سے
سلسلہ جس سے دعائے خیر کا ہوگا رواں

آزاد اقبال آزاد

ڈاکٹر نوید اقبال

علامہ اقبال کے فرزند اکبر جناب آفتاب اقبال کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نوید گل مینشن اسٹریچن روڈ کے ایک فلیٹ میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ء تک لاہور کے ایچیسن کالج میں تعلیم پائی۔ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ایک بارہ سالہ لڑکا کس طرح کالج میں جاسکتا ہے۔ ایچیسن کالج میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہے۔ نوید ابھی پانچ سال کے پیٹے میں نہ تھے کہ انہیں ان کی ذہانت کی بدولت ایچیسن کالج لاہور میں داخلہ مل گیا۔ لاہور میں نوید کی خالہ وحیدہ روشن مرحومہ رہتی تھیں اور ماموں بھی رہتے تھے۔ ہماری رہائش کراچی میں تھی اور کبھی کبھار کی چھٹیوں میں نوید اپنی خالہ وحیدہ روشن کے ہاں روشن ہاؤس چلے جاتے تھے۔ آفتاب اقبال صاحب کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی اولاد کو بہتر اور معیاری تعلیم سے آراستہ کریں تاکہ وہ شاہراہ حیات پر پروقار طریقے سے گامزن ہوسکیں۔ ان کی نگاہیں مستقبل پہ لگی تھیں کہ پاکستان اور دنیائے عالم میں صرف تعلیم یافتہ انسان ہی سرخرو ہوں گے۔ ان کی ذات سے دوسرے لوگ استفادہ کریں گے اور وہ خود تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر معاشی بدحالی سے اپنا دفاع بھی کرسکیں گے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا سکیں گے۔

۱۹۶۴ء میں نجانے کس اشارے پر وہ اپنے بڑے بیٹے آزاد اقبال کے ساتھ اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی انگلستان لے کر چل دیئے۔ وقار اقبال تو پہلے ہی اسکاٹ لینڈ کے ایک اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ انگلستان کے ایک اسکول میں داخلہ دلوادیا۔ اس اسکول میں نوید چار سال تک زیر تعلیم رہے اور بعد ازاں انہیں مزید تعلیم کے لئے Harrow میں داخلہ لیا اور تقریباً" پانچ سال تک اس اسکول میں گزارے۔ اس

اسکول میں صرف اعلیٰ اور اونچے لوگوں کے ہی بچے تعلیم حاصل کرتے تھے اور کئی مایہ ناز سیاستدان اور برطانیہ کے وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل بھی اسی اسکول کے فارغ التحصیل تھے اور ۱۹۷۳ء میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری کے لئے لندن یونیورسٹی سے منسلک کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۷ء میں معاشیات میں بی۔ آنرز) کی ڈگری لی۔

تقریباً" تیرہ سال تک حصول تعلیم کے لئے لندن میں قیام رہا اور پھر مزید علم کا شوق انہیں فرانس لے گیا۔ فرانس میں نوید نے G.D.M یعنی گریجویٹ ڈپلومہ ان مینجمنٹ حاصل کیا اور تقریباً" فرانس میں دو سال تک قیام پذیر رہے۔

۱۹۷۹ء میں نوید نے U.S.A یعنی امریکہ کا رخ کیا اور ریاست کیلیفورنیا کی یونیورسٹی سے بین الاقوامی امور میں ایم۔ اے کی ڈگری لی اور پھر اسی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے حامل ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں امریکہ میں ریشماں سے شادی ہوئی اور ماشاالله جہانگیر اقبال اور فرح اقبال دو بچے ہیں اور آج کل اسلام آباد میں اپنے ذاتی بنگلے میں رہائش پذیر ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں نوید اپنے وطن عزیز پاکستان پہنچے اور تقریباً" حصول تعلیم کے لئے دیار مغرب میں ۲۳ سال کا عرصہ گزار لا۔

وطن عزیز میں اپنی تحقیقی صلاحیت کو مزید جلا بخشنے کے لئے نوید ۱۹۸۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور وہ یونیورسٹی کے بین الاقوامی تعلقات کے ایریا سینٹر برائے یورپ میں لیکچرار مقرر ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ Consultancy کے نام سے اپنا نجی ادارہ قائم کیا جس کا مقصد غیر ملکی کمپنیوں کو سرمایہ کاری کے لئے ترغیب دینا اور مناسب طریقے سے رہنمائی کا فریضہ انجام دینا تھا۔ ۱۹۸۹ء میں ہی نوید ایک غیر وابستہ صحافی کی حیثیت سے مختلف انگریزی زبان کے جرائد میں اپنے مضامین چھپوانے کا کام شروع کیا۔ انگریزی

روزناموں اور جرائد میں اپنی نگارشات کو چھپوانے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں کتب نویسی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نوید کے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں علاقائی تنظیموں کو زیر بحث لایا گیا تھا اور اسی کی مناسبت سے آپ نے اپنی علمی بصیرت کی روشنی میں ایک ایسا بصیرت افروز نتیجہ اخذ کیا جس کا تصور کسی ذہن میں پہلے موجود نہ تھا۔ اس کے نزدیک پاکستان جنوبی ایشیا کا حصہ نہیں بلکہ اسے اپنے مغرب میں بسنے والی اقوام اور وسطی ایشیا کی مسلم جمہوریتوں کے اندر شامل ہونا چاہئے۔

یوں ان جمہوریتوں کے درمیان دوستانہ وبرادرانہ مراسم کا احیا کر کے قانون اور رسم ورواج کی پاسداری کرتے ہوئے اس رشتہ اخوت کو استحکام بخشنا چاہئے۔ یاد رہے کہ نوید کی سوچ کے زمانے میں ان جمہوریتوں پر سوویت یونین کا تسلط تھا اور وسطی ایشیا کی یہ جمہوریتیں آزادی کی نعمت سے محروم تھیں۔

باہمی بھائی چارے کے ناطے ترکی ،ایران ،افغانستان ،پاکستان اور ان وسطی ایشیا کی چھ جمہوریتوں کو منسلک کیا جا سکتا ہے۔

اب نوید اس تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں کہ مذکورہ بالا جمہوریتوں کو باہم ملا دیا جائے اور یوں اپنے دادا جان علامہ اقبال کے اسلامی فلسفہ زندگی کے احیا کے لئے پاکستان کے معرض وجود تک مساعی کو نہ روکا بلکہ اس فلسفے کے دائرے کو ملک کے مغرب میں بسنے والی اقوام تک بڑھا دیا جو خوش قسمتی سے دامن اسلام سے وابستہ ہیں۔

اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نوید نے ایک جدید اصطلاح Hilal Territories استعمال کی ہے۔ جو اس کا نقطہ آغاز ہے اور اگر نوید کی مساعی کو عملی جامہ پہنانے کے اسباب میسر آ گئے تو زوال پذیر امت مسلمہ کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ ماضی میں باہمی چپقلش اور ریشہ دوانیوں کے ہاتھوں سرزمین اسپین ،

حیدر آباد دکن اور گجرات کاٹھیاواڑ جیسے خطے دوسروں کے تسلط میں چلے گئے۔ کشمیر کے حصول کے لئے ہزاروں قربانیوں کے باوجود ابھی تک منزل کا نشان نہیں مل رہا۔ دنیا کے کئی خطوں میں مسلمان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

اس مرحلے میں ڈاکٹر نوید United Nations of Hilal کے مقام پر آگئے ہیں اور اس کی نظر میں علامہ اقبال کا نظریہ صرف پاکستان کی تشکیل تک محدود نہ تھا بلکہ وہ اسے نکتہ آغاز قرار دے کر ایک وسیع عالمی مملکت کے داعی ہیں۔ وہ ایک مستحکم اسلامی بلاک تشکیل دے کر اس بین الاقوامی سیاست اور معیشت میں فعال کردار انجام دینے کے متمنی ہیں۔ اب نوید کی نظریں اس بات پر جمی ہوئی ہیں کہ اس کی مجوزہ تنظیم میں پاکستان کا مستقبل روشن اور تابناک ہو اور اکیسویں صدی کا آغاز مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور دوبارہ دنیا میں خوشحالی کے دور کی ایک نوید ہو۔

اپنے نظریے کی تشہیر کے لئے نوید نے بیڑا اٹھایا کہ ابتدائی طور پر موقر انگریزی جرائد میں اپنے مضامین کا سلسلہ شروع کرے اور اس کی آواز وطن عزیز کے تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچے اور پھر اس کی بازگشت کم تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی سنائی دے۔ اس ضمن میں نوید کے مضامین Dawn, Nation & Global Magzine اور دیگر روزناموں میں وافر تعداد میں چھپ چکے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی اداروں کے تحقیقی رسائل میں بھی نوید کی تحریریں چھپ چکی ہیں۔

کتابوں کے سلسلے میں نوید نے تقریباً" تین کتابیں قلم بند کی ہیں۔

1. International Relation Scholars in General
2. United Nation of Hilal.
3. Towards understanding Japan Current Affairs.

نوید نے کتابوں کے علاوہ پاکستان کے مختلف اداروں میں لیکچرز کا آغاز کیا ہے نوید

نے ٹیلیویژن کے پروگرام میں حصہ لے کر خلیج کی جنگ ،پاکستان بھارت تعلقات اور مسئلہ کشمیر پر اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ بین الاقوامی نشریاتی ادارے Voice of America & B.B.C اس کے مضامین پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ نوید کے عالمانہ کام کو پاکستان کے پالیسی ساز اداروں نے پڑھا اور پرکھا ہے اور اس بات کے کہنے میں باک نہیں کہ یہ ادارے اپنے خارجہ امور اور اقتصادی امور میں نوید کی United Nations of Hilal تجاویز سے مستفید ہوئے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں Consultancy کا دفتر نوید نے اسلام آباد منتقل کر لیا اور وہاں اس کے ایجنڈا کے لئے سرگرم عمل اور سفارشات کو Globe میں شائع کروایا ہے۔ اس ضمن میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں ذرائع آمدورفت کے لئے سڑکیں ،شاہرائیں ،ہوائی رابطے اور ریل کی پٹری بچھانے کا کام شروع کیا جائے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ان ممالک کے مابین ثقافتی اور تعلیمی وفود کے تبادلے کے ساتھ ساتھ علاقائی بمہ کمپنیوں اور بنکوں کی ترقی کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

Consultancy کا قیام یہ سوچ رکھتا ہے کہ مذکورہ بالا اہداف کو حاصل کرنے کے لئے غیر ملکی کمپنیوں کو ایسی ترغیب دی جائے کہ وہ ہمارے پروجیکٹس کی تکمیل میں حصہ لیں اور یوں یہ ادارہ عالمگیر شہرت کا حامل ہو اور دنیا کے دکھی مسلم ممالک اس کے سائے تلے امن اور آتشی کی زندگی گزار سکیں۔

میں انتہائی دکھ کے عالم میں قارئین کرام سے درخواست کروں گی کہ وہ اللہ کے حضور اپنے ہاتھ دعا کے لئے بلند کریں اور میرے اس فرزند ارجمند کی صحت اور تندرستی کے لئے تہ دل سے بھیک مانگیں۔ اللہ تعالیٰ آپنے حضور کے صدقے میرے اس لائق وفائق فرزند کو ملک کی بہتری اور بہبودی کے لئے صحت کی دولت سے

نوازے اور اسے ملک کی خدمت کے لئے صحت عاجلہ وکاملہ سے نوازے۔

پچھلے کچھ عرصے اس کی طبیعت علیل سی رہنے لگی ہے اور ڈاکٹروں کی سمجھ میں اس کی بیماری نہیں آرہی۔ بے تحاشا ادویات کے استعمال نے بھی اس کی صحت کو کافی متاثر کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نوید اقبال اپنے اہل وعیال کے ہمراہ

جون 1999ء

رشیدہ بیگم کا شجرہ نسب

بابر بادشاہ

دولت بیگ
(1680-1740ء) تقریباً

3-4 شخصیات کے بعد

غفار بیگ

ستار بیگ (1816-1870ء)

نواب بی بی (زوجہ اسمٰعیل بیگ)

اسمٰعیل بیگ (1836-1916ء)

روشن بیگ

احمد بیگ

منظور بیگ

3 لڑکیاں

افضل بیگ

اختر بیگ

اصغر بیگ

امجد بیگ

وحیدہ پروین روشن

رشیدہ بیگم

مجیدہ بیگم

اسلم بیگ

محمود نظامی

مسعود بیگ

خالد بیگ

زاہد بیگ

معروف بیگ

3 لڑکیاں

آفتاب اقبال کے سسرال

مرزا دولت بیگ

مرزا دولت بیگ، جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء - ۱۷۱۲ء) اور بہادر شاہ (۱۷۱۲ء ۱۷۰۷ء) کے عہد حکومت میں خان دوراں یعنی گورنر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مرزا صاحب، جہاندار شاہ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ اس مناسبت سے انہیں کوکہ خان کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرض کردوں میں اٹھارویں صدی کے لوائل کے مشہور مورخ خافی خان کی تاریخ سے یہ واقعات نقل کر رہی ہوں لہٰذا ان کی صداقت سے مفر نہیں۔

دولت بیگ ترکمانی مغل تھے۔ بیرم خان بھی ترکمانی مغل تھے۔ بابر کے ساتھ، بیرم خان کے علاوہ اور بھی ترکمانی مغل ہندوستان آئے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت کے وقت، افغانستان پر مرزا نذر محمد حکمران تھے۔ مرزا صاحب کا بیٹا ہندوستان چلا آیا اسے بڑے اعزاز کے ساتھ خان دوراں یعنی گورنر کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا گیا۔ پھر خان دوراں کا عہدہ موروثی حیثیت اختیار کر گیا۔ مرزا دولت بیگ کا شجرہ نسب جاننے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی۔ مرزا دولت بیگ کا ہیڈ کوارٹر اورنگ آباد تھا۔ جب فرخ سیر اور جہاندار شاہ کی افواج ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں تو شہزادے کی سرپرستی دولت بیگ کے سپرد ہوئی۔ فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو شکست دی۔ دولت بیگ، شہزادے کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مرزا دولت بیگ کا سارا مال واسباب غصب کر لیا گیا۔ اس مال واسباب کی فہرست پڑھ کر دولت بیگ کی لمارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس

فہرست کی ایک نقل میری دادی جان نواب بیگم عرف ماں جی کے پاس تھی۔ اس فہرست کے آخری حصے میں فرخ سیر کی شاہی مہر ثبت ہے۔

مرزا دولت بیگ کا خاندان ، فرخ سیر کے خوف سے روہیلہ جسے سری گوبند کہتے ہیں۔ میں سکونت پذیر ہوا۔ مرزا ستار بیگ ، اپنے بیٹے اسماعیل بیگ کو لے کر جالندھر آ بسے۔ فرخ سیر کا زمانہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ افراتفری کے عالم میں لوگ اپنی جانوں کی حفاظت کے لئے دور دراز مقامات کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

اپنے بیٹے اسماعیل بیگ اور بہو نواب بیگم (عرف ماں جی) کو جالندھر چھوڑ کر خود ستار بیگ صاحب روہیلہ واپس چلے گئے۔ ہمارا آبائی گھر محلہ جھنڈا پیر جالندھر (بھارت) میں ہے۔

میرے دادا اسماعیل بیگ صاحب نے کسب معاش کی خاطر درزی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ انگریز شاہی خاندان کے افراد کو موت کی وادی میں دھکیلنے کا کام بڑی ہوشیاری سے انجام دے رہے تھے۔ شاہی خاندان کے افراد نے چھوٹے موٹے دھندے اپنا کر اپنی زیست کو برقرار رکھنے کا منصوبہ تیار کیا لیکن پھر بھی ہندو اور سکھ مخبروں کی مخبری کی وجہ سے موت کے گھاٹ اترنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا میرے داد جان نے بھی درزی کا پیشہ اپنا لیا۔

میرے دادا جان اسماعیل بیگ صاحب تمام ہمسایوں میں معزز شمار ہوتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران کٹنگ ماسٹر کی حیثیت سے انگریزوں کی ایک فوجی کمپنی بلیک واچ کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ یہ کمپنی بعد ازاں برما چلی گئی۔ برما ، کسی دور میں ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔

مرزا اسماعیل بیگ برمی بڑی روانی سے بول لیتے تھے۔ اپنے زمانہ ملازمت کے

دوران انہوں نے ایک برمی عورت سے شادی رچالی تھی اور اس کے بطن سے دو بچے تولد ہوئے۔

میرے داداجان برما کے شہر منجان میں علیل ہو گئے اور جب ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو جالندھر بذریعہ تار ان کی شدید علالت کی خبر دی گئی۔ میرے والد مرزا روشن بیگ صاحب برما روانہ ہو گئے۔ لیکن وہ اپنے والد مرحوم کی تدفین کے دو روز بعد منجان پہنچ سکے۔

سسر۔ مرزا روشن بیگ

میرے دادا مرزا اسماعیل بیگ کے ایک دوست ڈاکٹر سی۔ مارٹن نے مرزا روشن بیگ کی سرپرستی فرمائی۔ ڈاکٹر سی۔ مارٹن حبشہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے کم عمری میں ڈاکٹر سی۔ مارٹن ایک مدراسی کے ساتھ ہندوستان آ گئے تھے۔ مدراس میں اعلیٰ تعلیم پا کر ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ شہر منجان (اپر برما) میں سول سرجن کے عہدے پر فائز تھے اور ساتھ ہی میئر یعنی رئیس بلدیہ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ان کی وساطت سے مرزا روشن بیگ کو سرکاری ٹھیکے ملے اور مرزا صاحب بہت دولت مند ہو گئے۔ انہوں نے اپنے جدِامجد مرزا دولت بیگ کی امارت کی یاد تازہ کر دی۔

مرزا احمد بیگ (مرزا روشن بیگ کے چھوٹے بھائی اور میرے چچا) اپنی بھاوج فضل بیگم (زوجہ روشن بیگ) کو برما چھوڑنے گئے تو برما ہی میں قیام پذیر ہو گئے۔ مرزا احمد بیگ شہر گوٹی میں میونسپل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گزارنے لگے۔ وہ مرزا جلال الدین بیرسٹر (علامہ اقبال کے قریبی دوست) کے داماد تھے۔ ان کی بیوی بھی برما چلی گئی تھیں۔ محمود نظامی میرے انہی چچا کے فرزند ارجمند

تھے۔ علامہ اقبال کے نوجوان دوست ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر نے اپنی ڈاکٹریٹ کے دوران لندن سے باقاعدہ محمود نظامی سے خط وکتابت جاری رکھی۔ عزیزم کے نام نامی کتاب میں پوری خط وکتابت محفوظ ہے۔

محمود نظامی کی انشاپردازی کا لوہا بڑے بڑوں نے مانا ہے اور ان کی کئی ایک کتابوں پر حکومت نے انہیں انعام سے نوازا نظر نامہ بڑی اہم کتاب ہے۔

۱۹۲۷ء میں ایک واقعہ پیش آیا، جس نے زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر سی۔ مارٹن کو شہنشاہ ہیل سلاسی نے حبشہ بلا کر وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کردیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں مرزا روشن بیگ کو ملاقات کی غرض سے حبشہ آنے کی دعوت دی۔ روشن بیگ صاحب نے چھ ماہ کے لئے منجان میں اپنا کاروبار بند کر کے بال بچوں کو جالندھر (پنجاب) چھوڑا۔ خود ڈاکٹر سی۔ مارٹن سے ملنے حبشہ چلے گئے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے مرزا روشن بیگ کو واپس نہیں آنے دیا۔ برما کی جائیداد اور مکانات کی کسی نے خبر نہیں لی۔ البتہ حبشہ میں مرزا روشن بیگ کے لئے بہت سازگار حالات پیدا ہوگئے۔ آپ کے پاس نہ صرف حبشہ کی تمام سڑکوں اور جنگلوں کا ٹھیکہ تھا بلکہ آپ نے کئی مقامات پر آٹے، چینی اور تیل کے کارخانے لگائے حبشہ کی افواج کے لئے سامان کی فراہمی میں بھی مرزا صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ آپ کو ہیل سلاسی کے دربار میں باریابی حاصل تھی **The Emperor of my country** - شہنشاہ کی طرف سے اعزاز بھی حاصل تھا۔

ادھر بال بچوں کا یہ حال ہوا کہ برما واپسی کا خیال ترک کر دیا گیا۔ بچوں نے اسلامیہ اسکول جالندھر اور بچیوں نے مدرستہ البنات میں داخلے لے لئے۔

والد صاحب معقول رقم افریقہ سے بذریعہ منی آرڈر بھجوادیا کرتے تھے۔ اس دور

کے ایک ہزار روپے کی قوت خرید اس دور کے تیس ہزار روپے سے زیادہ تھی۔

۱۹۳۶ء کا سال ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا تھا۔ شاہ اور وزیراعظم برطانیہ بذریعہ طیارہ روانہ ہو چکے تھے۔ حبشیوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ بہت سے غیر ملکی لوگ مارے گئے۔ جب عدلیس ببابا پر اطالوی گولہ باری ہو رہی تھی۔ مرزا روشن بیگ چھ میل دور اسباتغری کے مقام پر تھے۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ وہاں سے جبوتی کی بندرگاہ پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اور اسی جہاز میں سوار ہونے میں کامیاب ہوئے جس میں سوار ہو کر لارڈ لنگھو ہندوستان آئے تھے۔

تمام دولت اور جائیداد حبشہ چھوڑ کر صرف اپنی جان بچا کر بڑی خستہ حالی میں جالندھر پہنچے۔ ان کے ساتھ کیمیاوی مرکبات کا ایک تھیلا تھا جو ان کی کیمیاگری کی یاد دلاتا تھا۔

والد صاحب نو سال کے بعد جالندھر پہنچے تھے۔ ہمارے گھر میں عید کا سماں تھا۔ ان کی والدہ بھی زندہ تھیں۔ ہم بڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے پہچانا کہ وحیدہ کون ہے۔ رشیدہ کون ہے اور مجیدہ کون ہے۔

وہ اکثر اپنی جدائی کی باتیں سناتے رہتے تھے۔ حبشہ سے معقول رقم بھجا کرتے تھے دولت کی ریل پیل تھی۔ زندگی خوب ٹھاٹھ سے گزر رہی تھی۔ ہمارے گھر میں دو گھوڑوں کی بگھی تھی۔ ان دنوں بڑے بڑے عہدے داروں کے ہاں بگھی رکھنے کا رواج تھا۔ بعد میں بڑے بھائی نے موٹر خرید لی تھی۔

جالندھر میں انٹر کالج تھا، اس لئے ڈگری کی تعلیم کے لئے لاہور جانا پڑتا تھا۔ اس طرح ہمارا خاندان لاہور منتقل ہو گیا اور پھر گرمی کی تعطیلات گزارنے ہم جالندھر کے گھر میں چلے جایا کرتے تھے۔

لاہور میں ایف سی کالج ایک مشہور کالج ہے۔ کسی زمانے میں اس کالج کے پرنسپل حبشہ گئے تھے اور میرے والد محترم نے ان کی بہت خاطر مدارات کی تھی اور پھر امتداد زمانہ کے بعد جب وہ پرنسپل صاحب سے ملنے گئے تو پرنسپل صاحب بڑے تپاک سے ملے اور بہت خوش ہوئے اور کالج میں چھٹی کر دی گئی۔

والد صاحب بہت مہمان نواز ، خدا ترس ، بردبار ، نیک ، صابر اور محبت کرنے والے تھے۔ نماز اور روزے کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اور اپنی اولاد کو نماز روزے کا پابند رکھنا پسند کرتے تھے۔ اولاد کو بہت چاہتے تھے اور خاص کر بیٹیوں سے بہت پیار کرتے تھے۔

میری دادی کے ہاں دو تین بچے پیدا ہوئے جو عالم طفلی ہی میں چل بسے۔ میرے والد سری گوبند پور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ والدین نے خوشی سے ان کا نام روشن بیگ رکھا۔ دادی ان کو اللہ دتا بھی کہتی تھیں۔ ان کے کان بھی چھدوا دیئے گئے تھے۔ یہ اس زمانے میں ایک رسم تھی کہ جو بچہ دیر میں پیدا ہو یا منتوں کے بعد لڑکیوں کے بعد پیدا ہوتا تھا اس کے کان چھدوا دیتے تھے۔

ان کی رنگت سرخی مائل ، مضبوط جسم ، درمیانہ قد ، بڑی بڑی آنکھیں۔ جس وقت ایک عرصے کے بعد حبشہ سے تشریف لائے تھے تو ان کی داڑھی میں سفید بال موجود تھے اور بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی بیوی سے انہیں بڑی انسیت تھی اور ان کو ہر قسم کی سہولت فراہم کرنے کی فکر کرتے تھے۔ اور ان کے مشورے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ہمیں بھی تلقین کرتے تھے کہ ہم اپنی ماں کی فرماں بردار رہیں۔

علامہ اقبال سے بھی کئی بار مل چکے تھے۔ میرے چچا احمد بیگ کی شادی مرزا جلال الدین کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ منگنی کے بعد مرزا جلال الدین نے میرے چچا کو اپنے

پاس لاہور بلوالیا تھا اور انہیں تعلیم دلوائی۔ ان کا قیام لاہور میں تھا۔ والد صاحب لاہور اپنے بھائی سے ملنے آتے تو اپنے بھائی کے سسر کی وساطت سے وہ علامہ اقبال سے کئی بار مل چکے تھے۔

میرے والد محترم سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے مرشد کامل حضرت قاری اللہ بچایا سے بیعت تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارا پورا گھر حضرت صاحب کا بیعت تھا اور میرے سب سے چھوٹے بھائی خلیفہ امجد بیگ صاحب حضرت کے خلیفہ مجاز ہیں اور لاہور چھاؤنی میں قیام پذیر ہیں اور ابھی اس کتاب کی تیاری کے موقع پر اپنے پیرومرشد حافظ قاری اللہ بچایا کے حالات زندگی کے بارے میں خط لکھا تو ان کی طرف سے ایک قلمی کتاب خواجہ پنجاب موصول ہوئی۔ یہ تقریباً سوا سو کے لگ بھگ صفحات پر محیط ہے۔ اور بڑی لاجواب کتاب ہے۔ اور اس کتاب سے اپنے والد محترم کی وفات کا واقعہ نقل کر رہی ہوں۔

والد صاحب کے انتقال کے واقعہ کو خواجہ پنجاب کے صفحہ ۴۴ پر یوں بیان کیا گیا ہے

۶۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں حضور لاہور تشریف لائے تو بھائی اختر بیگ کے یہاں مصری پارک (مزنگ میں ٹھہرے۔ والد مرحوم ۲۵ مارچ ۱۹۴۴ء کو حضور کی ملاقات کے لئے مزنگ آئے۔ رات کو سردی لگ گئی جس نے نمونیہ کی صورت اختیار کر لی۔ یہی شکایت بالآخر مرض الموت بنی۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۴ء بروز منگل علی الصبح استغفار، کلمہ شہادت اور ذکر اسم ذات کا ورد کرتے ہوئے آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آخر دم تک آپ کے ہوش و حواس بجا رہے۔ آپ کی نماز جنازہ برادر طریقت مولوی عزیز البصیر نے پڑھائی۔ قبر قبرستان بی بی پاک دامن میں واقع ہے۔

مرزا احمد بیگ

(۱۸۸۹ء- ۱۹۷۶ء)

ہمارے چچا کی شادی مرزا جلال الدین کی بیٹی صفیہ بیگم سے بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی- ایک مدت تک اس شادی کی دھوم دھام کے چرچے لوگوں کی زبانوں پر رہے- اس شادی میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے تھے-

اس شادی کے بندھن کی ابتدا یوں ہوئی کہ ہماری دادی جان اپنے بیٹے مرزا احمد بیگ کے ہمراہ ایک رشتہ دار کی شادی میں شریک ہوئیں- اس شادی میں مرزا جلال الدین کی بیوی بھی شریک تھیں- اتفاق سے ان کی نظر ہمارے چچا احمد بیگ پر پڑی- وہ اٹھارہ سال کے خوبرو اور صحت مند نوجوان تھے- لہذا جلال الدین کی بیوی نے اپنی بیٹی صفیہ کے لئے انہیں پسند کر لیا- اور انہوں نے شادی کا پیغام بھیج دیا- بہر کیف جلد ہی یہ شادی طے پا گئی اور ہمارے چچا کو جالندھر سے لاہور بلوا لیا گیا اور وہ لاہور رہنے لگے اور لاہور ہی سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا-

اچانک ہمارے دادا جان مرزا اسماعیل بیگ برما میں انتقال فرما گئے- اور ان کا کاروبار سنبھالنے اور ان کی تدفین میں حصہ لینے برما پہنچے- تھوڑے عرصے کے بعد والد صاحب نے بچوں کو برما بلا بھیجا- میرے چچا مرزا احمد بیگ صاحب اپنی بھاوجہ صاحبہ اور میرے دو بھائیوں کو لے کر برما پہنچے- پھر وہ وہاں ہی مقیم ہو گئے- تھوڑے عرصے بعد انہوں نے اپنی بیگم صفیہ کو بھی برما بلا لیا- ان کے ہاں محمود نظامی اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں انہوں نے برما کے شہر مگوئی میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزاری- وہ وہاں میونسپل سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھے-

ایک عرصہ تک برما میں مقیم رہے اور کافی مال و دولت ہاتھ لگا اور پھر جالندھر

واپس آ گئے۔ جالندھر میں بھی ان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ صفیہ بیگم کا انتقال برما ہی میں ہو گیا۔ بیوی کی پردیس میں فوتیدگی سے وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور ان کا دل ٹوٹ گیا۔

برما کی سرزمین کو خیرباد کہہ کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جالندھر آ گئے اور انہوں نے دوسری شادی ارشاد بیگم سے کی اور ارشاد بیگم کے بطن سے ایک لڑکا مرزا مسعود بیگ پیدا ہوا۔ ابھی مرزا مسعود بیگ چھ سال کے پیٹے میں تھے کہ ان کی والدہ ارشاد بیگم انہیں داغ مفارقت دے کر راہی ملک بقا ہوئیں۔

بالآخر چچا نے تیسری شادی زینت بیگم سے رچائی۔ ان کے بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکوں کے نام بالترتیب خالد بیگ ، زاہد بیگ اور معروف بیگ ہیں۔ لڑکیاں خالدہ بیگم ، شاہدہ بیگم اور عابدہ بیگم ہیں۔ عابدہ بیگم ایک سماجی کارکن ہیں اور ایک ادارے کی صدر ہیں۔

ارشاد بیگم کے فرزند مرزا مسعود بیگ میرے بھوئی تھے۔ میری چھوٹی بہن مجیدہ کے شوہر تھے۔ بڑے ہی نیک اور دیانت دار تھے۔ تھوڑا عرصہ پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

چچا صاحب کے سب سے بڑے لڑکے محمود نظامی تھے۔ ان کا اصل نام محمود احمد بیگ تھا۔ وہ خواجہ حسن نظامی سے بہت متاثر تھے اور یوں انہوں نے اپنا نام محمود نظامی رکھ لیا۔ وہ بہت ذہین ، عالم اور صاحب طرز ادیب تھے۔ اردو ادب میں ان کا نام زندہ رہے گا۔ اب بھی درسی کتب میں ان کی کتابوں کے مضامین شامل کئے جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کے نانا مرزا جلال الدین نے انہیں لندن بھی بھیجا تھا۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ نظر نامہ ان کی اہم کتاب ہے جس پر حکومت کی طرف سے انہیں انعام بھی دیا گیا۔

ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو وہ ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور بالآخر وہ ریڈیو اسٹیشن لاہور کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ترقی کر کے ۱۹۵۹ء ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ انہیں کراچی بھیجا گیا اور وہ اچانک ۱۹۶۱ء میں انتقال فرما گئے۔

علامہ اقبال کی صحبت میں بیٹھنے والے نوجوانوں میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر بھی تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ایک جرمن عورت سے تاثیر صاحب کا نکاح علامہ اقبال نے پڑھایا تھا۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے ساتھ محمود نظامی کے تعلقات تھے اور ڈاکٹر تاثیر صاحب نے لندن سے ان کے نام کئی خط تحریر کئے تھے۔ محمود نظامی صاحب نے اس خط و کتابت کو ایک کتاب بنام عزیزم میں قلمبند کیا ہے اور علامہ سے اپنی عقیدت کا اظہار ملفوظات اقبال میں کیا ہے۔ محمود نظامی کی طرح حمید نسیم صاحب نے بھی ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی وساطت سے علامہ اقبال کی فکر سے صحیح صحیح استفادہ فرمایا ہے۔ اور اقبال ہمارے عظیم شاعر میں وہ علامہ اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی فرماتے ہیں اور ان کے کلام پر تنقید بھی کی ہے۔ غالباً" ڈاکٹر یوسف حسین خان کی روح اقبال کے بعد حمید نسیم صاحب کی کتاب ایک عرصے تک اقبالیات کے شیدائیوں کے لئے ایک معتبر تحریر کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔

وفات کے وقت صرف ۴۷ سال کے پیٹے میں تھے۔ ان کی میت لاہور لے جائی گئی اور انہیں میاں میر کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ہمارے خاندان کے اکثر افراد بی بی پاک دامن کے قبرستان میں محو استراحت ہیں۔

دادی نواب بیگم

یہ ہمارے دادا مرزا اسمٰعیل کی بیوی تھی۔ اسماعیل کے چچا غفار بیگ کی بیٹی تھیں مغلیہ خاندان کی مہریں اور جاگیروں کے کاغذات ہماری دادی نے محفوظ کیے ہوئے تھے۔ شومئی قسمت سے جب پاکستان کی تشکیل کے بعد افراتفری کے عالم میں اپنے وطن مالوف جالندھر کو چھوڑنا پڑا تو یہ سب کاغذات جالندھر میں رہ گئے جس کا ہمیں بڑا قلق ہے۔

جب ہمارے دادا جان مر گئے تو گھر کے حالات بڑے بہتر تھے۔ اور گھر میں نوکر چاکر بھی تھے۔ ہماری دادی جان عزیزوں سے ملنے ڈولی میں بیٹھ کر جاتی تھیں۔ ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں میں عورتیں پالکی میں سوار ہو کر نکلتی تھیں اور بڑے گھروں کی عورتیں ڈاکٹر کی کلینک پر بھی پالکی اور ڈولی میں آتی جاتی تھیں۔

دادی جان کے والد اور بھائی دنیا چھوڑ کر اللہ کی عبادت میں لگ گئے۔ دن رات اللہ کی یاد میں مگن رہتے تھے۔ اس طرح مشغولیت کی وجہ سے ▪ ولایت کے درجہ پر فائز ہو گئے۔

لوگوں کا جمگھٹا ہونے لگا اور وہ آنے والوں کو تلقین کرتے کہ وہ راہ راست پر گامزن رہیں۔ وہ دنیاوی شان و شوکت سے بیزار ہو چکے تھے۔ انہیں صرف اپنی عاقبت سدھارنے کی فکر تھی۔ ہماری دادی جان بھی اپنے والد صاحب کی روحانیت سے بہرہ ور تھیں۔ وہ بڑی فیاض تھیں۔ اور غریبوں کی ہمدرد تھیں۔ ان کے در پر ہر وقت محتاجوں اور بے کس لوگوں کا ہجوم رہتا۔ ہر سال زکوٰۃ کی رقم بانٹتی تھیں۔ خاندان کے یتیم بچے بچیوں کو پال پوس کر جوان کرتیں اور پھر ان کی شادی کا بندوبست کرتیں۔ محتاج اور بے کار عزیزوں کو خطیر رقم کاروبار کے لئے دیتی تھیں۔

حکمت سے بھی کچھ شدبد تھی۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کے لئے اڑوس پڑوس کے غریب غربا لوگ ان کے مفت علاج سے مستفید ہوتے۔ خصوصا" آنکھ اور گلے کی بیماریوں کا بڑا کامیاب علاج کرتی تھیں۔ بڑی بارعب اور اصول پسند خاتون تھیں۔ سچی مسلمان اور عمر بھر نماز قضا نہ کی تھی۔ بڑھاپے میں بھی اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھاتی تھیں۔ صفائی کا بہت خیال تھا۔ سو سال کی عمر پائی۔ آخر دم تک چلتی پھرتی رہیں اور کسی سے اپنا کام کروانے کی روادار نہ تھیں۔
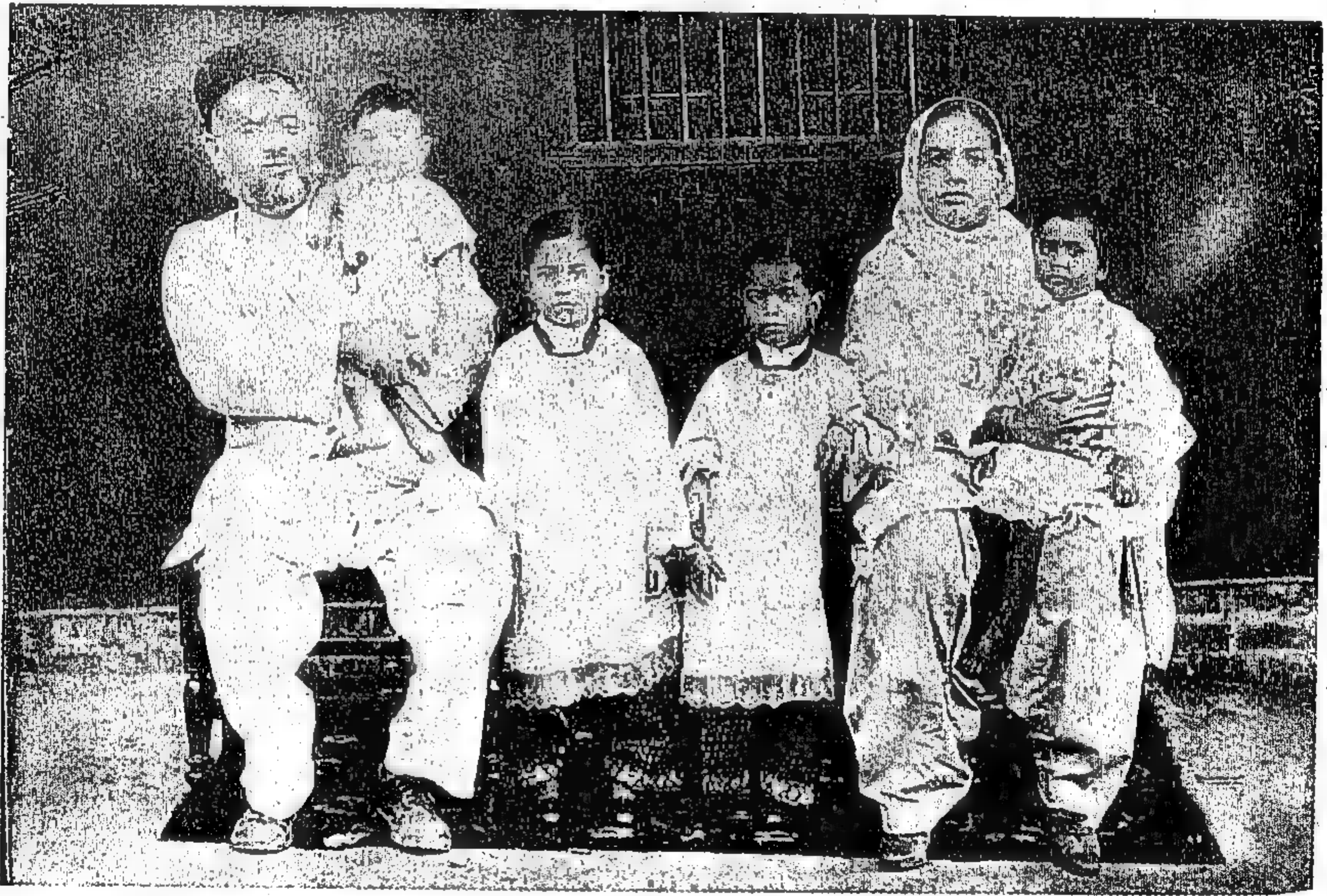
والدین کے ساتھ تصویر ـــ اس گھر میں دادی جان نے زندگی گزاری

خوش دامن۔ فضل بیگم

(۱۹۶۵ء۔ ۱۸۹۲ء)

میری والدہ ۱۸۹۲ء میں جالندھر میں پیدا ہوئیں۔ نانا جان اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ محکمہ تعلیم سے وابستگی کی وجہ سے انہوں نے اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اس زمانے میں لڑکیوں کے لئے علیحدہ مدارس کا انتظام نہ تھا۔ مکتبوں میں بچیاں اور بچے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مکتبوں کی تعلیم کا معیار انگریزی مدارس کے معیار سے بہتر تھا۔

مکاتب کے پڑھے لکھے بچے فارسی اور دوسری زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے ۔ہماری والدہ صاحبہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دیتی تھیں۔ والد صاحب افریقہ میں مقیم تھے اور ہمارے بہن بھائیوں کی تعلیم بالکل متاثر نہ ہوئی۔

تقریبا" ۱۹۰۶ء میں ہماری والدہ صاحبہ کی شادی ہوئی۔ اچھی خاصی گزر بسر ہو رہی تھی۔ لیکن ہمارے دادا جان کے انتقال کے بعد والد صاحب برما چلے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنے بچوں کو بھی برما بلوالیا۔ برما ہمارے وطن مالوف سے کوسوں دور تھا رسم ورواج اور آب وہوا کا بڑا فرق تھا لیکن ہماری والدہ صاحبہ کی ہمت اور جرات کو آفرین کہ ایک متضاد ماحول میں بھی اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت سے غافل نہ ہوئیں۔ ہمارے ہوش سے پہلے کی بات ہے کہ ہمارے نانا کے تین بیٹے (مرزا فضل بیگ مرزا البشیر بیگ اور نذیر بیگ) تھے۔ ان کی دو بیٹیاں فضل بیگم ،اور بادشاہ بیگم تھیں۔ یوں ہماری ایک خالہ بادشاہ بیگم تھیں۔ اور تین ماموں تھے۔ ان کی پیدائش جالندھر میں ہوئی تھی اور جالندھر ہی کی خاک میں پیوست ہوئے۔ان کے بارے میں ہمیں

ہوش نہیں ہے۔ ہماری والدہ صاحبہ بڑی سلیقہ شعار تھیں اور خانہ داری میں ماہر تھیں اصول کی پابند تھیں۔ جھوٹ سے نفرت کرتی تھیں اور صاف بات کہنے کی قائل تھیں پیٹھ پیچھے برائی کو بہت برا جانتی تھیں۔ والدہ صاحبہ کی اچھی عادتوں کو ہم نے ایسا اپنایا کہ اس دور خرابی میں بھی ہم بہن بھائی والدہ صاحبہ کے نقش قدم پر چلنے کے عادی ہیں ہم صاف گوئی پر عامل ہیں اور کسی کی غلط طرف داری کے خواہاں نہیں۔

ہماری والدہ صاحبہ حج کی سعادت حاصل کر چکی تھیں۔ بچپن ہی سے پنجگانہ نماز اور تہجد کی عادی تھیں۔ بہت سخی تھیں۔ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ حتی الامکان دوسرے کی مدد سے دلی مسرت محسوس کرتی تھیں۔

اپنی زندگی کا آخری دور میری بہن مجیدہ کے ساتھ گزارا۔ مجیدہ سے انہیں بہت پیار تھا اور مجیدہ ان کی بہت خدمت کرتی تھی۔ جوانی بڑی شان سے گزری اور بڑھاپے وبیماری کی وجہ سے بہت سادہ طبیعت ہو گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا سارا سامان بانٹ دیا۔ اپنے لئے ضرورت کا سامان رکھا۔ عیش و آرام کی زندگی کے بعد اتنی سادگی کو دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔

انہوں نے کمرہ اور پلنگ چھوڑ کر صحن میں ایک گوشے میں جھونپڑی ڈال لی تھی۔ اس میں ایک عام چارپائی، زمین پر قالین کے بجائے دری، چھوٹا سا چولہا، اور چھوٹی سی دیگچی رکھی ہوئی تھی۔ جب تک ہمت رہی، خود کھانا پکاتی رہیں۔ سارا دن عبادت الٰہی میں گزارتی تھیں۔ محلے کے جواں، بوڑھے اور بچے ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کو بھابھی جی کے نام سے پکارتے تھے۔

آخر ذیابیطس (شوگر) کا مرض بڑھ گیا اور پرہیز پر توجہ نہین دیتی تھیں۔ بہن وحیدہ کے پاس رہتی تھیں۔ وحیدہ بہن کا گھر ابھی نہیں بنا تھا۔ وہ سردار محمد گرلز ہائی

اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ڈاکٹر کا علاج جاری تھا۔ اسکول کی استانیاں اور دوسرا عملہ ان کی خدمت کرتا تھا۔ انسان کی بیماری کا علاج ہے لیکن موت کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ وقت معینہ پر اللہ نے انہیں ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ء کو اپنے ہاں بلا لیا۔ مجھے کراچی ٹیلیفون پر اطلاع دی گئی لیکن ہم گھر پر نہ تھے۔ رات کو واپس آئے تو ہمیں والدہ صاحبہ کی فوتیدگی کا علم ہوا۔ اس طرح میں جنازے میں شامل نہ ہو سکی۔ ان کی بخشش کے لئے دعائیہ کلمات نوک زبان پر بے اختیار آئے۔ صبر و شکر کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔

ان کا جنازہ سردار محمد گرلز ہائی اسکول سے اٹھا تھا۔ تین روز تک اسکول کی استانیاں ورچیاں ختم قرآن میں مصروف رہیں اور انہیں ایصال ثواب کیا گیا۔

آفتاب اقبال اور ان کے برادران نسبتی و خواہران نسبتی

ویسے تو سات سالے اور چھ سالیاں تھیں۔ لیکن دو سالے اور تین سالیاں بچپن ہی میں فوت ہو گئیں۔ زندہ بچنے والے سالے اور سالیوں کی تفصیل یوں ہے۔

۱) مرزا افضل بیگ (۱۹۷۱ء - ۱۹۱۰ء) ۱۴ اگست ۱۹۷۱ء

۲) مرزا اختر بیگ (۱۹۹۴ء - ۱۹۱۶ء) ۲۱ اگست ۱۹۹۴ء

۳) مرزا اصغر بیگ (۱۹۸۶ء - ۱۹۱۸ء) ۱۹ جنوری ۱۹۸۶ء

۴) مرزا امجد بیگ (۱۹ مارچ ۱۹۱۹ء)

۵) مرزا اسلم بیگ (۱۹۹۷ء - ۱۹۲۸) ۷ فروری ۱۹۹۷ء

۶) مس وحیدہ روشن (۱۹۸۹ء - ۱۹۲۰ء) ۱۳ جولائی ۱۹۸۹ء

۷) (۱۰ اگست ۱۹۲۱)

۸) مجیدہ بیگم (۲۲ ستمبر ۱۹۲۳ء)

مرزا افضل بیگ

۱۹۱۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابھی تین سال کے پیٹے میں تھے کہ انہیں والدہ صاحبہ کی ہمراہی میں برما جانا پڑا۔ برما میں والد صاحب نے ہمارے دادا جان کی خوشید گی کے بعد ٹھیکیداری کا کاروبار سنبھال لیا۔ ہمارے چچا احمد بیگ صاحب ہمارے بھائی مرزا افضل بیگ اور اپنی بھاوجہ کو برما چھوڑنے گئے تھے۔ بچپن کا زمانہ برما ہی میں گزرا اور ابتدائی تعلیم برما میں ہی پائی۔ برما میں ابتدائی تعلیم کے لئے انگریزی مدارس ہی تھے اور ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ جب والد صاحب اپنے دوست ڈاکٹر سی مارٹن کی ہمراہی میں برما چھوڑ کر حبشہ (افریقہ) روانہ ہوئے تو مرزا افضل بیگ صاحب اپنی والدہ
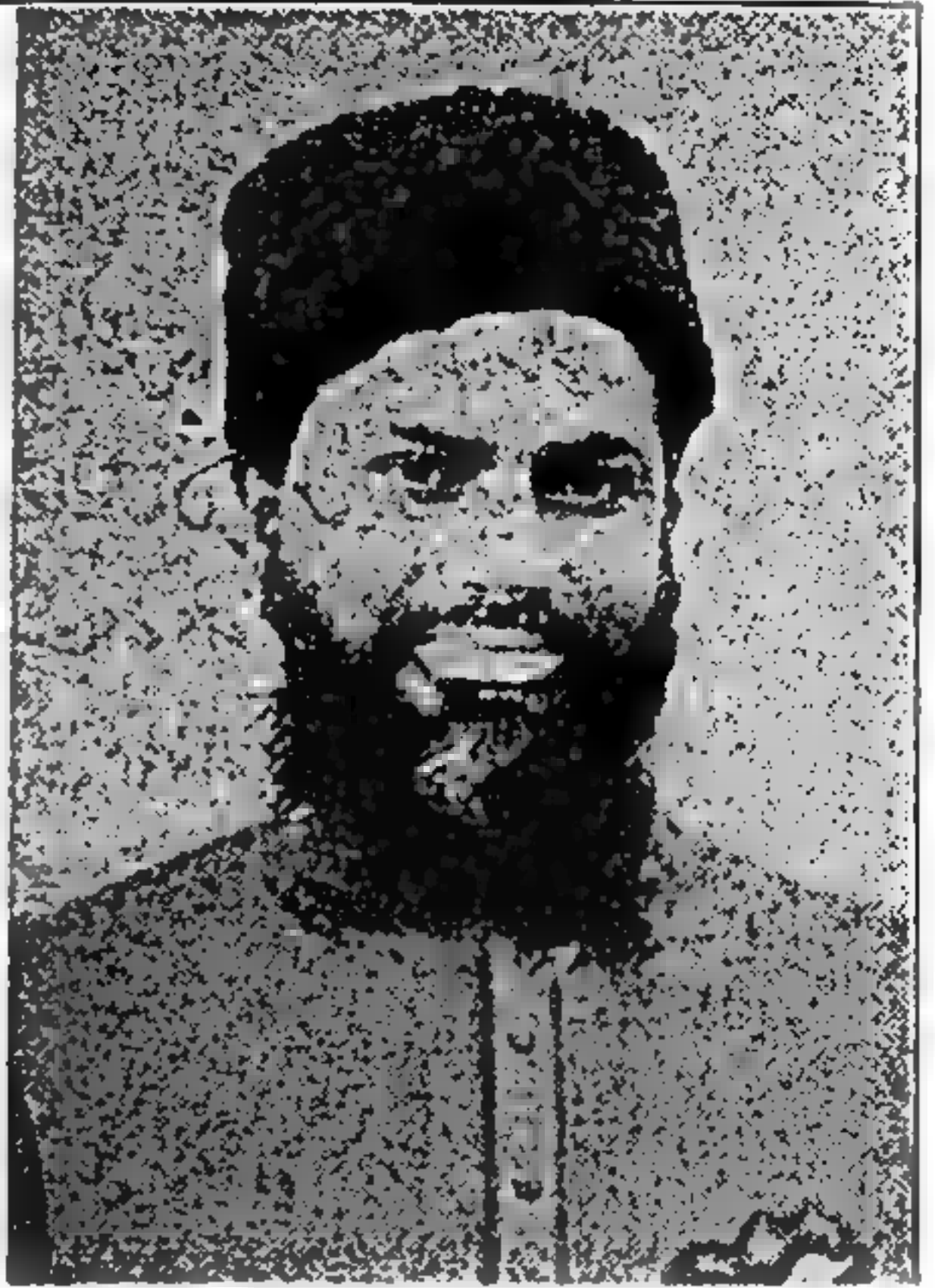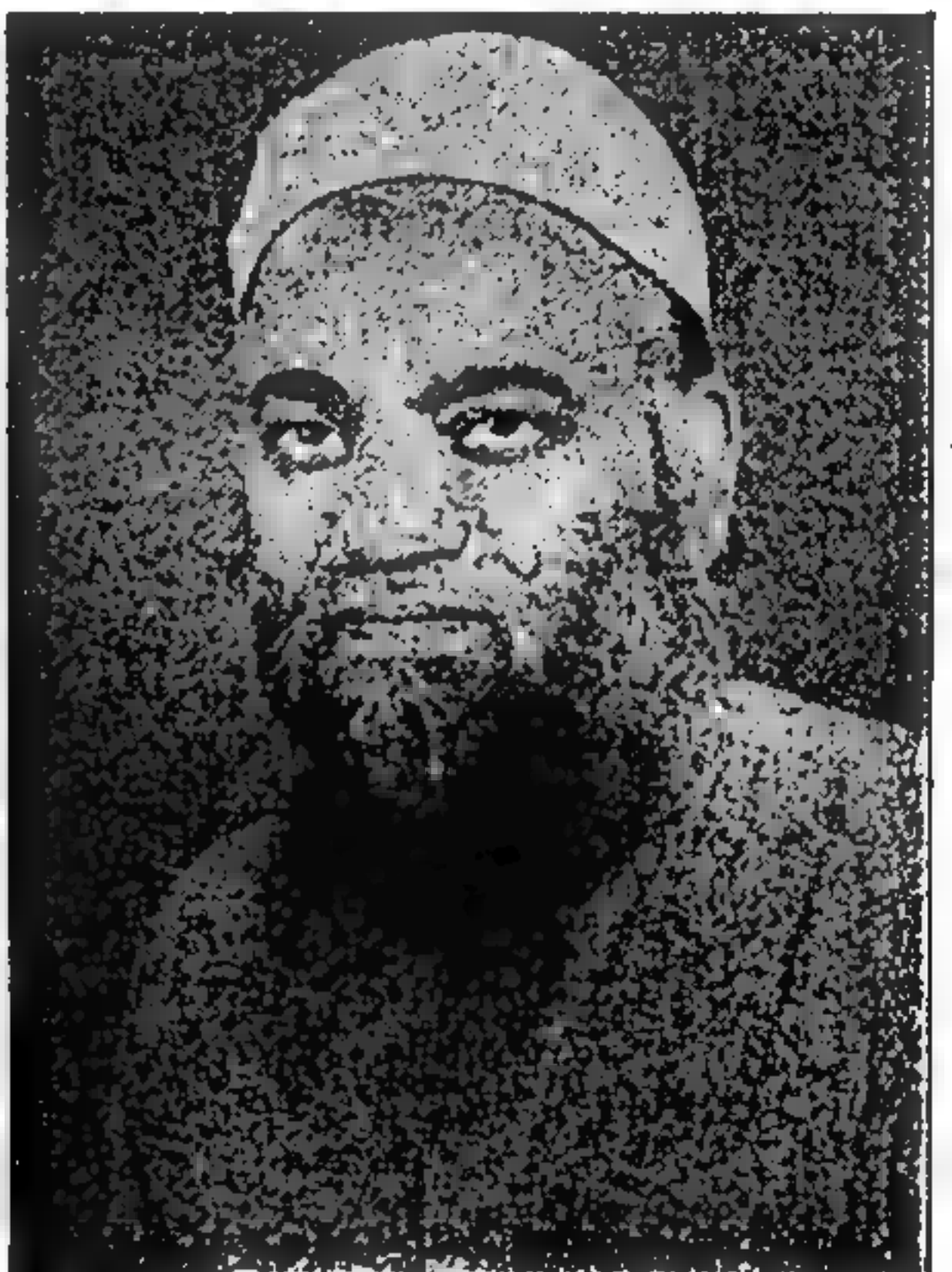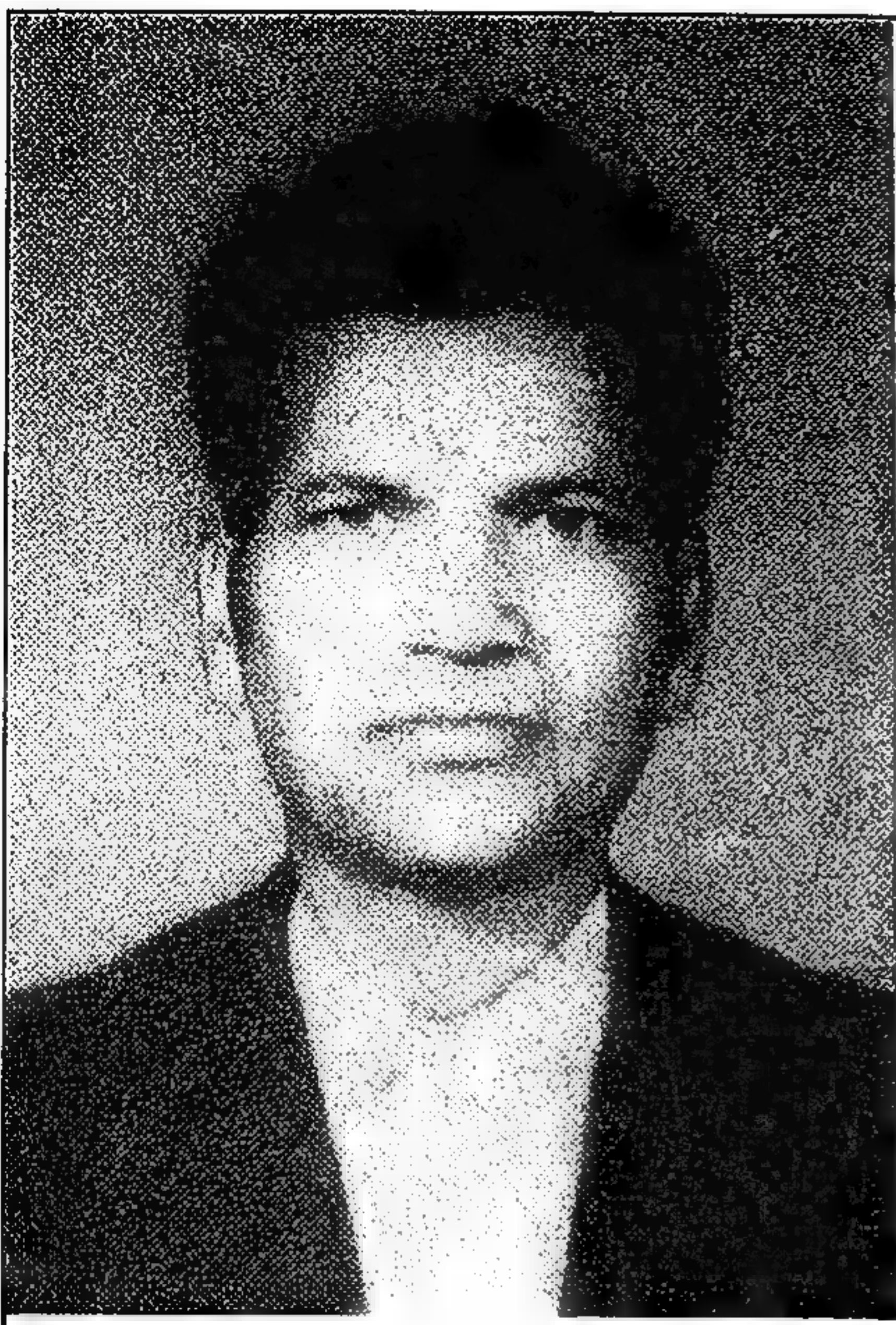
مرزا اصغر شمیم صاحب۔

مرزا محمد اسلم صاحب۔

مجیدہ بیگم صاحبہ

حاجیہ وحیدہ روشن صاحبہ مرحومہ

صاحبہ اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ جالندھر واپس آگئے۔ جالندھر آکر انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور پھر ایف ۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ایف اے کے بعد مزید تعلیم کے لئے جالندھر میں کوئی معقول انتظام نہ تھا کیونکہ جالندھر اس دور میں ڈگری کالج سے محروم تھا۔ اس لئے افضل بیگ صاحب کو لاہور کا رخ کرنا پڑا۔ لاہور میں محمود نظامی مرحوم کی مدد سے ایک کمرہ کرایہ پر لیا ۔اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور پھر وہیں سے گریجویٹ ہوئے۔ بی۔ اے کے بعد محمود نظامی کی مدد سے انہیں روزنامہ انقلاب میں کام کرنے کا موقع ملا۔ انقلاب کے مالک مولانا عبدالمجید سالک تھے۔ انہوں نے افضل بیگ صاحب کو نائب مدیر مقرر کردیا۔

چند ماہ ان کی کارکردگی کو دیکھا تو انہیں اخبار کا چیف ایڈیٹر مقرر کردیا۔ انقلاب کے پہلے چیف ایڈیٹر مولانا غلام رسول مہر تھے۔ سالک صاحب افضل بیگ صاحب کے کام سے خوش تھے۔

کچھ عرصہ بعد افضل بیگ صاحب حکومت کے محکمہ تعلقات عامہ میں افسر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بعد ازاں وہ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مزید ترقی کی منزلیں طے کیں۔ محکمہ تعلقات عامہ میں منسلک ہونے کے بعد ان کا مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہا۔ راولپنڈی کے قریب چکلالہ میں بھی مقیم رہے اور ۱۹۴۴ء میں ان کا تبادلہ دہلی ہوگیا۔ نئی دہلی سے تقسیم ملک کے بعد وہ اپنی آپشن پر کراچی چلے آئے۔

تقسیم ملک کے وقت کراچی چھوٹا اور صاف ستھرا شہر تھا اور افضل صاحب نے ہمیں کراچی آنے کی دعوت دی۔ انتقال آبادی کے سلسلہ میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ رہے تھے اور بھاگم بھاگ میں قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ اور

قتل کی وارداتیں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ ادھر ساہیوال میں سکھ قوم کے افراد زیادہ تھے اور مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہم پر ہاتھ اٹھالے اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ بھائی صاحب کی دعوت کو غنیمت سمجھا اور آگ وخون کا سمندر پار کر کے معینہ وقت سے زائد وقت میں خدا خدا کر کے کراچی پہنچے۔ گاڑیوں پر بھی حملے ہو رہے تھے۔ ملک کے چپے چپے میں خوف وہراس پھیلا ہوا تھا اور لوگ حیرانی وپریشانی کے عالم میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ نسیم حجازی مرحوم نے اپنے ناول خاک وخون میں بالکل سچی تصویر کھینچی ہے اور تقسیم کے وقت مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر قیامت کا سماں گزر گیا۔ مشرقی پنجاب سے زیادہ تر مسلمان لاہور کا رخ کر رہے تھے اور مہاجر کیمپوں میں لوگ اپنے عزیزوں کی شناخت کے لئے چکر کاٹتے تھے۔ کیونکہ انتقال آبادی کے مرحلے کے موقعہ پر بہت سے بے گناہ مرد اور عورتیں اپنی منزلوں سے پہلے ہی دوسری دنیا سدھارے۔

اس وقت میری اندرونی آنکھ میرے سامنے وہ منظر پیش کر رہی ہے جب میں ایک سالہ بچے (آزاد اقبال) کے ہمراہ گھر میں محبوس ہو کر رہ جاتی تھی۔ آفتاب اقبال صاحب صبح کچہری چلے جاتے تھے اور ہم ماں بیٹا گھر میں دبک کر بیٹھ رہتے تھے۔ ہر لمحہ ایک انجانا خوف پیچھا کرتا رہتا تھا اور دل میں عجیب عجیب خیالات آتے تھے۔ خوف وہراس سے آزادی وہی ذات دلاتی ہے اور واقعی افضل بھائی کی دعوت نے ہمیں ساہیوال کے گھٹے اور محبوس ماحول سے چھٹکارا دلایا۔ یہ سب کچھ کل کی بات معمول ہوتی ہے۔ حالانکہ اس واقعہ کو پچاس سال کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔

افضل بھائی کو اسلامیات کے مضمون سے خاص رغبت تھی۔ وہ انجمن حمایت الاسلام کے کالج سے فارغ التحصیل تھے اور خداداد ذہانت کے مالک تھے۔ شعر وشاعری

اور ادب سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ وہ جالندھر شہر میں بزم اقبال کے بانی تھے اور اکثر و بیشتر بزم کے تحت مشاعروں کا اہتمام کیا کرتے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا ذوق شعری پروان چڑھتا رہا اور وہ صحافت کے میدان میں بھی کودے تھے اور سیاست میں بھی سرگرم تھے۔ انہوں نے ایک دو شعری مجموعے شائع کروائے تھے۔ وہ بہت نامور ہومیوپیتھ ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اس طریق علاج پر متعدد کتابیں تحریر فرمائیں۔ عین جوانی کے عالم میں روحانیت کی طرف مائل ہوئے اور وقت کے ولی کامل اور خواجہ پنجاب حضرت اللہ بچایا کے دامن ارادت سے وابستہ ہوئے اور اس میں اتنا ذوق و شوق دکھایا کہ مرشد نے انہیں اپنا خلیفہ چن لیا۔ پھر وہ بہت سے لوگوں کو راہ مستقیم پر لائے عین جوانی کے عالم میں موسیقی کے فن سے آشنا ہوئے۔ آواز اچھی پائی تھی۔ مشہور گلوکار سہگل اور اس کا چھوٹا بھائی اکثر ان کے ہاں آدھمکتے تھے اور خوب محفل موسیقی جمتی تھی۔ ہارمونیم اور سارنگی کے سنگ پر محفل اپنے جوبن پر ہوتی تھی۔

جیسے ہی حضرت اللہ بچایا کی نظر کیمیا ان پر پڑی۔ موسیقی کی محفل کا تار و پود بکھر گیا۔ ان کے دل کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ان کے سیاسی مسلک کے بارے میں عرض ہے کہ وہ جالندھر اور لاہور کے قیام کے دوران مسلم لیگ کے سرگرم رکن رہے ہیں۔ جلسے اور جلوسوں میں شرکت فرماتے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اکثر مشاعروں کا انتظام اور انعقاد ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت سے نامور شعرا کو اپنے مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ جناب حفیظ جالندھری اور ضیا جالندھری ایسے شعرا ان کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ بس اک ضیاء جالندھری ہی اپنے شعر و سخن اور ادب نوازی کے چرچوں کے لئے لاہور میں ڈیرے جمائے ہوئے ہیں۔ باقی جالندھر کے زمانے سے ترتیب پانے والی بزم کے ساتھی ایک

ایک کر کے بچھڑتے چلے گئے اور اب بزم خاموش ہے۔

ساری عمر ذکر اذکار میں مصروف رہے اور جب سرطان کے موذی مرض نے حملہ کیا تو مشیت ایزدی کے مطابق اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

جب ان کا آخری وقت قریب آیا تو مسجد سے صبح کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی اور اللہ کے نیک بندے نے خالق حقیقی کے دربار میں حاضری دی اور پھر ہمیشہ کے لئے اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور انہوں نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری۔

مرزا اختر بیگ

۱۹۱۶ء میں برما میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم برما کے انگریزی مدرسے سے حاصل کی اور بعد ازاں والد صاحب کے جبشہ جانے کے بعد جالندھر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ثانوی تعلیم کے لئے داخل ہوئے۔ ایف۔ اے تک جالندھر ہی میں تعلیم پائی پھر جالندھر میں ڈگری کالج نہ ہونے کی وجہ سے مزید تعلیم کے لئے لاہور چلے آئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج کے محکمہ میں بطور کلرک منسلک ہوئے اور ترقی کرتے کرتے افسر بن گئے۔ بعد ازاں ریاست بہاولپور میں بطور انسپکٹر انسداد ملیریا پر کام کیا۔

سرکار کی ملازمت چھوڑ کر نجی کام میں لگ گئے۔ انہیں والد مرحوم کی نصیحت یاد آئی کہ ملازمت میں انسان کی خودی برے طریقے سے مجروح ہوتی ہے اور ملازمت کے دوران وہ کئی ایک مواقع پر اپنی خودی کا خون ہوتے دیکھ چکے تھے۔ لہذا وہ اپنے فوجی افسر سے بھڑ گئے اور اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

وہ ساری عمر تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سی تحقیقی کتابیں لکھیں اور اپنی نگارشات وقتاً" فوقتاً" احباب کو بھیجا کرتے تھے ۔ شعر وشاعری کا صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ اور انہوں نے کچھ شعری مجموعے بھی ترتیب دیئے اور نعتیں بھی کہی ہیں۔

انہوں نے قرآن پاک کی ایک سائنٹیفک تفسیر ترتیب دی اور وہ اسے مکمل کر کے خود شائع نہ کروا سکے۔ ان کے فرزند اکبر نادر مظہر تفسیر شائع کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔میرے بیٹے آزاد اقبال نے بھی اپنے ماموں اختر بیگ کا تلمذ اختیار کیا اور جب آزاد اقبال کے کلام میں نکھار پیدا ہوا تو انہوں نے میرے نام ایک خط روانہ کیا۔ ان کا میرے نام خط علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے ۱۹۹۶ء کے ایڈیشن میں شائع ہوا ہے ۔ان کی ایک کتاب کیف منظوم ۱۹۹۳ء میں چھپ چکی ہے اور اس کی کچھ جلدیں میری ذاتی لائبریری کی زینت ہیں۔ ان کی مشہور نظمیں کشف حجاب ،شان ذات خدا اور شان معراج رسول پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ بھی مذہب کے دلدادہ تھے اور نماز وروزے کے بہت پابند تھے۔ انہوں نے بھی پیر کامل حضرت اللہ بچایا سے خلافت پائی تھی اور ان کے پاس سند خلافت بھی تھی۔

ساری زندگی خدمت خلق میں بسر کی۔ دوسروں کے کام آنا اپنا ایمان سمجھتے تھے اور علامہ اقبال کے بڑے مداح تھے اور علامہ کا بہت سا کلام انہیں زبانی یاد تھا۔

وہ ذیابیطس کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور تقریباً" زندگی کی اٹھتر بہاریں دیکھ چکے تھے کہ ذیابیطس کے مرض کے ہاتھوں ان کی زندگی کی شمع اگست ۱۹۹۴ء کو آخر اسلام آباد کی دھرتی پر بجھ گئی اور اسی دھرتی میں پیوند خاک ہوئے۔

میرے ذہن کے نہاں خانے میں ان کی زندگی کا ایک بڑا عجیب واقعہ عکس ریز ہے

میں چاہتی ہوں کہ میں اس واقعہ کا تذکرہ کروں اور ارباب حکومت تک یہ بات پہنچا سکوں کہ نجانے کتنے اچھے دل ودماغ کے لوگ سرکاری ملازمت میں آجاتے ہیں لیکن ان کے ناعاقبت اندیش اور پھسڈی افسران کی عدم توجہ کی وجہ سے وہ اپنے دل ودماغ کی جولانیوں سے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں۔

چونکہ وہ سائنس کے مضمون سے دلچسپی رکھتے تھے اور تحقیقات کے شائق تھے اور مختلف نوع کے تجربات میں منہمک رہتے تھے۔ وہ ذات باری کی ہستی کو سائنسی انداز سے ثابت کرتے تھے اور انہوں نے اپنی منظومات میں بھی اس نوع کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ آج سے ترپن سال پہلے جب پہلے پہل ایٹم بم تیار ہوا اور امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں جاپان کے دو شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر گرایا۔ ان دنوں انہوں نے ایٹم بم کی ٹیکنالوجی کا عملی مطالعہ کیا۔ اور ایٹم بم کی تیاری کے طریق کار سے اپنی ذاتی کوششوں کی وجہ سے کامیاب ہوگئے۔ ایک روز دفتر میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: میں ایٹم بم بنا سکتا ہوں اور میں پاکستان کی سلامتی کے لئے اس اقدام کے لئے تیار ہوں۔ ان کے ساتھیوں نے ان کی بات پر یقین نہ کیا بلکہ ان کی نگرانی کے لئے سی۔ آئی۔ ڈی والوں کو لگا دیا اور انہیں باور کرلیا کہ یہ آدمی روس کا ایجنٹ معلوم ہوتا ہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی مسلسل نگرانی نے ان کی زندگی اجیرن کردی۔ آخر کار انہوں نے اپنے افسر مجاز سے ٹکر لی کیونکہ اسی کے ایما پر نگرانی کا ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ اور یوں اختر صاحب نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ اس منزل پر اپنے تئیں اس محکمہ سے اخراج کا سوچیں۔ اس کو سوچ کر انہوں نے استعفٰی داغ دیا۔

قابل انسان کی قدر ہمارا شیوہ نہیں جب وہ زندگی کا سفر رخت باندھ لے تو پھر اس کی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کردیتے ہیں۔ مسلمان قوم اس پرانی ریت پر عمل

پیرا ہے۔ ملک و قوم کی بہتری اور اصلاح کی خاطر قابل لوگوں کی بر وقت قدر کا ہمیں وطیرہ اختیار کرنا پڑے گا۔

اس سے قبل تقسیم ملک کے وقت بھی انہوں نے ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور مظالم سے بچنے کے لئے مسلم لیگی نوجوانوں پر مشتمل ایک سر فروش انجمن بنائی۔ جس کے ذمہ بم سازی کا کام تفویض کیا گیا اور مسلمان اپنے دفاع کی خاطر دستی بم ہندو آبادیوں پر گراتے تھے تاکہ ہندو اپنی اکثریت کے زعم میں مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں ۔ اس انجمن کے سرگرم سر فروش میرے بھائی اختر بیگ اور میرے پھوپھی زاد بھائی مرزا انور بیگ تھے۔ اختر بھائی نے ہندوؤں اور سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کے دفاع کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے۔

نوائے غم

(ا)

کس کی یاد میں سوز و گداز ہے دل میں
غبار خاطر گریہ نواز ہے دل میں
عجیب صورت ماتم طراز ہے دل میں
مہیب حالت اندوہ ساز ہے دل میں
بری طرح در آلام باز ہے دل میں
خیال رخصت اختر جہاز ہے دل میں

(۲)

بہت اداس وپریشان ہر ایک بیٹی ہے
نہیں قرار کہ آغوش غم میں لیٹی ہے
سمجھ رہی ہے کہ تقدیر کی وہ ہیٹی ہے
نگاہ یاس میں تاریک شب سمیٹی ہے
نشیب زیست بجائے فراز ہے دل میں
خیال رخصت اختر جہاز ہے دل میں

(۳)

پسر محال زبوں ہے کہ غم سے بے جاں ہے
بغیر ماں کے محیط نگاہ ویراں ہے
ملال برق تپاں ہے، خیال طوفاں ہے
یہ حال دل ہے کہ اجڑا ہوا گلستاں ہے
خزاں بصورت حشر دراز ہے دل میں
خیال رخصت اختر جہاز ہے دل میں

(۴)

اداس مرحلے آئے ہیں محفلوں کے لئے
اجل کے ہاتھ میں سامان ہے دل جلوں کے لئے
گراں خبر ہے وفا کیش دوستوں کے لئے

دلوں پہ چوٹ لگی تیز دھڑکنوں کے لئے
عیاں ہے ان سے کہ مجروح ساز ہے دل میں
خیال رخصت اختر جماز ہے دل میں

(۵)

نگاہ شوق تھی اختر جماز کی دیں پر
ملے گی جا اسے خلد بریں کی بالیں پر
دعا کے ساتھ ، خلوص وفا کی تلقین پر
شعور تلخ سے ڈھل کر زبان پروین پر
نوائے غم ہے کہ اس کا جواز ہے دل میں
خیال رخصت اختر جماز ہے دل میں پروین

مرزا اصغر بیگ شمیم ایم۔ اے

مرزا اصغر بیگ ۱۹۱۸ء میں برما میں پیدا ہوئے۔ اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح انہوں نے بھی ابتدائی تعلیم برما میں حاصل کی اور برما سے والد صاحب کی حبشہ روانگی کے بعد اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی ہمراہی میں جالندھر وارد ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ پاکستان ریلوے سے منسلک ہو گئے۔ اسی دوران اپنے صحافتی شوق کی خاطر وہ مختلف اخبارات کی ادارت بھی کرتے رہے۔ افضل بھائی کی مدد سے وہ محکمہ تعلقات عامہ سے منسلک ہو گئے اور بحیثیت افسر بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آخری وقت تک محنت اور لگن سے اپنے کام میں لگے رہے۔ محکمہ تعلقات

عامہ سے بطور ڈائریکٹر سبکدوش ہوئے۔ سبکدوش ہونے کے بعد بھی اپنے دفتر سے منسلک رہے۔ کیونکہ قابل افسران کی مدت ملازمت میں اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ بڑے شریف النفس انسان تھے۔ شاعرانہ مزاج اور ادیبانہ صلاحیتوں سے مزین تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی بدولت اچھے اچھے لوگ ان کی خدمت سے استفادہ فرماتے تھے۔ شنید ہے کہ بہت سے وزراء حضرات کے لئے تقاریر لکھ کر دیتے تھے۔ آج بھی وزرا حضرات قابل اور صاحب فہم لوگوں سے معاوضہ سے تقاریر لکھواتے ہیں۔

مجید لاہوری کا ایک شعر ہماری سیاست کے اکثر شرکاء کی بڑی صاف ستھری عکاسی کا غماز ہے۔

ہم نے بی اے کیا کلرک بنے
وہ مڈل فیل تھے وزیر ہوئے

بہت کم گو اور صلح پسند تھے اور لڑائی جھگڑوں سے عموماً" اپنا دامن بچاتے تھے۔ ان کا سارا دن کام کرنے یا پڑھنے لکھنے میں گزرتا تھا۔ شمیم تخلص تھا۔ انہوں نے اپنا نام مرزا اصغر بیگ کی بجائے اصغر شمیم رکھا ہوا تھا اور سب انہیں شمیم صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔

مرزا امجد بیگ

آپ ۱۹ مارچ ۱۹۱۹ء کو برما میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کے حبشہ چلے جانے کے بعد اور بہن بھائیوں کے ہمراہ جالندھر تشریف لے آئے۔ طبیعت کے بڑے سخت ہیں یوں سمجھ لیجئے کہ جلالی طبیعت کے مالک ہیں اور جلالی طبیعت کے ہاتھوں تعلیم تکمیل خاطر خواہ طریقے سے نہ کر پائے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی خوبیوں سے نواز

رکھا ہے۔

ایک بات بتاتی چلوں کہ آخر پڑھائی سے ان کا دل اچاٹ کیسے ہوا۔ ایک مرتبہ ان کے استاد نے نجانے کیوں ان کی پٹائی کر دی۔ اس زمانے میں اساتذہ صاحبان بچوں کی خوب پٹائی کیا کرتے تھے اور ہمارے جدید دور میں تعلیمی قوانین کی رو سے ایک استاد کو بدنی سزا دینے کی اجازت نہیں۔ لیکن وہ دور کسی قانون کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اساتذہ صاحبان اپنے طلبہ کی بے تحاشا پٹائی کر دیتے تھے۔ لیکن ماسٹر صاحب کی پٹائی سے امجد بیگ صاحب مشتعل ہو گئے اور اسی بید سے استاد صاحب کی مرمت کر دی اور پھر پوری طاقت سے بید کو دو ٹکڑے کر کے استاد کے سامنے پھینکا اور گھر چل دیئے۔ دوبارہ اسکول کا منہ بھی نہ دیکھا۔

تجارت کے پیشے کو اپنایا اور اسی سے اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالا اور بعد میں پیر کامل حضرت اللہ بچایا کے دامن ارادت سے منسلک ہوئے اور خلیفہ کے منصب پر فائز ہوئے اور آپ نے اپنے مرشد کامل کے حالات زندگی کے بارے میں ایک کتاب خواجہ پنجاب کے نام سے ترتیب دی ہے اور کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف لوگ ان کے مرشد کامل کے سوانح سے آگاہ ہو سکیں بلکہ ان کے اوراد اور مختلف مراقبات کا تذکرہ فرما کر عام دنیادار انسان کو اس طرف راغب کیا ہے کہ وہ بھی اس چند روزہ زندگی سے فائدہ اٹھائے اور اپنی آخرت کا سامان کرے۔ بڑے دل نشین پیرائے میں کتاب تحریر فرمائی ہے اور جی نہیں چاہتا کہ انسان کتاب کو ختم کئے بغیر چھوڑے اور اس مختصر سی کتاب میں تصوف، تاریخ اور ادب کے علاوہ خاندانی حوالے سے بھی بہت سے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔

میرے پانچ بھائیوں میں دو بھائی مرزا افضل بیگ اور مرزا امجد بیگ خلیفہ مجاز

ہوئے اور دوسرے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں اور داتا کی نگری میں چھاؤنی کے علاقے میں آپ کا آستانہ ہے اور ان کے دامن ارادت سے بہت سے صاحب علم لوگ وابستہ ہیں اور اب تقریباً" اسی کے پیٹے میں ہیں۔ اس عمر میں بھی وہ زیادہ خشک مزاج نہیں بلکہ اپنے اوراد کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرتی زندگی میں بڑے زندہ دل انسان واقع ہوئے ہیں اور ان کے خطوط میں بعض فقرے مرزا غالب کے اسلوب کو اپنائے ہوئے ملتے ہیں۔

میرے سبھی بھائی شعر و شاعری کے پیدائشی ملکہ سے سرفراز ہیں۔ مرزا افضل بیگ، مرزا اختر بیگ اور مرزا اصغر شمیم پر گو شاعر تھے لیکن امجد بیگ کا کلام پختگی کے لحاظ سے غالب کی جھلک لئے ہوئے ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں پانچ شاعر بھائیوں اور شاعرہ بہن کے ساتھ ساتھ ایک عالمی شہرت یافتہ شاعر علامہ اقبال کی بہو ہوں۔

نوجوانی میں گھر کے شاعرانہ ماحول کی وجہ سے مجھے بھی شعر و شاعری کا چسکہ پڑ گیا اور میری تک بندی کی اصلاح کا کام بھائی اختر بیگ کے ذمہ تھا۔ جب ۱۹۴۳ء میں آفتاب اقبال صاحب سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی تو خوف کے مارے اپنے کلام سے توبہ کی اور تھوڑا بہت کلام ضائع کر دیا۔

اللہ کے فضل و کرم سے میرے بھائی امجد بیگ صاحب بقید حیات ہیں اور بھائی داغ مفارقت دے گئے اور اس وقت ہم دو بہنیں (مجیدہ اور رشیدہ) اور بھائی امجد بیگ زندہ سلامت باکرامت ہیں۔ آخر اس بزم کو بھی کسی روز منتشر ہونا ہے اور صرف اللہ کا نام ہمیشہ رہے گا۔ فانی انسان کا نام بعض اوقات فنا نہیں ہوتا جسم کو فنا کے گھاٹ اترنا ہے اور اسے اپنے ہاتھوں سے قبر کے اندر سپرد کر کے ہم گھر لوٹتے ہیں۔ حدیث شریف میں زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ لذتوں کو ختم کرنے والی (موت) کو زیادہ یاد

رکھا کرو۔

خدا کی قسم اگر ہر انسان موت کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو پھر بلاوجہ ہر وقت اور ہر لمحہ موت کے منہ میں جانے کا دھڑکا لگا نہ رہے گا۔ یقین پختہ ہو جائے کہ وعدہ پر ہمیں رخصت ہونا ہے تو پھر خوف کاہے کا۔ اللہ اپنے حبیب کے صدقے نیک اعمال کی توفیق بخشے اور گناہوں سے بچائے۔

مرزا اسلم بیگ

میرے سب سے چھوٹے بھائی تھے اور جالندھر میں ۲۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ تقسیم ملک کے وقت ان کی عمر تقریباً" اٹھارہ برس تھی اور بڑی تکلیفوں اور بے سروسامانی کے عالم میں مہاجر کی حیثیت سے لاہور پہنچے تھے۔ میری خالہ مرحومہ کے دو نوجوان بچے سکھوں کے ہاتھ شہید ہوئے۔ سفر کے دوران اسلم بھائی بھی کئی بار بال بال بچے۔

بے روزگاری اور بے مکانی کا دور دورہ تھا۔ میری بڑی بہن وحیدہ آسودہ حال بیگمات کے ساتھ خدمت خلق کے کاموں میں دن رات جٹی رہتی تھیں۔ اور انہوں نے ہی بھاگ دوڑ کر کے بھائی اسلم کو ریلوے میں نوکری دلوا دی۔ اسلم بھائی ایمانداری اور لگن سے اپنا کام انجام دیتے رہے۔ جب ریلوے سے مدت ملازمت ختم ہوئی اور خدمت سے سبکدوش ہوئے تو وہ اپنے ایک نجی کاروبار میں مصروف ہو گئے مغل انڈسٹری کے نام سے کارخانہ قائم کیا۔ آخر 7 فروری 1997ء کو انتقال فرما گئے اور اب ان کا کاروبار ان کے بیٹے سنبھالے ہوئے ہیں۔ اپنے اور بھائیوں کی طرح وہ بھی مسلم لیگ کے پرجوش کارکن تھے۔

مرزا اسلم بیگ

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہاں تک چاہئے بچنا دوا سے
اگر تجھ کو لگے جاڑے میں سردی
تو استعمال کر انڈے میں زردی
جو ہو محسوس معدے میں گرانی
تو پی لے سونف یا ادرک کا پانی
اگر خون کم ہے بلغم زیادہ
تو کھا گاجر چنے شلجم زیادہ
جگر کے بل پہ ہے انسان جیتا
اگر ضعف جگر ہے کھا پپیتا
جگر میں ہو اگر گرمی دہی کھا
اگر آنتوں میں خشکی ہو تو گھی کھا
تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے
تو فوراً دودھ گرما گرم پی لے
جو طاقت میں کمی ہوتی ہو محسوس
تو مصری کی ڈلی ملتان کی چوس
زیادہ گرم دماغی ہے تیرا کام
تو کھالے شہد کے ہمراہ بادام
جو ہو قلب کی گرمی کا احساس
مربا آملہ کھا اور اناناس
جو دکھتا ہو گلا نزلے کے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے

وہ بڑے ہنس مکھ ، لطیفہ گو اور زندہ دل انسان تھے۔ مزاحیہ اشعار کہتے تھے اور ان کا مشغلہ ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا تھا۔ زندگی کے غموں کو ہنسی مذاق کے گولوں سے نیست و نابود کر دیتے تھے اور بڑے مہمان نواز تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ ہنسی مذاق کے شائق کو دل کے دورے کی شکایت قطعاً" نہیں ہوتی۔ لیکن اسلم بھائی بڑے زندہ دل تھے اور خود بھی خوش رہتے تھے اور دوسرے کو بھی خوش رکھتے تھے اس کے باوجود وہ دل کے عارضے کے ہاتھوں اس سرائے فانی سے رخصت ہوئے۔ قدرت کے کاموں میں کس کو دخل اندازی کا حق حاصل ہے۔ ■ ذات اپنے حساب کتاب کے مطابق اس دنیا کے باسیوں کو بالائے زمین اور زیرِ زمین بھجوانے کا فریضہ بطریق احسن انجام دے رہی ہے اور اس کے نظام میں کوئی مین میخ نکالنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس کی ذات بابرکات کے سامنے سب کی زبانیں گنگ اور ہاتھ پاؤں شل ہیں میرے بڑے بھائی مرزا افضل بیگ جالندھر میں پیدا ہوئے بعدہ والدین برما جا بسے اور پھر جب حبشہ پر فوج کشی کے زمانے میں جالندھر پلٹے تو جالندھر میں بھائی اسلم پیدا ہوئے۔ تین بھائی برما کی پیدائش ہیں اور صرف استثنیٰ مرزا افضل بیگ اور مرزا اسلم بیگ کو ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مجیدہ بیگم

۲۲ ستمبر ۱۹۲۳ء میں برما میں پیدا ہوئیں۔ میری سب سے چھوٹی بہن ہیں ۔والدہ انہیں چھوٹی اولاد کے ناطے بے حد چاہتی تھیں۔ خدا کے فضل سے بقید حیات

ہیں۔

مجیدہ بیگم نے بھی ایف۔ اے تک تعلیم پائی اور جوان ہونے پر میرے چچازاد بھائی مسعود بیگ سے شادی ہو گئی۔ مسعود بیگ میرے چچا احمد بیگ کے چھوٹے فرزند تھے اور ملفوظات اقبال کے مولف محمود نظامی کے چھوٹے بھائی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ہمارا گھرانہ بھارت سے ہجرت کر کے مستقل طور پر لاہور آباد ہو گیا۔ تقسیم ملک سے پہلے بھی ہم لوگ تعلیم کی خاطر لاہور آتے جاتے رہتے تھے۔ ہماری دادی جان زندہ تھیں اور اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں اور جگہ بسنے کو تیار نہ تھیں۔ اس دور میں ملکی حالات بڑے ناگفتہ بہ تھے اور لوگ خواہش کے باوجود بھی اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ تقسیم کے وقت جتنی تعلیم حاصل کر لی وہی کافی وافی تھی۔ ناسازگار حالات کا سامنا کرنے کے لئے شریف زادے چھوٹی موٹی ملازمت کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ بس زمانے کے ساتھ سمجھوتے کی خاطر مسعود بھائی بھی بطور کلرک ملازمت سے منسلک ہو گئے اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے صرف ہیڈ کلرک تک رسائی حاصل کر سکے۔ مدت ملازمت پوری کر کے سبکدوش ہو گئے۔ وہ بھلے چنگے تھے اور ۱۹۹۰ء میں فالج کے اچانک حملے کا شکار ہوئے اور پھر جانبر نہ ہو سکے اور مشیت ایزدی کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ہمارے گھرانے میں انہیں ایک مثالی جوڑے کا درجہ حاصل تھا۔ تقاریب کے موقع پر گپ شپ کے وقت ان کی مثالی ہم آہنگی کے سبھی قائل تھے۔ ان کی زندگی میں بہار نے ڈیرے جمار کھے تھے لیکن مسعود بیگ کی جدائی سے بہن کے بہار آشنا چمن میں خزاں نے ڈیرے جما دیئے۔ اداسی اور بیماری نے اس تنہا عورت کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ لہذا ان کی لاہور کی تنہائی اور اداسی نے دم توڑ دیا۔ جب ان کے

اکلوتے بیٹے آصف مسعود نے انہیں اپنے پاس امریکہ بلا بھیجا۔ بالآخر ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو وہ امریکہ روانہ ہو گئیں۔ پاکستان کی یاد انہیں اب بھی بے چین کر دیتی ہے۔ گھرانے میں مسعود بیگ ایسا شریف النفس انسان اب کہاں ملے گا۔ وہ کسی کا دل دکھانے کے روادار نہ تھے۔ ہر کسی کی مدد اپنا فرض منصبی سمجھ کر کرتے تھے۔ اب ایسے فرشتہ صفت انسان کے لئے غریق رحمت ہونے کی دعائیں ہی عزیزوں کے منہ سے نکلتی ہیں۔ خدائے قدوس بھی اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

مجیدہ طبعا" صلح کن خاتون ہیں۔ انہیں اپنی ماں کی خدمت کا موقعہ ملا اور یوں ماں کے منہ سے ڈھیروں دعائیں نکلیں اور انہی دعاؤں کے ایجاب اور قبولیت کا ثمرہ ہے کہ خیر وعافیت آسودہ زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کا بیٹا بھی انہیں ٹوٹ کر چاہتا ہے اور برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی ماں رنجیدہ رہے۔

وحیدہ روشن

(۱۹۸۹ء- ۱۹۲۰ء)

میری بہن وحیدہ روشن ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء برما کے ایک شہر مگوئی میں پیدا ہوئیں۔ ہم تین بہنوں میں وحیدہ روشن بڑی تھیں۔ ہمارے والد مرزا روشن بیگ برما سے افریقہ کے لئے روانہ ہوئے تو سب اہل خانہ اپنے وطن مالوف جالندھر چلے آئے۔

جب کسمپرسی کے عالم میں ہمارے والد جالندھر لوٹے تو ہمارے خاندان کے بڑے بچے لاہور آگئے اور چھوٹے بچے جالندھر رہنے لگے۔ میرے بڑے بھائی افضل بیگ ادب اور صحافت کے شائق تھے۔ جالندھر شہر میں بزم اقبال کی بنیاد رکھی اور سب بھائی بہن لکھنے پڑھنے اور شعر و شاعری کے رسیا تھے۔

وحیدہ روشن ،حقیقتاً" ہمارے خاندان کی ہر لحاظ سے روشن مثال تھیں۔ تعلیم ، شعر و شاعری سیاست اور ادب کا صاف ستھرا مذاق رکھتی تھیں۔ ان کے ایک آدھ شعری مجموعے اور ادبی و سوانحی کتب چھپ چکی ہیں اور اپنا نعتیہ کلام چھپوانا چاہتی تھیں کہ اجل کے پیغام کی وجہ سے تشنہ طباعت رہ گیا۔ میں بشرط زندگی اسے طبع کرواؤں گی وحیدہ روشن اور بھائی مزید تعلیم کے حصول کے لئے لاہور آگئے۔ بڑے بھائی افضل بیگ ملازم ہوگئے۔ وحیدہ روشن کو بھائی کی وساطت سے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی اور عمر بھر اسی اسکول سے وابستہ رہیں۔ ان کی وابستگی کی مثال علامہ اقبال کے استاد علامہ سید میر حسن کی مشن اسکول سے وابستگی کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

اپنی ملازمت کے سلسلے میں اپنی کتاب حیات سردار مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۴۵) میں رقم طراز ہیں: آج سے ۲۷ سال پہلے میں اپنے بھائی مرزا افضل بیگ مرحوم کے ہمراہ محمد نگر میں قیام پذیر تھی۔ اسی محلہ میں شیخ صاحب مرحوم بھی رہتے تھے۔ بھائی

صاحب مرحوم سے شیخ صاحب کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ ان دنوں شیخ صاحب مرحوم ایک چھوٹے سے مدرسہ کے سرپرست تھے۔ آج یہ مدرسہ لاہور کے مدرسوں میں صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں شیخ صاحب نے ذکر کیا کہ میں اپنے مدرسہ میں دینیات کی تعلیم جاری کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا بھائی صاحب نے میرا ذکر کیا کہ وہ مدرسۃ البنات کی تعلیم یافتہ ہے۔ اس کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا دوسرے دن میں بیگم شیخ سردار محمد صاحبہ کے ہمراہ مدرسہ گئی اور دینیات کی معلّمہ مقرر ہوگئی۔ شیخ صاحب مرحوم میرے لئے ایک نہایت ہی مشفق باپ کی طرح ثابت ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی جوانی کی ساری زندگی اس اسکول کے مقاصد تعلیم پر نثار کردی۔ شیخ صاحب کو میری اس قربانی کا پورا اعتراف تھا۔ اور وہ اپنے فرزند یعنی شیخ صادق بھیا اور اپنی بہو یعنی بیگم عطیہ صادق سے اکثر فرمایا کرتے تھے۔ دیکھنا وحیدہ روشن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اس نے اپنے وہ ایام جو عام نوجوان لڑکیاں ازدواجی زندگی میں صرف کیا کرتی ہیں۔ اسکول کی نذر کردیئے ہیں۔

جب تک شیخ صاحب زندہ رہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا اور ہمیشہ عزت افزائی فرمائی۔ جب میں مدرسہ میں معلّمہ بن کر آئی۔ میری تعلیم صرف مولوی اور مڈل تک تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تمہیں بہت اونچے مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں بلکہ شیخ صاحب نے متعدد بار یہ آرزو ظاہر کی کہ وہ مجھے ہیڈ مسٹریس کے عہدہ پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے بار بار کہنے پر میرے دل میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اور میں نے اللہ کا نام لے کر علم حاصل کرنا شروع کردیا۔ جب میں نے میٹرک کیا تو بہت خوش ہوئے۔ اور کہا اب ایف۔ اے کرلو۔ جب ایف۔ اے کیا تو اور خوش

ہوئے۔ ساتھ ساتھ میں نے فاضل اردو۔ فاضل فارسی ، فاضل پنجابی اور فاضل عربی بھی کرلی۔ اس سے آپ بہت خوش ہوئے۔ اور ہر ایک سے میری علمی قابلیت کا ذکر بڑے فخر سے کرتے اور کہتے سب سے قابل ہیڈ مسٹریس میرے اسکول کی ہوگی۔ یہ سب باتیں سن کر میرے دل میں اور علم حاصل کرنے کی لگن تیز ہوگئی۔ جب میں نے بی۔ اے پاس کیا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مٹھائی کا ٹوکرا ساتھ لائے اور میرے گلے میں ہار ڈالا اور فرمایا: یہ مٹھائی مدرسہ کے ملازمین میں تقسیم کردو اور اب میں چاہتا ہوں کہ تم ایم۔ اے بی۔ ایڈ ہو جاؤ۔ اس دن وہ بہت خوش تھے اور کہنے لگے میری خواہش تھی کہ میری کوئی بیٹی بھی اتنا علم حاصل کرتی تو مجھے بے حد خوشی ہوتی میں نے فوراً" کہہ دیا۔ کاش میں آپ کی بیٹی ہوتی تو آپ کو علم حاصل کرکے دکھاتی ۔تو فوراً" فرمایا: ہم تمہیں بھی اپنی بیٹی تصور کرتے ہیں۔ پانچ بیٹیاں حقیقی ہیں تو تم چھٹی روحانی بیٹی ہو۔ بس اب جلدی سے ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ کرڈالو۔

میں نے اللہ کا نام لے کر بی۔ ایڈ کی تیاری شروع کردی۔ خداوند کریم نے اس میں بھی مجھے کامیابی عطا فرمائی۔ میری کامیابی کا سن کر فوراً" مٹھائی کا ٹوکرا اور ہار لے کر مدرسہ میں آئے۔ ہار میرے گلے میں ڈالا اور مٹھائی فوراً" تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں ان کا ملازم نور محمد بڑی خوبصورت سیاہ رنگ کی کرسی گھومنے والی سر پر اٹھائے مدرسہ میں داخل ہوا۔ شیخ صاحب نے فرمایا: یہ کرسی میں تمہارے لئے خرید کر لایا ہوں۔ اس پر بیٹھو میں تمہیں اس پر بیٹھے دیکھنا چاہتا ہوں۔

میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی تو فرمایا: یہ گھومتی بھی ہے۔ گھما کر دیکھو اور اپنے دست مبارک سے کرسی کو گھمایا اور اس وقت ان کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ اور فرمایا مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بی۔ اے بی۔ ایڈ پاس کیا ہے۔

ان کی شفقت اور پدرانہ محبت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کی شفقت سے آج میں نے اتنا علم حاصل کر لیا ہے۔ اگر وہ مجھے علم حاصل کرنے پر نہ ابھارتے تو شاید آج میں بھی دینیات کی استانی اور مولوی اور مڈل ہوتی۔

بی۔ ایڈ کے بعد ان کی خواہش تھی کہ میں ایم۔ اے بھی کر لوں۔ یہ واقعہ ۱۹۶۵ء کا ہے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر تیاری شروع کر دی اور داخلہ بھی بھیج دیا۔ یہ امتحان مئی 1966ء میں ہونا تھا۔ مگر اجل نے شیخ صاحب کو ۲ فروری 1966ء کو ہم سے جدا کر دیا۔

میری بہن نے امتحان دیا اور یوں ایم۔ اے اردو کا امتحان پاس کر لیا۔ بعدہ ، فارسی اور پنجابی میں بھی ایم۔ اے کیے۔ شیخ صاحب کی دعاؤں سے وہ جلد ہی ہیڈ مسٹریس کے عہدہ پر فائز ہو گئیں۔ وہ بائیس سال کی عمر میں اس ادارے میں آئی تھیں اور تمام عمر اسی ادارے سے منسلک رہیں۔

شیخ صاحب نے انہیں اسکول کے ساتھ ایک قطعہ اراضی رہائش کے لئے دے رکھا تھا اور روشن ہاؤس کے نام سے موسوم تھا۔

ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا علم اور تصنیف و تالیف تھا۔ اپنی حیات مستعار میں انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ انہیں شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ اور وہ وحیدہ روشن پروین کے نام سے اپنا کلام پیش کرتی تھیں۔ ان کی شعر و شاعری کی دو تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اپنے عزیزوں کی موت پر مرثیہ اور پیدائش پر اپنی خوشی کا اظہار اشعار میں کرنا پسند کرتی تھیں۔ انہوں نے آفتاب اقبال اور پاشا کی وفات پر اچھے مرثیے ترتیب دیئے جنہیں ان کے حالات کے فوراً" بعد دیا جا رہا ہے۔

وہ اپنی زندگی کے دن ہنسی خوشی گزار رہی تھیں کہ ان کا بڑا پیارا بھانجا وقار اقبال

عرف پاشا چالیس سال کے پیٹے میں معمولی سی علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ ۱۹۸۸ء میں پاشا کی فوتید گی نے میری بہن کی صحت پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ میرے پاشا کے لئے چاند سی دلہن کا انتخاب بھی اسی خالہ نے کیا تھا اور اسی بھانجے کی رفاقت میں یورپ کے ممالک اور امریکہ کی سیر پر گئی تھیں۔ اس بھانجے کی مذہبی زندگی کو وہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور ۱۹۸۲ء میں یہی بھانجا حج کا فریضہ بھی ادا کر چکا تھا۔

گھر میں رونق اور برکت کا ذریعہ تھا اور جب قدرت نے اپنی مشیت کے تحت اسے اپنے پاس بلا لیا تو میری بہن کو بھانجے کی ابدی جدائی نے نڈھال کر دیا اور اس کی رحلت پر اپنے غم کو الفاظ کے موتیوں پرو کر مرحوم بھانجے کی روح کے لئے نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

وہ راولپنڈی ایک عزیز کے ہاں گئی تھیں کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور طبیعت کی خرابی ٹھیک ہوتی نظر نہ آئی تو انہوں نے کراچی اطلاع دی اور انہیں فوری طور پر کراچی منتقل کر دیا گیا۔ ان کی جان بچانے کے لئے بڑی تگ و دو کی گئی لیکن وہ آغا خان ہسپتال ۱۹۸۹ء میں دم توڑ گئیں۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں سخی حسن کے قبرستان میں ان کے بہنوئی اور بھانجے کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

اپنی حیات مستعار میں انہوں نے آزاد اقبال کو منہ بولا بیٹا قرار دیا تھا۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کا گھر روشن ہاؤس آزاد اقبال کی ملکیت قرار پایا لیکن آزاد اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے کشادگی اور خوشحالی سے نواز رکھا ہے۔ اس گھر کو وحیدہ روشن ٹرسٹ میں منتقل کر کے اس میں چھوٹے بچوں اور بچیوں کے لئے ناظرہ قرآن اور تجوید و قرات کا معقول انتظام کیا ہے اور ملک کے نامور قاری ، غلام رسول صاحب کی

صاحبزادی قاریہ زہرہ یہاں قرآت و تجوید کی تعلیم پر مامور ہیں۔ بحسن و خوبی یہ ٹرسٹ فی سبیل اللہ بچوں کے لئے تدریس قرآن و پاک کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ مرحومہ کی روح کے ایصال ثواب کے لئے اس سے بڑا اور کیا کام ہو سکتا ہے۔ میں اپنی کہنہ سالی اور کمزوری کے باوجود اس ادارے کی جملہ ضروریات کی کفالت اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ہر سال باقاعدگی سے لاہور جاتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تدریس اور تفہیم قرآن کے لئے بہتر سے بہتر طریق کو رواج دے سکوں۔ میری نظر میں یہ مدرسۃ البنات کے ادارے کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ اس ادارے سے علم قرآن کی روشنی سے مستفید ہونے والی بچیوں کی عملی زندگی میں اپنے ادارے کی مالکہ (وحیدہ روشن صاحبہ) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان سا ذوق و شوق پیدا کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

میری بہن وحیدہ روشن صاحبہ نے مندرجہ ذیل کتب سپرد قلم کیں۔

شعری مجموعے

۱) لمعات ۲) اربعات ۳) منظوم حکایات

۱) حیات سردار

۲) میلاد پروین

وحیدہ روشن صاحبہ کی زندگی کا سیاسی پہلو

۱۹۴۳ء میں میری شادی کے زمانے میں وہ ایک سیاسی شخصیت اور نامور مسلم لیگی خاتون رہنما بیگم سلمیٰ تصدق حسین (جن کے واحد فضل الٰہی صاحب علامہ اقبال کے ہم جماعت تھے) کی معاون تھیں اور ان کے شانہ بہ شانہ سیاسی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ ان کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر اہل علاقہ کی منتخب نمائندہ خاتون کا فخر حاصل رہا ہے۔

جب انہوں نے صوبائی اسمبلی میں زنانہ نشست کے لئے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو اس زمانے میں ایک ماہوار رسالے فنکار کے مئی ۱۹۶۲ء کے شمارے میں سردار محمد گرلز ہائی اسکول کی سابقہ ہیڈ مسٹریس مس آئی خواجہ ایم۔ اے، بی۔ ٹی کا ایک مضمون مس وحیدہ روشن۔ صوبائی اسمبلی کی ایک خاتون امیدوار شائع ہوا۔ اس مضمون کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔

شرافت، دیانت اور ایثار و خلوص۔ یہ وہ ذاتی صفات ہیں جو مس وحیدہ روشن میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ صوبائی اسمبلی کی مخصوص زنانہ نشستوں میں سے ایک کے لئے خاتون امیدوار مس وحیدہ روشن ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں ستائش اور صلہ کی پرواہ کئے بغیر وافر حصہ لیا اور خاموشی سے کام کیا۔ تحریر و تقریر میں بھی انہیں قابل رشک مہارت حاصل ہے۔ شاعری میں بھی وہ منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔

ملکی جرائد میں جب میں نے پہلی بار یہ پڑھا کہ وہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑ رہی ہیں تو یقین نہ آتا تھا۔ لیکن جب میں نے اس خبر کی تصدیق کر لی تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کی ذاتی قابلیت، ذہنی استعداد اور وسعت قلب و نظر کے پیش نظر یہ

توقع جا طور پر کی جا سکتی ہے کہ وہ صوبائی اسمبلی میں خواتین کی نمائندگی صحیح طور پر کریں گی۔ یہ نہ صرف میرے ذاتی تاثرات ہیں بلکہ ان معزز خواتین کے بھی جن کے ساتھ مجھے آئندہ انتخابات کے بارے میں تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے۔

مس وحیدہ روشن کے خاندان اور میرے خاندان میں ایک گہرا رابطہ بھی ہے۔ میں ان کے خاندانی حالات کو بخوبی جانتی ہوں۔ موصوفہ جالندھر کی مردم خیز سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس نے گرامی، حفیظ نشتر، رسا اور محمود نظامی ایسے بلند پایہ شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ ان کے والد مرزا روشن بیگ برما اور حبشہ کے سرکاری اور عوامی حلقوں میں بے حد مقبول تھے۔

حبشہ ایسے پس ماندہ ملک میں اہم ترقیاتی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کا کام ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان کے حلقہ احباب میں ڈاکٹر سی۔ مارٹن وزیر اعظم حبشہ، سر عبدالقادر اور پروفیسر ایم۔ اسماعیل ایف۔ سی۔ کالج لاہور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مرحوم بے حد مرنجان مرنج، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور متقی و پرہیزگار تھے۔

مس وحیدہ روشن انگریزی تعلیم کے علاوہ فاضل اردو، فاضل فارسی اور فاضل پنجابی بھی ہیں۔ فاضل پنجابی میں موصوفہ پنجاب میں تمام طالبات میں فرسٹ آئی ہیں۔ آپ نے مذہبی اور دینی تعلیم مدرسۃ البنات جالندھر سے حاصل کی ہے۔ حدیث اور قرآن کی تعلیم پر پورا عبور ہے۔ مدرسۃ البنات کی ایک قابل اور ہونہار سابقہ طالبہ ہیں مس وحیدہ روشن رشتہ میں محمود نظامی مرحوم سابق ڈائریکٹر جنرل محکمہ تعلقات عامہ مغربی پاکستان، ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کراچی کی سگی چچازاد بہن ہوتی ہیں۔ ان دنوں وہ شیخ سردار محمد گرلز ہائی اسکول گڑھی شاہو لاہور کی ہیڈ مسٹریس اور یونین کونسل نمبر ۸ کی منتخب ممبر ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کئی سماجی انجمنوں کی سرگرم رکن بھی

ہیں۔

اس تعارف کے چھپنے کے بعد انہوں نے اردو ، فارسی اور پنجابی میں ایم۔ اے کے امتحانات بھی پاس کیئے۔ اور اپنی زندگی کو زیور علم سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں کوشاں رہیں۔ رسول کریم کی حدیث اطلبوا العلم من المھد الی اللحد پر عمل پیرا ہیں۔

مجھے اپنی بہن پر فخر ہے کہ خواتین کے لئے انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اب ان کی یاد کو لبد لآباد تک زندہ رکھنے کے لئے ان کے ذاتی گھر روشن ہاؤس کو وحیدہ روشن ٹرسٹ میں بدل دیا گیا ہے اور یہ ٹرسٹ بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینے کا مقدس کام انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے کی سربراہی میرے سپرد ہے اور میں اپنی ہمت کے مطابق اس فریضے کو انجام دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ اللہ تعالی میری مساعی کو قبول فرمائے اور میری بہن کے نام سے منسوب یہ ٹرسٹ مسلمانوں بچیوں کو تعلیم قران پاک سے آراستہ و پیراستہ کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔

سابق صدر پاکستان جناب ضیاء الحق صاحب نے ان کے دو شعری مجموعوں کی رسید کے بعد اپنا تبصرہ وحیدہ روشن کو بھجوایا۔ وہ خط دیا جارہا ہے۔

میرے بیٹے آزاد اقبال نے اپنی خالہ وحیدہ روشن کی فوتیدگی پر ایک مرثیہ کہا ہے۔

آہ خالہ وحیدہ

حق تعالیٰ نے بنایا ہے جہان رنگ وبو
معجزے ہیں اس کی قدرت کے نمایاں چار سو
اس جہاں میں ساری چیزیں لازم وملزوم ہیں
کچھ نہیں ایسا کہ جو بیکار ہو یا فالتو
ہیں مشیت کے عمل میں دو نمایاں صورتیں
ایک جانب نیستی ہے دوسری جانب ہے نمو
شام کو وہ پھول مرجھائے ہوئے پائے گئے
صبحدم شبنم جنہیں آکر کراتی ہے وضو
کاغذی ہے پیراہن کیوں پیکر تصویر کا
اے دل درد آشنا یہ راز ہے اس کو نہ چھو
آرہی ہیں یاد خالہ کی برابر شفقتیں
ذکر اس کی خوبیوں کا ہورہا ہے کو بکو
جس قدر اوصاف رکھتی ہے کوئی ہمدرد ماں
اپنی خالہ میں وہ پائے میں نے سارے ہو بہو
والہانہ تھی محبت اپنی خالہ سے مجھے
یہ ہے اظہار حقیقت کچھ نہیں اس میں غلو
ایسے خوش ہوتا تھا خالہ کی زیارت سے یہ دل
تشنہ لب ہوتا ہے جیسے دیکھ کر خوش آب جو
دامن انسانیت چھوڑا نہیں ہر گز کبھی

معترف اس بات کا ہے ہر پرایا ہر عدو
زندگانی وقف کی تعلیم نسواں کے لئے
آخرش خالہ ہوئی عہدہ برا اور سرخرو
لڑکیوں کی خانہ آبادی کا بے حد شوق تھا
سینکڑوں ماؤں کو دلوائی پسندیدہ بہو
رشتہ داروں کی مدد کی قدردانی کے لئے
اس قدر خالہ کو تھا اپنوں کا پاس آبرو
کنج تنہائی کی یکسوئی مٹانے کے لئے
رکھ لئے تھے جانور خالہ نے گھر میں پالتو
اک بڑے صدمے سے میں دو چار ہو کر رہ گیا
موت خالہ کی نبی ہے وجہ خون آرزو
کچھ سمجھ آتا نہیں کیسے علاج غم کروں
چاک ہو دامان دل تو گیا ہو تدبیر رفو
کام صبر وضبط سے لیتا ہے غم میں آدمی
ورنہ اشکوں کی جگہ بہنے لگے اس کا لہو
یہ یقین رکھتے ہوئے دنیا میں اب خالہ نہیں
شوق کی بے اختیاری سے رہے گی جستجو
مرحلے سب حشر کے ہوں سہل خالہ کے لئے
لے کے جائے چہرہ روشن خدا کے روبرو
خلد کی ٹھنڈی ہوا سے روح اس کی شاد ہو

دور لاکھوں میل خالہ سے رہے دوزخ کی لو
روح خالہ کی رہے اللہ کے سائے تلے
یہ دعائے خیر حق سے مانگ اے آزاد تو
کہتے ہیں اہل جہاں درد اجل ہے لا دوا
زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبال

ادبیانہ خدمات کا ملکی اور غیر ملکی سربراہان کا اعتراف

جنرل محمد ضیاء الحق

اسلام آباد

۶ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ

۹ جولائی ۱۹۸۱ء

محترمہ

السلام علیکم

آپ کی دو کتابیں لمعات اور منظوم حکایات ملیں۔ ان کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

اگرچہ ہمارے ہاں شعر و شاعری کی کتابوں کی کوئی کمی نہیں... اور اس تخلیقی کام میں خواتین بھی پیش پیش ہیں... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعری جیسے موثر ذریعہ اظہار کو معاشرے کی اصلاح کے لئے استعمال کیا جائے تو بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت علامہ محمد اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جن کا آپ کی دونوں کتابوں کے انتساب میں ذکر ہے۔ علامہ مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک قوم کے تن مردہ میں حیات نو پھونک دی تھی۔ میرے خیال میں علامہ اقبال کے کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مجھے آپ کی مذکورہ دونوں تصانیف میں ان کا اسلامی ، اخلاقی اور تعمیر پہلو پسند آیا۔ امید ہے آپ کا قلم معاشرے کی تزئین میں اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔

محترمہ وحیدہ روشن پروین صاحبہ

ایم۔ اے ،بی۔ ایڈ

ہیڈ مسٹریس / شیخ سردار محمد گرلز ہائی اسکول

۹۶۔ علامہ اقبال روڈ ،لاہور

آپ کا خیر اندیش

محمد ضیاء الحق

ملکہ فرح دیبا کا ایک خط فارسی زبان میں میرے پاس موجود ہے اور اس کا عکس دستاویزات کے حصے میں دے رہی ہوں۔

آفتاب اقبال کے ددھیال

آفتاب اقبال کی دادی جان کا نام امام بی بی تھا۔ لیکن گھر اور محلے برادری میں انہیں "بے جی" کہتے تھے۔ وہ سیالکوٹ کے قریب موضع سمبڑیال کی رہنے والی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کی شادی ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل ہوئی تھی۔ دیہاتی ماحول کی لڑکیاں تو آج بھی زیور تعلیم سے آراستہ نہیں ہوتیں اور وہ تو انیسویں صدی کی تقریباً پہلی چوتھائی میں تعلیم کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

ان دنوں تربیت کا پہلو بڑا جاندار ہوتا تھا اور بچے تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود سماجی سوجھ بوجھ سے کماحقہ، آگاہ ہوتے تھے۔ محلے میں لوگ ان کی قدر کرتے تھے اور تنازعات میں انہیں "ثالث" مقرر کرتے تھے اور وہ خوش اسلوبی سے ثالثی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔

ان میں "اکل حلال" کو ترجیح دینے کا مادہ اتنا راسخ تھا کہ علامہؒ نے ان کے انتقال کے موقع پر اس کا بہت ہی اچھے الفاظ میں تذکرہ فرمایا تھا۔

علامہؒ کو ٹوٹ کر چاہتی تھیں اور انہیں لاہور سے اپنے بیٹے کے خط کی انتظار رہتی تھی اور جب علامہؒ شہرت کے زینوں پر گامزن ہوئے تو ان کی والدہ محترمہ انہیں داغ مفارقت دے گئیں اور انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کے انتقال پر جو مرثیہ کہا ہے اس میں شاعرانہ قوت اظہار کے ساتھ ساتھ ایک مومن کی نظر میں فلسفہ موت بڑے موثر پیرائے میں بیان فرمایا ہے اور ہمارے بہت سے محققین نے اسے "عالمی ادب" میں ایک شاہکار گردانا ہے۔ علامہ کی بڑائی کا انکشاف اسی مرثیے کو پڑھ کر ہوتا ہے کیونکہ عموماً چالیس سال کو پہنچ کر انسان عقل سلیم کا حامل قرار پاتا ہے اور ہمارے علامہؒ نے ایک عالمی شہرت کا مرثیہ اس وقت ترتیب دیا جبکہ وہ ابھی چالیس سال کے

پیٹے میں نہ تھے۔

شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں "بے جی" کے بہت سے واقعات بیان کئے ہیں اور وہ تقریباً ان کی فوتیدگی پر پندرہ سال کے پیٹے میں تھے اور ان کی وفات کا تذکرہ یوں بیان فرمایا ہے جیسے مرحومہ کی میت کو ہماری آنکھوں کے سامنے تابوت میں رکھ کر عزیز و اقارب رولنہ ہوا چاہتے ہیں۔

پھوپھی کریم بی بی اور شیخ عطا محمد کے حوالے سے بھی بہت سے واقعات بیان فرمائے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں "بے جی" کے انتقال پر آفتاب اقبال صاحب کے دادا جان بڑے افسردہ سے رہنے لگے اور ان کی افسردگی کو مٹانے کے لئے علامہؒ اپنا تازہ کلام اکثر و بیشتر انہیں رولنہ فرماتے تھے۔ آخر اپنی زوجہ کے انتقال کے بعد "میاں جی" یعنی آفتاب اقبال صاحب کے دادا جان بھی ۱۹۳۰ء میں راہی ملک بقاء ہوئے اور اس راہ پر ہر انسان کو چلنا ہے اور شاہ مدار" جیسی طویل عمر پانے کے باوجود حکم ربی کے مطابق اس دنیا سے کوچ کرنا ہر بشر کی زندگی کا مقدر ہے۔ مرحومہ نے جس بہتر انداز میں اپنی اولاد کو تربیت دی اس کا عشر عشیر بھی موجودہ دور کی تعلیم یافتہ ماؤں سے تصور کرنا ناممکن ہے۔

اس دور میں حروف شناس مائیں نہیں تھیں لیکن مذہب اور معاشرت کے ضروری مسائل سے بخوبی آگاہ ہوتی تھیں اور اسی آگاہی کو وہ اپنی آئندہ نسل کو منتقل کرتی تھیں اور آج نسل در نسل منتقلی کا سلسلہ ختم گیا ہے اور سارا مسئلہ بس قدرت کے قبضہ اختیار میں دے کر ہر کوئی اپنے کو بری الذمہ سمجھتا ہے۔ یہی ہمارے دور کی غلطی ہے جس کا احساس کسی خاندان کو نہیں رہا۔

مہتاب بی بی صاحبہ جناب شیخ اعجاز احمد صاحب کی والدہ محترمہ
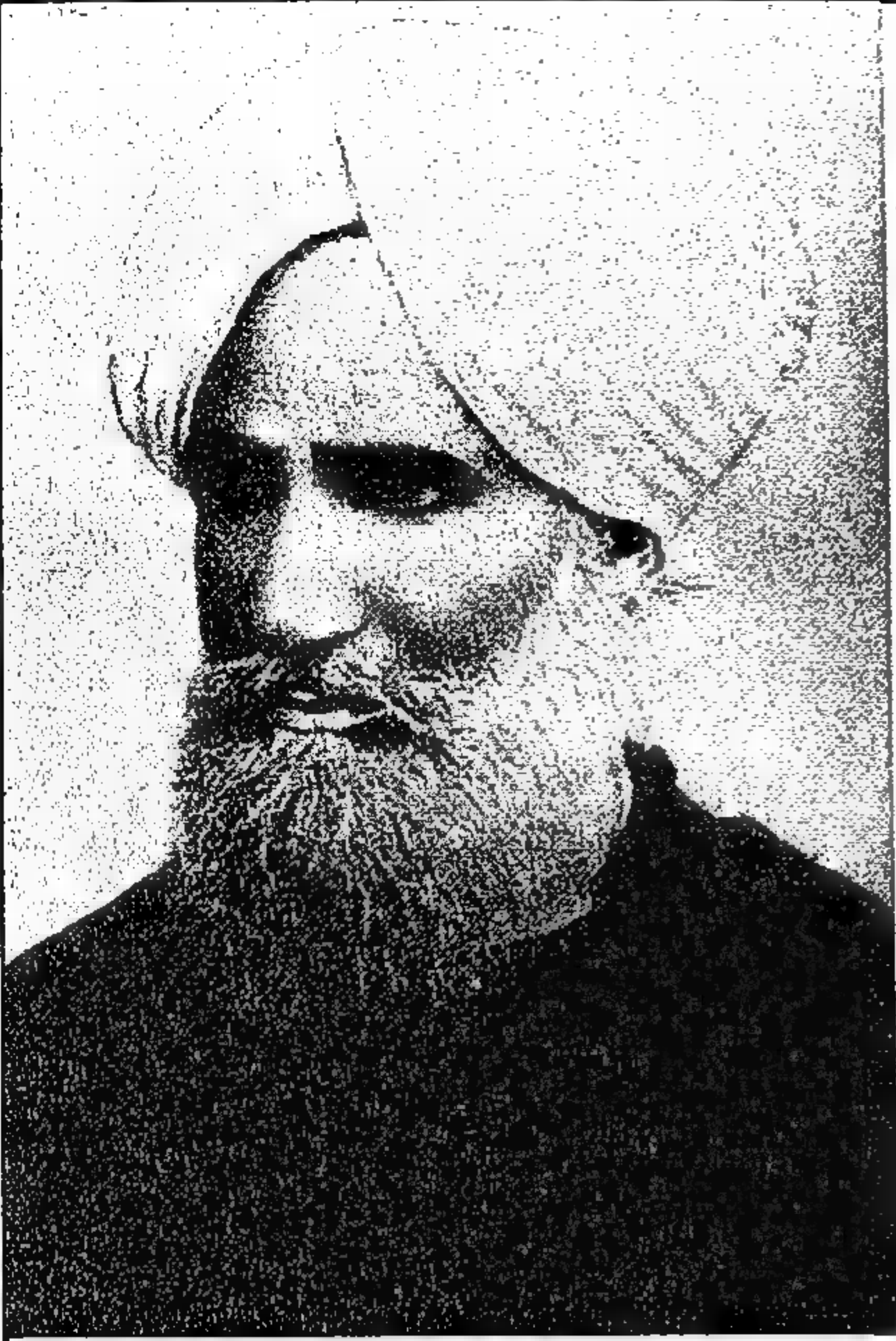
علامہ اقبال کے والد محترم جناب شیخ نور محمد صاحب

علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد

شیخ اعجاز احمد صاحب علامہ اقبال کے بڑے بھتیجے

آفتاب اقبال کے دادا جان

آفتاب اقبال کے دادا جان کا نام شیخ نور محمد تھا اور عرف شیخ نتھو۔ گھر میں اور محلے برادری میں انہیں "میاں جی" کے نام سے پکارتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں ان کے انتقال کے موقع پر میونسپل کمیٹی میں جو فوتیدگی کی رپورٹ درج کروائی گئی ہے اس میں بھی ان کا نام شیخ نور محمد درج ہے۔ بعض محقق نجانے کس طریقے سے ان کا نام شیخ نتھو اصلی قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ حالانکہ جب ان کے بڑے بھائی نے جب رُڑکی انجینئرنگ کالج سے اوورسیئر کا امتحان پاس کیا تھا اس وقت بھی ان کا نام شیخ نور محمد ہی ملتا ہے۔ آفتاب اقبال کے تایازاد بھائی شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں ان کی عرفیت پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کو بڑے اچھے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

"میاں جی" نے اپنے گھرانے میں سب سے پہلے باقاعدہ درزی کا پیشہ اختیار کر کے اپنی روزی پیدا کی ورنہ اس دور میں ان کے آباؤاجداد کا پیشہ سوداگری تھا اور مختلف قسم کے کمبل اور کھیس وغیرہ فروخت کر کے اپنی روزی پیدا کرتے تھے۔ اپنے خاندان کے لوگوں کے برعکس شیخ صاحب نے درزی کا پیشہ اختیار کیا اور اسی دور میں خواتین کے برقعوں کی ٹوپیاں تیار کرنے میں اتنی مہارت حاصل کی کہ لوگ انہیں "ٹوپیاں والے" کے نام سے یاد کرنے لگے اور جب ان پر بڑھاپا غالب آیا تو انہوں نے اپنا کاروبار اپنے داماد شیخ غلام محمد کے حوالے کر دیا۔

ان کی رسمی تعلیم بالکل نہیں تھی بس مساجد میں ناظرہ قرآن پاک کی تحصیل کے ساتھ ساتھ فارسی حروف شناسی بھی کروادی جاتی تھی اور تھوڑی بہت سوجھ بوجھ والے بچے از خود فارسی اور اردو کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جاتے تھے۔

"میاں جی" خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے علامہ اقبال کے عروج کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہ فارسی زبان کی اتنی شد بد رکھتے تھے کہ وہ اپنے فرزند کے کلام کو بخوبی پڑھ سمجھ سکتے تھے۔

سید سلطان محمود حسین صاحب نے انہیں اپنے ہم عصروں میں "ان پڑھ فلسفی" کے لقب سے مشہور شخصیت قرار دیا ہے۔

شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی کتاب میں ان کا "کلام" بھی دیا ہے جو انہوں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد فی البدیہہ کہا تھا۔

بہر کیف "میاں جی" اور ان کے نامور فرزند علامہ اقبال کی فوتیدگی میں صرف آٹھ سال کا فرق پڑا۔ جبکہ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد ۱۹۴۰ء میں چل دیئے۔

"میاں جی" نے آفتاب اقبال کی تربیت میں بڑا کردار ادا کیا اور مرحوم آفتاب اقبال اپنے دادا جان، نانا جان اور علامہ میر حسن کے شکر گزار تھے کہ بچپن میں ان کی روحانی تربیت کا کام ان ہستیوں نے انجام دیا جن کا نام پورے برصغیر میں دیانت تصوف اور علم میں بڑے ادب اور احترام سے لیا جاتا ہے۔

آفتاب اقبال کی پھوپھیاں

رشیدہ بیگم

آفتاب اقبال کی بڑی پھوپھی کا نام فاطمہ بی تھا۔ فاطمہ بی کی کرم الٰہی سے شادی ہوئی تھی۔ خاوند سے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ اس طرح ساری عمر پریشانیوں میں گزری۔ دو لڑکے فضل الٰہی اور فضل حق تھے۔ کرم الٰہی کوئٹہ میں کاروبار کرتے تھے پہلے اسپورٹس کی دوکان تھی پھر موٹروں کی مرمت کے لئے گیراج کھول لیا۔ پھر موٹر کے پرزوں اور موٹروں کی خرید و فروخت کرنے لگے۔ کرایہ پر کاریں بھی دیا کرتے تھے "مظلوم اقبال" میں انہی پھوپھی صاحبہ کے میاں پھوپھا کرم الٰہی کے بارے میں مکتوب نمبر ۲۰ میں یوں آغاز کیا ہے۔

"جولائی ۱۹ کے دوسرے ہفتے میں مجھے ایک دوست کی برات کے ساتھ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو میں چچا جان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ پھوپھا جی کی کار کے متعلق میں نے بتلادیا کہ موٹر بڑا ہے۔ اس میں سب کے لئے گنجائش نکل آئے گی۔ چنانچہ چچا جان نے سفر کے لئے ۲۹ جولائی مقرر کی اور کہا کہ وہ مجھے بذریعہ تار کار لانے کو کہیں تو میں کار لے کر لاہور آجاؤں۔ اس پروگرام سے انہوں نے میاں جی کو بھی اس خط کے ذریعہ مطلع کیا۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا ہے وہاں بھی خدا کا فضل ہے۔ خدا تعالیٰ نے اچھا سبب بنا دیا ہے۔ بھائی صاحب کی خیر خیریت ہر دوسرے تیسرے روز مل جاتی ہے۔ یا تو کوئی آدمی وہاں سے آجاتا ہے یا دستی

خط آجاتا ہے۔ غرضیکہ یہ خدا کا خاص فضل ہے۔ اعجاز برات پر آیا تھا اور مجھ سے بھی ملا تھا۔ اب وہ گھر پہنچ گیا ہے۔ امید ہے آپ کو اس نے سب حالات بتادیئے ہوں گے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ آپ کی زندگی میں یہ خوشی نصیب ہوئی۔ بارش کل تھوڑی سی ہوئی تھی مگر آج گرمی بدستور ہے۔ انشاء اللہ میں ۲۹ جولائی کو حاضر ہونے کا قصد رکھتا ہوں۔ موٹر منگوالیا جائے گا۔ گھر کے سب آدمی اسی میں آجائیں گے۔ ذوالفقار علی خان کا موٹر مرمت ہو رہا ہے اور امید نہیں کہ اس کی مرمت آخر جولائی تک مکمل ہو ۔باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال لاہور۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۹

علامہ اقبال کی اس بہن اور بہنوئی کی وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ ویسے "مظلوم اقبال"، میں دیئے ہوئے شجرہ نسب میں ان کے بڑے بیٹے فضل الٰہی (م) کے چار بیٹوں (عبدالحق ، عبدالرشید ، عبدالوحید اور سلیم) کا ذکر ہے اور پانچ بیٹیوں (صغریٰ، زہریٰ ، زبیدہ ، حمیدہ اور فہمیدہ) کا بھی ذکر ملتا ہے۔

ان کے بیٹوں کے بارے میں کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ ان کی دو بیٹیاں خواجہ عبدالحمید عرفانی اور ڈاکٹر خواجہ احمد (خلف الرشید مولوی الف دین نفیس) سے رشتہ ازدواج میں منسلک تھیں۔

فضل الٰہی صاحب کو میں نے ۱۹۴۳ء میں کلکتہ میں دیکھا ہے۔ وہ ایک تین کمرے کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ دو کمرے ان کے اہل خانہ کے لئے وقف تھے اور تیسرے کمرے میں وہ اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے کے لئے ایک پامسٹ کا دھندہ کرتے تھے۔ ابھی خواجہ فاروق اور سروش عرفانی کے خطوط سے پتہ چلا کہ فاطمہ بی کے

بڑے صاحب زادے فضل الٰہی پشاور میں انتقال کر گئے اور ان کی اہلیہ اکبری بیگم کوئٹہ میں فوت ہو گئیں۔

فاطمہ بی بی کے دوسرے صاحبزادے فضل حق چوہدری ریاست علی (ناظم علامہ اقبال لائبریری) کے مطابق کسی نامعلوم سال میں سیالکوٹ میں انتقال فرما گئے اور ان کے لواحقین میں تین صاحبزادے لاہور میں مقیم ہیں اور اپنے اپنے حلقہ کار میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا صاحبزادہ جالی ایک بین الاقوامی شہرت کا حامل آرٹسٹ ہے خواجہ فاروق (مقیم لاہور) کی وساطت سے جالی کے لاہور کے ایڈریس کا علم ہوا۔ جالی صاحب سے ان کے والد محترم اور ان کے والد کی دو خالاؤں کی فوتیدگی کے بارے میں پوچھا۔ کافی دنوں سے ان کی طرف سے جواب موصول نہیں ہوا۔ اب اگر اور "انتظار" کیا جائے تو یہ سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔ میں نے اپنی کوشش سے علامہ کی بہن کے بارے میں بڑی تلاش و جستجو کے بعد یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں فاطمہ بی بی صاحبہ کے بیٹوں اور پوتوں کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آفتاب اقبال کی پھوپھی کا نام طالع بی تھا۔ شیخ اعجاز احمد کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے میاں غلام محمد صاحب کو شیخ نور محمد صاحب نے پارچہ دوزی کا کام سکھایا تھا اور جب شیخ نور محمد نے "ٹوپیاں" بنانے کا کاروبار ختم کر دیا تو ان کی جگہ ان کے داماد غلام محمد نے کام سنبھال لیا۔

علامہ اقبال کی یہ بہن جوانی کے عالم میں ۱۹۰۲ء میں انتقال فرما گئیں اور ان کی

نشانی چار بچے (نور احمد، خورشید احمد، ظہور احمد اور منظور احمد) تھے اور ان کے دو بچوں کے بارے میں اقبالیات میں چند واقعات موجود ہیں۔

مثلاً" اس کتاب میں "شیخ عطا محمد کے خطوط بنام آفتاب اقبال ،، میں اپنے ایک مکتوب میں شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ نور احمد کو باپ نے گھر سے نکال دیا ہے اور ایک وہ مختلف جگھوں پر گھومتا پھرتا ہے اور اپنے تئیں علامہ اقبال کا بھانجا ظاہر کر کے لوگوں سے پیسے بٹورتا ہے۔

ان کے دوسرے صاحبزادے (پروفیسر منظور احمد) کا علیحدہ سے احوال اس کتاب میں موجود ہے اور پروفیسر صاحب کے بارے میں پہلی بار احوال دیا گیا ہے اور مجھے یہ معلومات چوہدری ریاست علی ناظم علامہ اقبال لائبریری سیالکوٹ اور صفی اللہ صاحب بن ظہور احمد صاحب سے دستیاب ہوئی ہیں۔ صفی اللہ صاحب لاہور مقیم ہیں اور میں صفی اللہ صاحب سے ٹیلی فون پر بات چیت کر چکی ہوں۔ باقی دو بھائی ظہور احمد اور خورشید احمد واجبی پڑھے لکھے تھے اور ان کا نام کہیں نہیں ملتا۔ لیکن ان کے بھائی پروفیسر منظور احمد صاحب کو کافی شہرت ملی۔ روایات اقبال میں عبداللہ چغتائی صاحب نے ان سے چھ روایات نقل کی ہیں۔ ایک شنید ہے کہ وہ علامہ اقبال سے ذرا خفا تھے اور ان کی خفگی کی وجہ ایم۔ اے فلاسفی میں کم نمبروں سے کامیابی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ علامہ نے ان کے ایم۔ اے کے پرچے جانچتے ہوئے جان بوجھ کر انہیں کم نمبر دیئے۔

لیکن شیخ اعجاز احمد کی کتاب "مظلوم اقبال ،، میں دیئے گئے خط نمبر ۱۴۱ میں معاملہ کچھ اور ہے شیخ صاحب خط نمبر ۱۴۱ کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

ہمارے پھوپھا غلام محمد (جن کے ساتھ ہماری منجھلی پھوپھی بیاہی ہوئی تھیں) کا ذکر میاں جی کے ذکر میں کیا جا چکا ہے۔ ہماری یہ پھوپھی میرے لڑکپن میں ہی چار بچے

چھوڑ کر فوت ہو گئی تھیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے (منظور احمد) کو پھوپھا جی نے میڈیکل اسکول امرتسر میں داخل کرنا چاہا۔

لیکن یہ خیال انہیں اس وقت آیا جب اسکول میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔ اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر میر ہدایت اللہ تھے۔ پھوپھا جی کے کہنے پر میاں جی نے چچا جان کو لکھا کہ وہ لڑکے کے داخلے کے لئے پرنسپل کو لکھیں۔ چچا جان نے جواب دیا کہ اسکول کا داخلہ بند ہو جانے کے بعد اب کسی طالب علم کا داخل کیا جانا شاید ممکن نہ ہو لیکن تعمیل ارشاد میں ڈاکٹر میر ہدایت اللہ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا وہی جواب آیا جس کی توقع تھی۔ اس پر میاں جی کو یہ خط لکھا۔

پھوپھا جی (غلام محمد) کو عمر بھر یہ شکوہ رہا کہ میرے بیٹے کے داخلے میں مدد نہیں کی۔

قبلہ وکعبہ ام السلام علیکم

کئی دن ہوئے ایک خط غلام محمد کے لڑکے (منظور احمد) کے بارے میں آپ کی خدمت میں لکھا تھا جس کا مفہوم اعجاز کہتا ہے کہ میں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ آج میر ہدایت اللہ صاحب کا جواب آیا ہے جو میرا خیال تھا صحیح نکلا۔ ڈاکٹر میر ہدایت اللہ لکھتے ہیں کہ کالج و اسکول کا داخلہ بند ہو چکا ہے اب کسی کے اثر رسوخ سے کوئی لڑکا اسکول میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اطلاعاً" عرض ہے۔ اب اس کو یا تو اسلامیہ کالج میں داخل ہو جانا چاہئے یا ایک برس انتظار کرنا ہوگا اگر وہ میڈیکل اسکول میں داخل ہونا چاہتا ہے باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

محمد اقبال لاہور۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۹

اس خط سے یہ نکتہ بھی ہاتھ لگتا ہے کہ پروفیسر منظور احمد کی تاریخ پیدائش غالباً "۱۹۰۲ء ہے اور اسی سال پروفیسر منظور کی والدہ طالع بی کا انتقال ہوا تھا۔

بہر کیف میں نے اپنے طور پر پروفیسر منظور احمد کی خفگی کا تھوڑا بہت سراغ لگایا ہے تو اس خفگی میں ان کے والد غلام محمد کا بھی ہاتھ تھا کیونکہ انہیں گلہ تھا کہ ان کے بیٹے کے سلسلے میں سفارش کیوں نہیں کی گئی جبکہ پرنسپل کے خط سے پورا مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ وہ اپنے اصول کے پکے تھے اور وہ کسی کی سفارش کے روادار نہ تھے اور علامہ کے بہنوئی غلام محمد صاحب نے شاید اسے "ٹرخانے ،، کا بہانہ سمجھا ہو اور ان کے دل میں تھوڑی بہت رنجش پیدا ہوئی ہو اور پھر یہ رنجش باپ سے منتقل ہو کر بیٹے کے رگ و ریشے میں پیوست ہو گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ظہور احمد کی بیٹی مسرت علامہ کی بیٹی منیرہ کے پاس پندرہ سال لاہور میں رہی - اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ آخری عمر میں بیمار ہوئیں اور سیالکوٹ واپس آگئیں۔ ۶ ماہ بعد فروری ۱۹۹۸ء میں وفات پائی۔ سیالکوٹ میں دفن ہیں۔ منیرہ کی بڑی گہری دوست تھی۔

آفتاب اقبال کی چار پھوپھیاں تھیں۔ فاطمہ بی اور طالع بی بڑی تھیں۔ کریم بی اور زینب بی چھوٹی تھی۔ علامہ اقبال کے زمانے میں اسکولوں کا اجرا ہوا تھا ورنہ شہروں میں مکتب تھے۔ جہاں بچے اور بچیوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ جب ۱۸۴۶ء کے بعد پورے ہندوستان پر یونین جیک لہرانے لگا تو انگریزوں نے اپنی پالیسی کے تحت مشنری اسکولوں کا جال پھیلا دیا اور رفاہ عام کی خاطر مختلف مقامات پر سرکاری ڈسپنسریاں کھولیں جہاں بیماروں کا مفت معالجہ ہوتا تھا۔ اب مشنری اداروں کے اجراء کے ساتھ سمجھ دار گھرانوں نے اپنے بچے اور بچیوں کو ان مدارس میں "جدید تعلیم ،، کی خاطر بھیجنا شروع

کیااور پنجاب کے علاوہ دوسرے ہندوستان کے علاقوں میں تعلیمی اداروں کا جال بچھ چکا تھا۔ بہر کیف علامہ اقبال کی اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی چھوٹی بہن کو اسکول بھجوایا گیا۔ علامہ اقبال کی اس بہن کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور اس زمانے میں "اقبال منزل "، میں دو پڑھی لکھی خواتین تھیں۔ ایک علامہ کی بیٹی معراج بیگم اور ایک علامہ اقبال کی بہن کریم بی بی تھیں۔

کریم بی بی کی تعلیم کا ذکر شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال "، میں جا بجا کیا ہے اور انہیں مذہبی تعلیم میں بہت ہی بہتر معلومات کا حامل قرار دیا ہے اور انہیں اللہ والوں اور پیغمبروں کے حالات سے مکمل آگہی تھی اور وہ وقتاً" فوقتاً" کسی مذہبی حث میں حصہ لیتی تھیں اور اپنی معلومات کی بدولت کسی سے کم نہ تھیں۔

کریم بی بی کی مالی حالت درست نہیں تھی۔ ان کی شادی ضلع گوجرانوالہ والے کے ایک قصبے نت کے رہنے والے احمد دین سے ہوئی تھی۔ کریم بی بی زیادہ تر اپنے والدین کے ہمراہ "اقبال منزل "، ہی رہیں۔ علامہ اقبال اپنے والد محترم کے لئے مبلغ ایک سو روپیہ ماہوار سیالکوٹ بھجواتے تھے اور اس رقم میں سے مبلغ پندرہ روپے کریم بی بی کے لئے ہوتے تھے (اس دور میں پندرہ روپے کی قوت خرید آج کے دور کے کئی سو سے زائد تھی) کریم بی کے تین صاحبزادے تھے۔ سب سے بڑے ظفر الحق تھے، وہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور وہ آفتاب اقبال، مختار احمد اور شیخ اعجاز احمد کے ساتھ کھیلے تھے۔ گو عمر میں چھوٹے تھے لیکن کھیل کود میں شریک ہوتے تھے۔

بڑے بیٹے ظفر الحق نے بی ایس سی کیا اور پھر انجینئر بن گئے اور انہوں نے انجینئر کی ڈگری لندن سے حاصل کی تھی۔ انجینئر بننے کے بعد ہندوستان میں محکمہ صحت میں رہے اور پھر وہ بیرون ملک سعودی عرب چلے گئے۔ وہاں انہوں نے برسوں ملازمت کی

اور اپنے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور تقریباً" سب لڑکے اور لڑکیاں غیر ملکی تعلیم کے حامل ہیں۔ بیٹے اچھے عہدوں پر فائز ہیں لیکن دونوں بڑی لڑکیاں بار ایٹ لا ہونے کے باوجود اس مقام پر فائز نہیں جس کی وہ مستحق تھیں۔

ظفر الحق کی والدہ کریم بی بی صاحبہ اپنی بھاوج سردار بیگم (م ۱۹۳۵) کے انتقال کے بعد لاہور اپنے بھائی علامہ اقبال کے ہاں چلی گئیں۔ ان دنوں علی گڑھ کے پروفیسر جناب رشید احمد صدیقی کی وساطت سے علامہ اقبال کو ایک جرمن گورنس ڈورس مل چکی تھیں۔ وہ گھر کا پورا خیال رکھتی تھیں اور بچوں کی تربیت بھی ان کے ذمہ تھی اور مس ڈورس نے اپنی ڈیوٹی پوری تندہی اور دیانت داری سے انجام دی۔ آخر ۱۹۵۸ء میں کریم بی صاحبہ کا انتقال ہو گیا اور وہ سیالکوٹ میں قبرستان کشیریاں میں دفن ہیں اور ۱۹۹۰ء میں ان کے بڑے صاحبزادے ظفر الحق کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔

ایک صاحبزادے محمد اصغر بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے اور ظفر الحق صاحب سے چھوٹے محمد سرور تھے جو لاہور میں مقیم تھے اور کچھ عرصہ پہلے وہ بھی چل بسے۔ شیخ ظفر الحق کی صاحبزادی گیتی شیخ سے بھی سرور صاحب کے بارے میں معلومات نہ حاصل ہو سکیں۔ دوسرے قریبی عزیز ہی صحیح معلومات فراہم کر سکتے تھے۔ گیتی شیخ کی ایک دور کے رشتے کی پھوپھی تھیں ان سے رابطہ کیا لیکن سرور صاحب کے بارے میں معتبر معلومات نہ حاصل ہو سکیں۔

بہر کیف یہ بات طے ہے کہ علامہ اقبال کے خاندان کے لوگوں کی اکثریت لاہور میں مقیم ہے اور علامہ اقبال کے دور کے رشتہ داروں میں سے کچھ ہندوستان کے شہر ناندیڑ میں رہائش پذیر ہیں۔ حالات دریں ان سے رابطہ بڑا مشکل ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ناندیڑ سے علامہ اقبال کے ایک عزیز سیالکوٹ میں ٹھہرے اور انہوں نے علامہ اقبال

لائبریری کے ناظم چوہدری ریاست علی کو ایک شجرہ نسب عطا کیا جو ۱۹۹۷ء کے دورہ سیالکوٹ میں مجھے پیش کر دیا گیا۔ میرے پاس نانڈیٹر میں مقیم عزیزوں کا ایڈریس بھی ہے۔ لیکن حالات کی نزاکت کے پیش نظر براہ راست رابطہ کرنے سے گریز کیا ہے علامہ کے آٹھ بھانجے تھے لیکن صرف دو بھانجوں کو شہرت ملی۔ ایک پروفیسر منظور احمد (طالع بی کے فرزند) اور دوسرے ظفر الحق (کریم بی کے فرزند) کو۔

آفتاب اقبال کی سب سے چھوٹی پھوپھی زینب بی تھیں۔ وزیر آباد میں بابو غلام رسول سے بیاہی ہوئی تھیں۔ جب کچھ عرصے تک ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی تو ان کی ساس نے انہیں گھر سے نکال دیا اور وہ اپنے میکے میں رہنے لگیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ساس صاحبہ نے اپنے بیٹے کی دوسری اور تیسری شادی کر دی۔ بڑی دقتوں کے بعد صلح ہوئی تو وہ دوبارہ وزیر آباد چلی گئیں۔ کیونکہ ان کی ساس انتقال کر چکی تھیں۔ میاں نے گھر کی سرداری انہیں سونپ دی تھی اور اپنی سوکنوں کی اولاد کی شادیاں بھی انہوں نے خود کیں۔ ایک سوکن کے لڑکے کی شادی شیخ عطا محمد کی بیٹی عنایت سے کی اور ایک سوکن کی بیٹی کی شادی شیخ عطا محمد کے لڑکے شیخ مختار احمد سے کی ان کے میاں بڑے متقی اور معاملہ فہم تھے اور فیروز پور میں محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے بابو غلام رسول کی زبانی سنا ہے کہ علامہ اقبال حضرت قاضی سلطان محمودؒ کے مرید تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً" گیارہ بارہ سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی ایک نواسی کراچی میں مقیم ہیں۔ (یعنی مختار احمد کی بیٹی)۔ زینب بی خود لاولد رہیں لیکن گھر میں ابتدائی ایام میں مشکلات کا سامنا کیا لیکن ساس کے انتقال کے بعد انہیں کچھ سکون نصیب ہوا اور وہ اپنے گھر میں آباد رہیں۔ ورنہ ساس صاحبہ نے ان کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔

علامہ اقبال کی اس بہن کی فوتیدگی کا بھی علم نہ ہو سکا۔ ویسے یہ طے ہے کہ وہ وزیر آباد میں دفن ہیں۔ ان کی صحیح تاریخ وفات سے پردہ نہ اٹھ سکا۔ میں نے اپنے طور پر ان کی نواسی سے رابطہ کیا لیکن اسے بھی اپنی نانی کی فوتیدگی کا علم نہ تھا۔

شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں متعدد جگہ اپنی اس پھوپھی کا ذکر کیا ہے۔ میری کوشش تھی کہ علامہ اقبال کے خاندان کے اخلاف کے بارے میں حتمی اور مناسب معلومات فراہم کروں لیکن چند عزیزوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے میں یہ کام بطریق احسن انجام دینے سے قاصر رہی ہوں۔

میں اٹکل پچو اور غلط سلط معلومات سے اپنا دامن بچاتی رہی ہوں اور بالکل صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ معتبر ذرائع سے جتنی اور جس قدر معلومات بہم پہنچیں انہیں نہایت دیانتداری سے قارئین تک پہنچا رہی ہوں۔

میری کتاب میں چند مضامین اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑے اہم ہیں اور آج تک اس طرز پر ان پر قلم نہیں اٹھایا گیا۔

مجھے افسوس ہے کہ ہم آج اپنے بزرگوں سے بے خبر ہیں۔ ہمیں اتنا ہوش نہیں رہا کہ ہمارے بڑے کب ہمارے سے جدا ہوئے۔ حالانکہ اسلام میں "اسماء الرجال" ایک علیحدہ اور منفرد علم ہے جس کے حامل علماء گزرے ہیں۔ ان کے ذہن میں لوگوں کے خاندانوں کے بارے میں ہی معلومات نہ ہوتی تھیں بلکہ وہ اپنے جانوروں کے شجرہ نسب سے بھی واقف ہوتے تھے۔

علامہ اقبال کی خوشدامن، زینب بی بی صاحبہ

علامہ اقبال کے خسر جناب ڈاکٹر حافظ عطا محمد صاحب
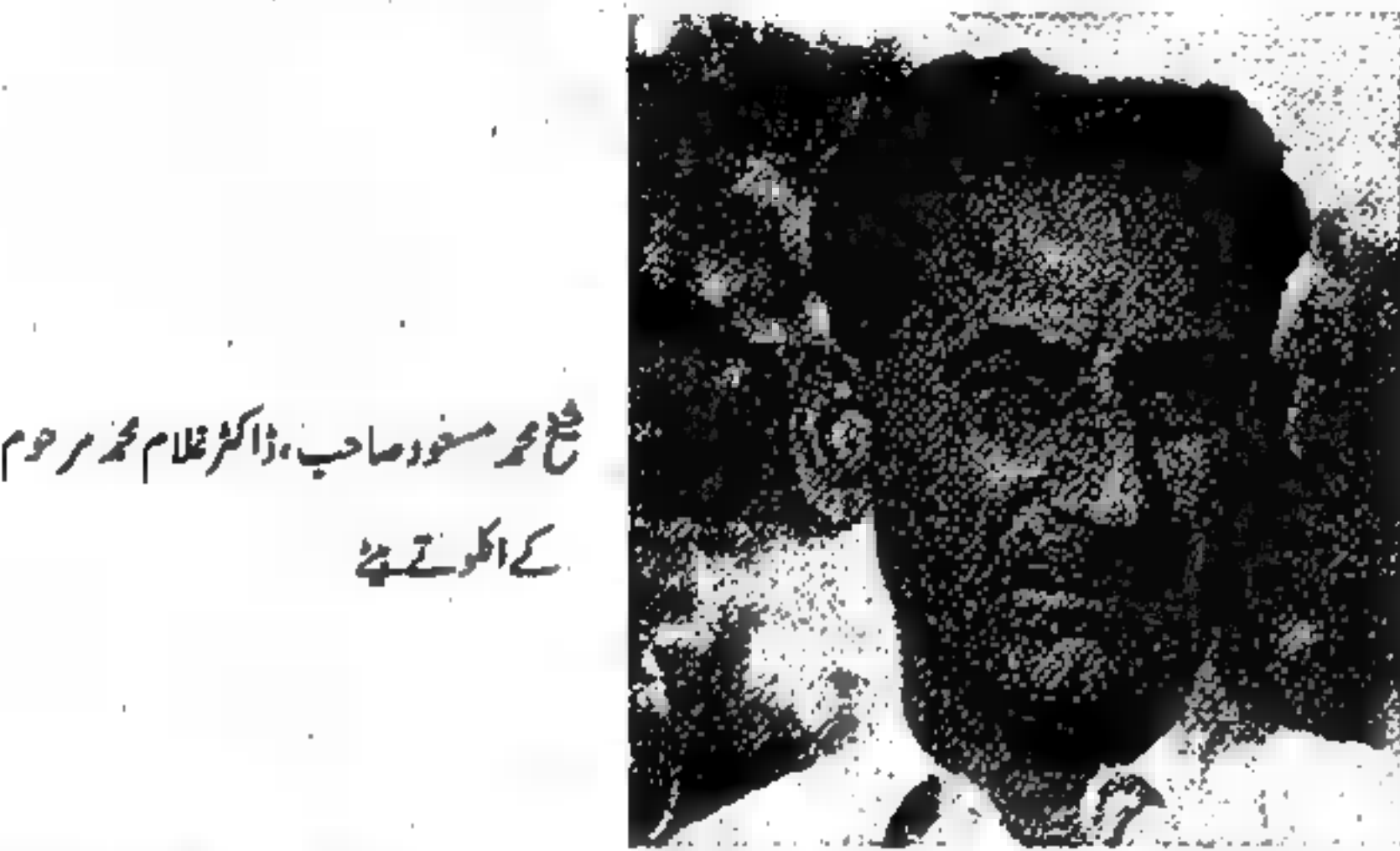
شیخ محمد مسعود صاحب، ڈاکٹر غلام محمد مرحوم
کے اکلوتے بیٹے

آفتاب اقبال صاحب کے اکلوتے ماموں جناب ڈاکٹر کیپٹن غلام محمد صاحب
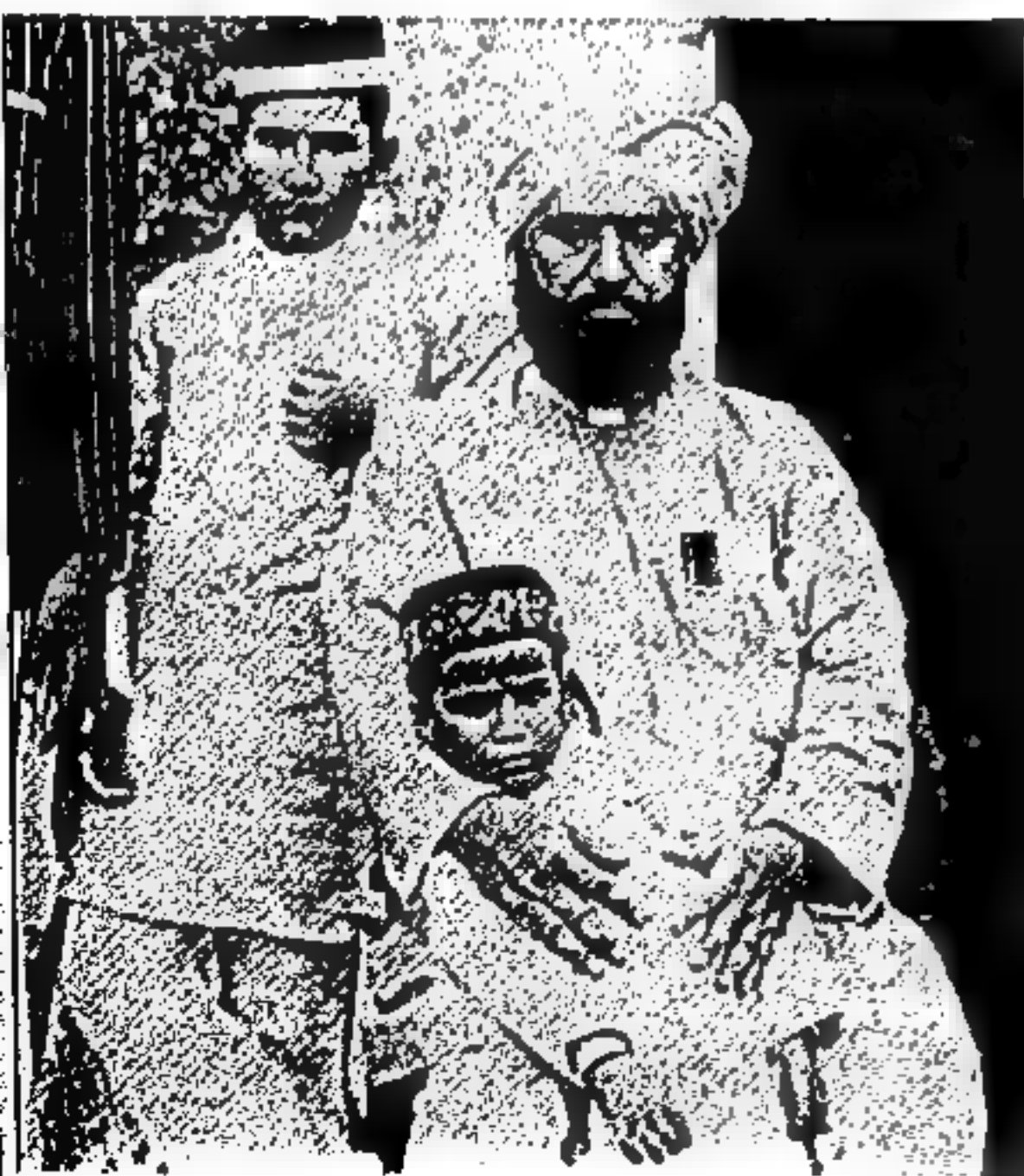
آفتاب اقبال ۱۹۰۱ء میں اپنے نانا جان کی گود میں، عقب میں
ان کے ماموں کیپٹن غلام محمد کھڑے ہیں

آفتاب اقبال کے ننھیال

خان بہادر الحاج ڈاکٹر حافظ شیخ عطا محمد

ڈاکٹر شیخ عطا محمد، اقبال کی زوجہ اولیٰ کریم بی بی کے والد تھے۔ گجرات شہر کے محلہ کٹرہ شالبافاں میں رہتے تھے۔ ان کے دادا تجارت کی غرض سے کشمیر سے پنجاب آئے اور گوجرانوالہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان کا تعلق کشمیریوں کی راٹھور گوت سے تھا۔ وہ زعفران اور دیگر اجناس کشمیر کی تجارت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے شیخ عبداللہ کو تعلیم دلوائی۔ وہ انگریز سرکار میں ملازم ہو گئے اور پنجاب کے داروغہ جیل کے عہدے تک پہنچے اور گجرات شہر کے محلہ کٹرہ شالبافاں میں سکونت پذیر ہوئے۔

شیخ عطا محمد ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی حفظ کرتے رہے۔ ۱۸۷۲ء میں مشن اسکول گجرات سے میٹرک پاس کیا۔ اور اسی سال لاہور میڈیکل اسکول (موجودہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج) میں داخل ہوئے۔ جنوری ۱۸۷۸ء میں انہوں نے سب اسسٹنٹ سرجن کورس مکمل کرلیا۔ اس سال اس ادارے سے کل گیارہ طلباء نے یہ کورس پاس کیا جن میں سے شیخ عطا محمد واحد مسلمان تھے۔ اور وہ اس ادارے سے فارغ ہونے والے آٹھویں مسلمان ڈاکٹر تھے۔ گویا قیام (۱۸۶۰ء) سے لے کر ۱۸۷۸ء تک ۱۸ سالوں میں یہ مرتبہ حاصل کرنے والوں کی تعداد صرف آٹھ تھی۔ جن میں سے شیخ عطا محمد ایک تھے۔ لاہور میڈیکل اسکول میں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر برٹن براؤن (پرنسپل) خان بہادر ڈاکٹر رحیم خان (۱۸۲۹ء - ۱۹۰۶ء) ڈاکٹر محمد حسین خان اور ڈاکٹر نیل شامل تھے۔

یکم اگست ۱۸۷۸ء کو شیخ عطا محمد نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔

۱۵ ستمبر سے ۱۵ دسمبر ۱۸۷۸ء تک ہری پور ڈسپنسری میں انچارج رہے

۱۶ دسمبر ۱۸۷۸ء سے ۲۰ جنوری ۱۸۷۹ء تک میو ہسپتال میں جنرل ڈیوٹی پر رہے۔ اس کے بعد ان کی خدمات فوج کے سپرد کر دی گئیں۔ مہاراجہ پٹیالہ اور جیند کی افواج کے ساتھ بطور اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر تعینات رہے اور چند ماہ کوہاٹ، ہنگو وغیرہ میں رہے۔ پھر حکومت پنجاب کے تحت میو ہسپتال میں یکم جولائی سے ۸ ستمبر ۱۸۷۹ء تک رہے۔ اس کے بعد دوبارہ فوج کے ساتھ قرم فیلڈ فورس میں خدمات سر انجام دیتے رہے۔ جہاں وہ ۹ ستمبر ۱۸۷۹ء سے ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۰ء تک رہے۔ یہ جنگ افغانستان کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد انہیں فرسٹ گریڈ اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر ترقی دی گئی اور افغانستان وار میڈل بھی عطا کیا گیا۔ اس کے بعد وہ درج ذیل مقامات پر فائز رہے۔

میو ہسپتال لاہور (جنرل ڈیوٹی) یکم نومبر ۱۸۸۰ء تا ۲۱ جنوری ۱۸۸۱ء۔

علی پور ضلع مظفر گڑھ ڈسپنسری (انچارج) ۲۲ جنوری ۱۸۸۱ء تا ۲۱ اپریل ۱۸۸۱ء۔

میو ہسپتال (جنرل ڈیوٹی) ۲۲ اپریل ۱۸۸۱ء تا ۱۲ مئی ۱۸۸۱ء۔

سول ہسپتال امرتسر انچارج ۱۳ مئی ۱۸۸۱ء تا ۲۶ اکتوبر ۱۸۸۱ء۔

سول ہسپتال گجرات (جنرل ڈیوٹی) ۲۶ اکتوبر ۱۸۸۱ء تا ۲۱ جنوری ۱۸۸۲ء۔

سنٹرل جیل۔ لاہور ڈپٹی میڈیکل آفیسر ۲۲ جنوری ۱۸۸۲ء تا ۱۵ نومبر ۱۸۸۲ء۔

گجرات کے سرکاری طبیبوں کے انچارج ۷ انومبر ۱۸۸۲ء تا ۱۹ مارچ ۱۸۸۳ء۔

اس کے بعد ان کی خدمات گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر دی گئیں۔ وہ سرکاری ڈسپنسری قلات کے انچارج ۳ اپریل ۱۸۸۳ء سے ۱۹ جولائی ۱۸۸۴ء تک رہے۔ اس وقت ان کی تنخواہ دو سو روپے تھی۔

اس کے بعد آپ کو خصوصی طور پر ہز مجسٹی کو نسل حدیدہ اور قامران میں طبی خدمات پر تعینات کیا گیا۔ ساتھ ساتھ آپ وائس کونسل بھی تھے۔ یہاں آپ ۲۷ ستمبر ۱۸۸۴ء سے ۲۴ دسمبر ۱۸۹۱ء تک رہے۔ اس دوران آپ نے ۷ بار حج کی سعادت حاصل کی۔

حدیدہ (HODIEDA) آج کل یمن کی بندرگاہ ہے۔ اس دور میں شاید یہ سلطان روم کی سلطنت میں شامل تھا۔ قامران اس سے تقریبا" ۵۰ میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ ہے۔ حدیدہ میں امریکہ ،روس ،فرانس اور اٹلی کی کونسلیں بھی رہتی تھیں۔

حدیدہ کے قیام کے دوران ڈاکٹر عطا محمد نے بردہ فروشی کے انسداد کے لئے کی جانے والی کوششوں میں بھرپور مدد دی۔ جس کا اعتراف سیکریٹری آف اسٹیٹ نے کیا ۔اسی دوران ۲۴ مئی ۱۸۸۹ء کو آپ کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ سلطان روم کی جانب سے بھی تمغہ عثمانی دیا گیا۔ جسے سرکاری سطح پر قبول نہ کر سکے۔ ۱۸۹۱ء میں وطن واپس آئے۔ ان کی خدمات حکومت پنجاب کے سپرد کی گئیں۔ یکم جنوری ۱۸۹۲ء سے ۳۰ نومبر ۱۸۹۲ء تک جنرل ڈیوٹی پر رہے۔
چکوال ڈسپنسری یکم دسمبر سے ۱۶ دسمبر ۱۸۹۲ء تک رہے۔

پنڈدادن خاں ڈسپنسری ۲۲ دسمبر ۱۸۹۲ء سے ۱۸ اپریل ۱۹۰۱ء تک رہے۔ نومبر ۱۸۹۴ء میں اسسٹنٹ سرجن درجہ اول ہوئے۔

اسی دوران ۱۸۹۳ء میں آپ کو بڑی صاحبزادی کریم بی بی کی شادی محمد اقبال سے ہوئی۔ پنڈدادن خان میں ۲۳ جون ۱۸۹۸ء کو آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کو وائسرائے ہند کا اعزازی سرجن مقرر کیا گیا۔ جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

۱۹۰۰ء میں خان بہادر کو سینئر گریڈ میں ترقی دی گئی۔ بعد ازاں ان مقامات پر تعینات رہے۔

سول سرجن شاہ پور ۸ مئی ۱۹۰۱ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۰۱ء۔

سول سرجن ڈیرہ اسمٰعیل خان ۲۵ نومبر ۱۹۰۱ء تا ۲۵ دسمبر ۱۹۰۲ء۔

سول سرجن گوڑگاؤں ۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء تا ۱۸ فروری ۱۹۰۳ء۔

سول سرجن شاہ پور ۲۲ فروری ۱۹۰۳ء تا ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء۔

۳ ماہ کی رخصت ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء تا ۱۹ فروری ۱۹۰۴ء۔

سول ہسپتال راولپنڈی (انچارج) ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء۔

سول سرجن ڈیرہ غازی خان ۱۳ اپریل ۱۹۰۵ء تا ۲۶ ستمبر ۱۹۰۶ء۔

سول سرجن مظفر گڑھ ۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء تا ۲۱ مئی ۱۹۰۷ء۔

سول سرجن میانوالی ۶ جون ۱۹۰۷ء تا یکم دسمبر ۱۹۱۲ء۔

میانوالی سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی ۳۴ سالہ سرکاری ملازمت ، خدمت اور فرض شناسی کی روشن مثال تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔ آپ دو سال تک انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر عطا محمد ، نواب سر محمد احمد علی خان والئی ریاست مالیر کوٹلہ کے ہاں چیف میڈیکل آفیسر کے طور پر ملازم ہو گئے اور ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء تک یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ نواب نے آپ کی خدمات کو سراہتے ہوئے خلعت خاص بقدر تین ہزار روپے (سکہ ریاست مالیر کوٹلہ) عطا کی اور تعریفی سند بھی عنایت کی بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ریاست مذکور میں سینیٹر بھی رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب

گجرات آگئے اور کٹڑہ شالباقاں میں اپنے آبائی مکان میں مقیم رہے۔ آپ صحیح معنوں میں مومن پاکباز تھے۔ حافظ قران، صوم وصلوۃ کے بچپن سے پابند، جوانی سے بارلیش متعدد بار حج بیت اللہ کی سعادت۔ غربا اور مساکین کے مونس ومددگار نادار مریضوں کا نہ صرف علاج بلا معاوضہ کرتے بلکہ اپنی جیب سے ان کی مدد کرتے۔ آپ درجنوں بیواؤں کو ماہانہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ اپنی ملازمت کے دوران جہاں بھی رہے۔ لوگ آپ کی شرافت، دیانت، خدمت اور دینداری کے معترف رہے۔ دنیاوی اعزازات اور جاہ وحشم سے ان کی منکسر المزاجی اور جذبہ خدمت میں کبھی کمی نہ آئی۔ یہی وہ صفات تھیں جن کو دیکھ کر شیخ نور محمد نے ان سے ناتا جوڑا تھا۔ دونوں سمدھی تازیست ایک دوسرے کی عزت کرتے رہے اور اقبال نے بھی کریم بی بی سے کشیدگی کے باوجود ان کی تکریم میں کمی نہ آنے دی۔

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر صاحب کا اکلوتا بیٹا ڈاکٹر غلام محمد، جو کچھ سال پہلے ہی لندن سے میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹا تھا۔ عین عالم شباب میں انتقال کر گیا۔ ڈاکٹر عطا محمد کے لئے یہ حادثہ سوہان روح ہو گیا۔ ہر وقت آنکھوں میں نم اور دل میں غم لئے قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہتے۔ ایک دن راجہ سکندر خان (جن سے پنڈدادن خان قیام کے دنوں سے مراسم تھے) تعزیت کے لئے آئے اور کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب صبر کیجئے! آخر سب کو ایک دن جانا ہے، قدرت کو جو منظور۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے آپ کی بات درست ہے مگر قدرت نے کچھ بے قاعدگی کی ہے۔ بوڑھے باپ کے لئے نوجوان، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہونہار بیٹے کی موت سے بڑھ کر اور صدمہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور ڈاکٹر عطا محمد کے لئے یہی صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اور بیٹے کے غم میں ڈیڑھ سال گھلتے رہنے کے بعد آخر ۱۴ دسمبر ۱۹۲۲ء کو اس جہان پر درد سے سدھار گئے۔

کیپٹن ڈاکٹر غلام محمد

کیپٹن غلام محمد (۱۹۲۱ء - ۱۸۹۱ء) پانچ بہنوں کے ایک ہی بھائی تھے۔ بہت لاڈلے تھے باپ نے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ڈاکٹر بنے۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔ کیا اور لیور پول انگلستان سے میڈیسن کی ڈگری لی۔

ان کی شادی چھوٹی عمر یعنی ۱۸ سال کی عمر میں ہی والدہ نے کردی۔ بیوی کا نام فہمیدہ تھا' بیوی بہت خوبصورت اور حسین تھیں۔ وہ لاہور کے اعلیٰ کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ شادی ۷ نومبر ۱۹۰۹ء میں ہوئی۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۲ء کو ان کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ بیٹے کا نام محمد مسعود رکھا گیا۔

ڈاکٹر غلام محمد اپنی بیوی فہمیدہ کو بہت چاہتے تھے۔ غلام محمد کی ماں کو اپنے بیٹے سے بہت پیار تھا۔ آخر اکلوتی نرینہ اولاد عزیز ہوتی ہے۔ ساس' بہو کا روایتی سلوک کھل کر سامنے آیا۔ ساس کے دل میں بہو سے ذرا میل پیدا ہوا۔ ادھر فوج سے انہیں دوسری عالمی جنگ کے آغاز کے ساتھ پیرس بھیج دیا گیا۔ شنید ہے کہ ماں نے اپنے بیٹے پر زور دیا کہ وہ اپنی بیوی فہمیدہ کو طلاق دے دے۔ بیٹے نے ماں کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے' پیرس سے طلاق بھجوادی۔ اس وقت شیخ مسعود صرف ڈھائی کے پیٹے میں تھے۔ فہمیدہ کو میکے بھیج دیا گیا۔ محمد مسعود کو دادی نے اپنے پاس رکھ لیا۔

کیپٹن غلام محمد نے پیرس میں ایک فرانسیسی لڑکی ڈورس سے شادی کرلی۔ واپسی پر اس کو ساتھ لے کر آئے۔ گجرات میں اپنی بڑی حویلی میں رہنے لگے۔ ایک سال بعد فوت ہوگئے۔ والد اپنے اکلوتے بیٹے کی جواں مرگی کا صدمہ زیادہ دیر برداشت نہ کرپائے۔ بیٹے کے انتقال کے ڈیڑھ سال بعد وہ چل بسے۔ ماں بیٹے اور خاوند کے صدمے کو برداشت نہ کرسکی۔ اور روتے روتے بینائی ضائع ہوگئی۔

شیخ محمد مسعود

شیخ غلام محمد کے بیٹے تھے۔ دادا کے انتقال کے بعد اکیلے رہ گئے ان کے پھوپھا خواجہ فیروز الدین نے مشورہ دیا کہ گجرات والی حویلی فروخت کر کے لاہور میں مکان خرید لیں اور لاہور ہی میں رہیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ۱۹۳۸ء میں کوڑیوں کے بھاؤ یعنی 14000 روپے میں حویلی فروخت کردی۔ آفتاب صاحب کو اس کا بہت افسوس ہوا۔ خاندان کی نشانی تھی اور آفتاب صاحب کا بچپن بھی اس میں گزرا تھا۔ اس سے پرانی یادیں وابستہ تھیں۔

بہرحال ٹیمپل روڈ پر مکان خریدا گیا اور بیرسٹر خواجہ فیروزالدین کی بڑی لڑکی انوری بیگم سے ان کی شادی کردی گئی یہ ان کی پھپھو فاطمہ بی بی کی بیٹی بھی ہیں۔ یوں محمد مسعود لاہور کے ہوکر رہ گئے۔ گجرات میں ان کی ایک خالہ نواب بی بی رہ گئیں۔ باقی سب پھوپھیاں لاہور میں تھیں۔ محمد مسعود سرکاری ملازم تھے۔ نہایت شریف النفس انسان تھے۔ لوگوں کی خدمت اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ غریب رشتہ داروں کو اپنے گھر کئی کئی سال رکھا۔ ان کی ہر طرح مدد کی۔ دوستوں سے دوستی نبھاتے تھے۔ ان کے گہرے دوست کرنل خواجہ عبدالرشید (انوری بیگم کے پھوپھی زاد بھائی) اور خورشید انور (انوری بیگم کے سگے بھائی) تھے۔ لاہور آکر وہ اپنی والدہ سے بھی ملے۔ ان کی والدہ کی دوسری جگہ شادی کردی گئی تھی۔ ان کے چار بچے تھے انہوں نے اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کے ساتھ یگانوں جیسا سلوک کیا۔ ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی شادیاں کرائیں' مہینوں انھیں اپنے گھر رکھا۔ والدہ سے اکثر ملتے اور ان کی خدمت کرتے۔ ان کی مدد کرتے۔ فہمیدہ کا انتقال 1937ء میں لاہور میں ہوا۔

جس دن محمد مسعود کا انتقال ہوا اس دن بھی طبیعت ناساز تھی۔ باوجود منع کرنے کے ایک بیوہ کا کام کرنے گئے۔ اپنی بیٹی عذرا کے دیور کی منگنی میں شامل ہوئے۔

رات کو طبیعت خراب ہوئی۔ لیٹ گئے۔ جب بے چینی محسوس ہوئی۔ بیوی کو بلایا۔ اور کہا میرا وقت آ گیا ہے۔ سب بچیوں کو بلالو۔ سب نے تسلی دی۔ ڈاکٹر بلانے کو کہا تو منع کیا۔ جو میں کہتا ہوں۔ ویسے کرو۔ خیر سب بچیاں سوائے عذرا کے جو اس وقت لاڑکانہ -سندھ میں تھی۔ آ گئیں۔ باتیں کرتے رہے۔ سمجھاتے رہے۔ سب کو خدا حافظ کہا -اور کلمہ شہادت پڑھا۔ آنکھیں بند کر لیں اور خدائے حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

انتقال کے وقت ان کی عمر صرف ۵۹ سال تھی۔ ان کا انتقال یکم مئی ۱۹۷۱ء کو ہوا اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کے اور عزیز بھی وہیں دفن ہیں۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

موت کے بارے میں علامہ کے اشعار

کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت!
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت!

آفتاب اقبال کا انٹرویو (بالمشافہ) کراچی

۱۹۶۷ء میں مولانا سید حامد جلالی مرحوم نے آفتاب اقبال سے بالمشافہ گفتگو کے دوران مختلف سوالات کئے اور مولانا کو انہوں نے جوابات سے نوازا اور مولانا سید حامد جلالی صاحب نے اپنی کتاب میں اسے پیش کر دیا اور اسی کتاب کے ترمیم شدہ ۱۹۹۶ء ایڈیشن سے یہ انٹرویو نقل کر رہی ہوں۔ کتاب کے صفحہ ۱۵۴ سے آغاز کر رہی ہوں۔

سید حامد جلالی: آپ اپنے عقیدہ کے بارے میں ارشاد فرمایئے۔

آفتاب اقبال: چونکہ میں نے علوم مذہبی تفسیر قرآن حکیم، تشریح احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، توضیح مسائل فقہ کی تعلیم اس طرح حاصل نہیں کی، جس طرح علوم مغربی، فلسفہ و قانون کو میں نے پڑھا ہے۔ اور اس میں وقت گنوایا ہے۔ اس لئے مذہب کے کسی مسئلہ میں خواہ وہ اعتقادی ہو یا عملی مداخلت کرنے کا خود کو مستحق نہیں جانتا اور جس قدر مجھے تعلیم اس سلسلہ میں اپنے دادا شیخ نور محمد صاحب سے اور اپنے نانا، خان بہادر حاجی حافظ عطا محمد صاحب سے حاصل ہوئی۔ اس میں مجھے کوئی شبہ وارد کرنے کا موقع محسوس نہیں ہوا بلکہ جتنا میں نے غور کیا۔ مجھے اپنے مذہب کے اصول و فروع نہایت صحیح معلوم ہوئے۔ میرا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص اعتقادی مضبوطی اور علمی استدلال اور باضابطگی کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو تو وہ اخلاقی کردار کی حیثیت سے بڑا معیاری شریف آدمی کہلانے کا مستحق ہو گا اور اگر یہ شریف آدمی عملاً" تجارت کے اصولوں پر کاربند ہو اور جہادی اسپرٹ بھی رکھتا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسا شخص یا ایسے افراد یا ایسی قوم ابنائے عالم میں برتری نہ حاصل کرلے۔ میرے نزدیک میرا مذہب ابنائے عالم کی رہنمائی کے لئے آیا ہے۔ دنیا کو بدکرداری سے بچانے کے لئے آیا ہے۔ دنیا کو شر و فساد سے بچانے کے لئے آیا ہے۔

انسانی معاشرت کو شرافت کے بلند ترین درجہ پر فائز کرنے کے لئے آیا ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ ایک شخص اتنا دلیر ہے کہ خدا کے سوا کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا خدا کے حقوق پورے کرنا اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ جھوٹ کو اپنی شرافت کی توہین سمجھتا ہے۔ بے اخلاصی اور ریاکاری کو کم ظرفی خیال کرتا ہے۔ تجارت سے اور جائز طریقوں سے مال پیدا کرتا ہے اور متعلقہ حقوق ادا کرتا ہے۔ امانت میں خیانت کو کمینہ پن اور وعدہ خلافی کو نامردی یقین کرتا ہے۔ حقوق ذات کا نگران ہے۔ عزت، مذہب وناموس قوم کا جب سوال آئے تو وہ اس کے تحفظ کے لئے جان ومال کی قربانی دینے کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ میرے مذہب کی تعلیم کا خلاصہ نہیں ہے۔ کیا مسلمان ایسے شخص کے علاوہ کسی اور کا نام لیوا ہو سکتا ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ابو جہل اور ابو لہب جیسے کٹر کافر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ کہتے ہیں۔ گالیاں کوسنے دیتے ہیں۔ لیکن آپ کو صادق اور امین ضرور مانتے ہیں۔ تو مجھے یقین آتا ہے اور میرا نور ایمان کئی درجہ اونچا ہو جاتا ہے کہ میرے مذہب کی حامل ایک ایسی ذات ہے کہ جس کی صداقت وامانت کی گواہی اس کا بدترین دشمن بھی دیتا ہے۔

میرا رسول اپنے بدترین دشمنوں کا بینک ہے اور ایسا بینک ہے جو نہ روپیہ کسی کا کسی سے بدلتا ہے نہ کسی کا روپیہ اپنے ذاتی خرچ میں لاتا ہے۔ ان کے مال کی حفاظت کرتا ہے، لیکن ان پر احسان نہیں دھرتا۔ وہ ترک وطن کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن سب کی امانتیں جوں کی توں واپس کر جاتا ہے حالانکہ یہ امانتیں رکھنے والے ہی من حیث القوم اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ وہ اتنا عالی ظرف ہے کہ دشمن پر قابو پا کر اسے معاف کر دیتا ہے۔ وہ اتنا سخی ہے کہ ساری قوم کو لونڈی غلام بخشتا ہے، لیکن نہ اپنے گھر کے لئے کوئی غلام رکھتا ہے۔ نہ اپنی عزیز ترین بیٹی کو کوئی لونڈی دیتا ہے

وہ خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے تو خود اتنی عبادت کرتا ہے کہ اس کے مبارک پیر ورم کر آتے ہیں۔ وہ جہاد کی تلقین کرتا ہے تو خود رسد و کمک اور سامان جنگ کی پرواہ کئے بغیر میدان جنگ میں جا اترتا ہے۔ نقشہ جنگ ایک فیلڈ مارشل کی طرف مرتب کرتا ہے اور امور جنگ میں ہمہ وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ سایہ فگن رہتا ہے۔ زخموں سے چور ہوتا ہے، لیکن نہ ہمت ہارتا ہے نہ آہ و بکا کرتا ہے، نہ استقلال اور ضبط و تنظیم کا دامن ہاتھ سے چھوڑتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان سے زیادہ فاقے کرتا ہے اور جب کھانا ملتا ہے تو سب کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہے اور اپنے سے زیادہ کھلاتا ہے۔ وہ سامان عیش اپنے جس تدبیر سے فراہم کرتا ہے، لیکن سب اپنے ساتھیوں کو دے دیتا ہے۔ اپنے گھر میں بوریئے کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔ اتنا عظیم فیلڈ مارشل اور ایک خوش نصیب فاتح نہ کسی سے سیلوٹ لیتا ہے نہ کسی سے تعظیم کراتا ہے۔ اپنے سپاہیوں کے ساتھ ایک معمولی سپاہی کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ اور جب دنیا سے جاتا ہے تو نہ تو کچھ ورثہ اپنے پسماندگان کے لئے چھوڑتا ہے نہ اپنے اعزو اقرباء میں سے کسی کو اپنا جانشین بناتا ہے۔ ہاں اس کا اسوہ حسنہ اس کی بہترین میراث ہے۔

میرے نزدیک اسی اسوہ حسنہ اور میراث کا نام اسلام ہے۔ میرے نزدیک قرآن میرے رسول کے اخلاق و کردار کی عظمت کا قصیدہ اور ضوابط حیات کا بہترین مجموعہ ہے۔ اور اس مجموعہ کی بہترین تفسیر آپ کے ارشادات (احادیث) ہیں۔ آل رسول اور اصحاب رسول پاک کی زندگی اس کا عملی، ظاہری اور محسوس آئینہ ہے۔ جس میں ہر مسلمان اپنے عمل بالمذہب کے خدوخال تا قیام قیامت دیکھتا رہے گا۔ مجھے فخر ہے کہ اس مقدس پیغمبر کا ادنیٰ امتی ہوں اور اس کے خدا کے فرمان اور خود اس کے ہر ارشاد پر ایمان رکھتا ہوں۔ آل رسول اور اصحاب رسول کا آئینہ اپنے مذہبی خدوخال کی

اصلاح کے لئے عام طور پر اپنے پیش نظر رکھتا ہوں اور اس پر فخر کرتا ہوں۔ میں نے بے شک اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہیاں کی ہوں گی، لیکن بندوں کے حقوق میں نے کبھی غصب نہیں کئے۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، حالانکہ وکالت میرا پیشہ ہے میں نے نہ کسی سے مدد طلب کی نہ میں کسی کا زیر بار احسان ہوں۔ بجز اس کے کہ میرے والدین نے میری پرورش کی، دادا، دادی اور نانا، نانی نے مجھے تربیت دی۔ میرے ہندوستانی اور انگریز استادوں نے مجھے تعلیم دی۔ میں نے نہ کبھی سگریٹ کو ہاتھ لگایا نہ شراب کو منہ لگایا۔ میں اپنے عظیم باپ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا پہلا بیٹا ہوں اور اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے باپ اور اپنے دادا کی صحبت میں رہنے کا زریں موقع ان کی اولاد میں سب سے زیادہ حاصل ہوا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ میں ہی علامہ اقبال کا واحد بیٹا اور شیخ نور محمد صاحب کا واحد پوتا ہوں۔ جس نے عہد طفلی سے لے کر سن شعور تک اپنے دادا کے اخلاق و کردار اور تعلیم و تربیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور صرف میں ہی علامہ اقبال کی واحد اولاد ہوں جس نے علامہ کے استاد شمس العلماء مولوی صوفی میر حسن صاحب سے پندنامہ فرید الدین عطار وغیرہ پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ اور ان جیسے سراپائے زہد و تقوی بزرگ کی زندگی کے پاکیزہ وسادہ پروگرام کے مطالعہ سے سرفراز ہوا۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر مذہبی نکتہ نظر سے میں پکا حنفی للمذہب مسلمان ہوں۔ اور صوفی المشرب ہوں اور اپنے باپ دادا اور نانا کے جادۂ عمل پر نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم اور گامزن ہوں اور اپنے والد کے فرمان کے عین مطابق۔

اگرچہ سر نہ تراشم قلندری دانم

سید حامد جلالی: حضرت علامہ اقبال نے آپ کو اور آپ کی والدہ ماجدہ کو ترکہ میں سے کچھ بھی نہ دیا، حتیٰ کہ آپ کی والدہ ماجدہ کا دین مہر بھی ادا نہ کیا اور اپنا تمام مال و زر آپ کے چھوٹے بھائی جاوید اقبال اور آپ کی بہن منیرا کو دے گئے۔ یہ ناانصافی حضرت علامہ اقبال جیسے شاندار انسان سے کس طرح ظہور میں آئی۔ اہل نظر اس پر انگشت بدنداں ہیں کہ اسے کیا کہئے؟

آفتاب اقبال: میرے والد نے میرے نزدیک یہ کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ بے شک مجھے اپنے مالی ترکہ سے ضرور محروم کر گئے، لیکن ان کے علمی و ذہنی ترکہ کا بہت بڑا حصہ مجھے قدرت نے ودیعت فرمایا۔ میرے والد جانتے تھے۔ کہ میں خان بہادر ڈاکٹر حافظ حاجی عطا محمد صاحب جیسے شاندار نانا کا نواسہ ہوں۔ جن کے پاس عزت کی دولت کے ساتھ دنیا کی دولت بھی بہت ہے۔ گاڑی گھوڑے، نوکر چاکر سب کچھ اللہ نے ان کو دے رکھا تھا۔ میری زندگی شہزادوں کی طرح بسر ہوتی تھی۔ پھر میں بیرسٹری پاس کر کے لندن سے واپس آچکا تھا۔ اپنی زندگی بنانے کے لئے میرے پاس جوانی تھی، قابلیت اور صلاحیت تھی۔ انہوں نے مجھے بے سہارا چھوڑا اور یہ چیز میرے لئے مفید ثابت ہوئی۔ عزم امور کی صلاحیت و استعداد مجھے خدا نے مرحمت فرمائی۔ الحمدللہ میں پیش آمدہ مشکلات پر قابو پانے کے بعد آج سے بہت پہلے سے اس قابل ہوں کہ دوسروں کی مدد کر سکوں۔

اپنی پہلی زندگی کی طرح آج بھی میں نہایت فارغ البال ہوں، شاندار زندگی بسر کر رہا ہوں۔ خدا گواہ ہے یہاں تک پہنچنے میں مجھے مذہب بدلنا پڑا نہ اپنی

شرافت خاندانی اور ضمیر کے خلاف کچھ کرنا پڑا۔ البتہ اپنے عظیم باپ کے استقلال کی طرح مجھے بھی استقلال سے کام لینا پڑا۔ رہیں میری والدہ سو وہ تو بڑی شاندار عورت تھیں۔ صحیح معنی میں خان بہادر عطا محمد کی بیٹی اور علامہ اقبال کی بیوی تھیں۔ اپنے پدری سرمایہ کا ایک ایک پیسہ انہوں نے میری تعلیم پر خرچ کر دیا اور تکلیف مالی سے دوچار ہونے کے باوجود جب میرے چچا اور بہت سے لوگوں نے ہمیں سمجھایا کہ تم کورٹ کا دروازہ کھٹ کھٹاؤ یہ وصیت و ہبہ نامہ غیر قانونی ہے۔ ٹوٹ جائے گا تو میری والدہ نے اس تجویز کو اپنے شوہر کی توہین و رسوائی کا سبب جان کر مجھے ہمیشہ نصیحت کی کہ اگر تم نے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میں تمہارا دودھ نہ بخشوں گی۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے دل میں بھی ایک لمحہ کے لئے کبھی اس قسم کا خیال نہیں آیا۔ اسی لئے نہ آج تک کسی سے کچھ کہا اور کچھ کیا۔

عام طور سے جو لوگ دوسری بیویاں کرتے ہیں ان سے حق تلفی کی غلطی ضرور ہو جاتی ہے، لیکن میں اپنے والد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے جو کچھ کیا کئی اعتبار سے صحیح کیا۔ اول تو ایسا کرنا میری حوصلہ افزائی کا موجب ہوا۔ دوسرے یہ کہ میرا بھائی جاوید ایک نکاحتا بیوی کی اولاد ہے۔ جس کے پاس نہ کوئی خاندانی خصوصیت تھی نہ مالی پوزیشن، نہ یہ چیزیں دوسری بیوی کرنے والے کو مطلوب ہوتی ہیں۔ پھر جاوید کی عمر والد کی وفات کے وقت کل ۱۴ سال تھی اور منیرہ اس سے بھی بہت چھوٹی۔ اگر والد نے ان کے لئے یہ بندوبست کیا تو بہت اچھا کیا۔ ان کو ان معصوموں کے لئے جن کی نہ ددھیال میں کوئی کفالت کر سکتا تھا نہ ننھیال میں، جاوید کا ماموں تھا سو وہ بے چارہ ایک قالین والے کی دکان پر ملازم تھا۔ کچھ دن بعد وہ بھی وفات پا گیا۔ بہر حال مجھے اپنے ان بھائی بہن سے محبت ہے۔ الحمدللہ وہ خوشحال ہیں۔ اللہ انہیں سدا

خوشحال رکھے۔ میں ان کا دل سے بھی خواہ ہوں اگر ان کو خدانخواستہ کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو دنیا دیکھتی کہ میں پورے وسعت حوصلہ کے ساتھ ان کی ہر قسم کی مدد کرتا۔ میرے دل میں کبھی ان کے لئے کوئی برائی پیدا نہیں ہوئی۔ میں ان کی فراغبالی اور اطمینان سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ میرا دعوی ہے کہ اگر اللہ نے ہمارے خاندان میں دوسرا کوئی اقبال کبھی پیدا کیا تو وہ اقبال ہی کی اولاد میں سے کوئی ہوگا۔ میرے چچا عطا محمد کی اولاد میں سے ہر گز نہ ہوگا۔ الحمدللہ میرے دونوں بھائی بہن بھی سچے مسلمان ہیں۔ قادیانی نہیں ہیں۔ عطا محمد کی اولاد اقبال، اقبال کی مالا جپتی ہے، لیکن اقبال کی تعلیم اور مذہب کے خلاف قادیانی مذہب رکھتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بت پرستی چھوڑ کر خدا پرستی اختیار کی تھی اور دین اسلام کی فرمانبرداری میں نام پیدا کیا تھا۔ لیکن عطا محمد نے اس خوشنما تبدیلی مذہب میں عیب لگا دیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ کاٹ کر مرزا غلام احمد سے رشتہ جوڑ لیا۔ جس نے انگریز کی تائید میں اسلام سے جہادی اسپرٹ کو فنا کرنے کی زندگی بھر کوشش کی اور انگریز سے صلہ پایا۔ مرزا غلام احمد نہ ہمارے دادا کا نبی تھا نہ ہمارے باپ کا۔ اس لئے خواہ کوئی ہمارا چچا ہو یا اس کی اولاد، اگر وہ مرزا غلام احمد کو نبی مانتا ہے تو ہم سے، ہمارے آباؤ اجداد سے، ہمارے مذہب سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں۔

مولانا حامد جلالی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۳ اپریل ۱۹۷۸ء

کراچی (۲۲) (تحریری انٹرویو) اکبر علی خان عرشی زادہ

جوابات

۱) افسوس کہ میرے پاس والدہ مرحومہ کی جوانی کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ کچھ تصویریں تھیں۔ جو سیالکوٹ میں رہ گئیں۔ اتنے سالوں کے بعد ان کا ملنا ناممکن ہے

۲) معراج بیگم میری بڑی ہمشیرہ کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا۔ تاریخ پیدائش ۱۸۹۵ء ہے۔

۳) یہ بات غلط ہے کہ میری والدہ عمر میں علامہ یعنی میرے ابا جان سے بڑی تھیں۔ بلکہ ایک سال عمر میں چھوٹی تھیں۔

۴) علامہ مرحوم کی پہلی شادی کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۹۳ء ہے۔ نکاح نامے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی ارسال خدمت ہے۔ (اس پر مولوی میر حسن جو علامہ صاحب کے استاد تھے۔ جن کو علامہ نے شمس العلماء کا خطاب دلوایا تھا) کے دستخط بھی ہیں۔

۵) میری صحیح تاریخ ولادت ۲۳ جون ۱۸۹۸ء ہے۔ لیکن میرے سرٹیفکیٹ پر غلطی سے ۱۸۹۹ء لکھی ہوئی ہے۔ یہی تاریخ علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی میں بھی چھپی ہے۔

۶) میری والدہ نے ایف۔ اے سے میری تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے شروع کئے۔ پھر ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مجھے انگلینڈ بھیجا۔ جہاں میری والدہ اور نانا مرحوم تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے رہے۔

۷) میرے علم میں اختلاف کی وجہ دوسری شادیاں تھیں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۸) آپ نے اپنے دوسرے خط میں میری والدہ مرحومہ اور میرے والد مرحوم کے تعلقات پر روشنی ڈالنے کو لکھا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

کافی حالات آپ کو مولانا حامد جلالی مرحوم کی کتاب (علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی) سے معلوم ہو گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کی شادی میری والدہ سے ۱۸۹۳ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر ان کے انگلینڈ جانے تک (یعنی ۱۹۰۵ء) تعلقات بالکل نارمل تھے۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد انہوں نے لاہور میں لاء کی پریکٹس شروع کی۔ چونکہ پریکٹس کی ابتدا تھی۔ اور ان کے مالی حالات اس وقت کچھ اچھے نہ تھے۔ اس لئے میری والدہ کبھی اپنے والدین کے پاس رہتی تھیں اور کبھی سیالکوٹ سسرال میں رہتی تھیں۔ علامہ صاحب اکثر سیالکوٹ آتے رہتے تھے۔ اور ہمارے ساتھ کچھ دن گزارتے تھے۔ ۱۹۱۴ء تک یہ آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ان کی ۲ شادیاں یکے بعد دیگرے اور ہوئیں (ان شادیوں کی بھی علیحدہ ایک دلچسپ اسٹوری ہے) جس کی وجہ سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ (یہ ایک قدرتی بات تھی آپ سمجھ سکتے ہیں) اور گھر میں ریشہ دوانیوں کا آغاز ہوا۔ یعنی جاوید کی والدہ مرحومہ نے میری والدہ مرحومہ کے خلاف کارروائیاں شروع کیں۔ میں نے ہمیشہ اپنی والدہ کا ساتھ دیا۔ اس لئے میرے ساتھ بھی ڈاکٹر صاحب ناراض ہو گئے۔

یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ دوسری اور تیسری شادی کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے میری والدہ سے دوسری شادی کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ اور یہ لکھا تھا کہ ان کے حقوق کی بالکل حق تلفی نہیں ہو گی۔ بلکہ دوسری بیویاں ان کا احترام کریں

گی اور گھریلو کاموں میں ان کے مشورے پر عمل کریں گی۔ مندرجہ ذیل فقرہ اس خط میں یہ بھی تھا۔

"گھر کی اصل مالک تم ہو گی۔ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تم معراج اور آفتاب کی والدہ ہو۔ افسوس کہ یہ خط ضائع ہو گئے۔

ان کی تیسری شادی کے بعد تینوں بیویاں ان کے انار کلی والے مکان میں کچھ عرصہ اکٹھی رہیں۔ میری والدہ وہاں خوش نہیں تھیں۔ میری عمر اس وقت ۱۲ یا ۱۳ سال کی تھی۔ میں بھی کچھ عرصہ کے لئے وہاں تھا۔ چونکہ میری والدہ بہت خوددار لیڈی تھیں۔ دوسری بیویوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس لئے ان کی والدہ ۱۹۱۷ء میں آکر ان کو اپنے ساتھ ریاست مالیر کوٹلہ لے گئیں۔ جہاں میرے نانا خان بہادر حاجی حافظ ڈاکٹر شیخ عطا محمد صاحب گورنمنٹ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد چیف میڈیکل افسر تھے۔

مولانا جلالی کی کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ ۳۰ سال گورنمنٹ کی ملازمت میں میانوالی میں سول سرجن تھے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد مالیر کوٹلہ چلے گئے تھے۔ یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے آبائی وطن گجرات چلے گئے تھے۔

۹) میرے پاس اس وقت والدہ مرحوم کا کوئی خط نہیں ہے۔ ان کے چند خطوط میرے اور میری والدہ کے نام آئے تھے۔ بڑا افسوس ہے کہ وہ ضائع ہو چکے ہیں۔ اتنے سالوں کے بعد ان کا مہیا کرنا مشکل ہے۔ اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

۱۰) ان کی زندگی کے واقعات لاتعداد ہیں۔ لیکن چند ایک بیان کروں گا۔ ایک بات

میں آپ کو بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ شاید یہ بات آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ لوگ جن کو علامہ کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی شہرت کی وجہ سے ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ ان کا حسد تھا۔ مثلاً" سر عبد القادر نے انگریز حکام بالا کے پاس ان کو بدنام کرنے کی کوشش کی تاکہ برٹش گورنمنٹ ان کو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہ کر دے۔ ایک روز لارڈ اروِنگ (IRWING) نے ڈاکٹر صاحب کو بلایا۔ اور ان کو صوبہ سرحد کا گورنر بنانے کا خیال ظاہر کیا۔ لیکن جب سر عبد القادر اور میاں فضل حسین کو معلوم ہوا۔ تو اس وقت ان دونوں نے ان کو بدنام کرنے کی کوشش کی اور یہ کہا کہ اقبال محض شاعر ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ ان کو اس قسم کی پوسٹ دی جائے ۔اس کے علاوہ یہ بھی کہا۔ کہ ان کی تین بیویاں ہیں اور بیٹے کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں۔ یورپین قومیں کیونکہ کثرت ازواج (Pologamy) کے سخت خلاف ہیں۔ اس بات کا وائسرے لارڈ اروِنگ (Irwing) پر بہت برا اثر پڑا اور ان کو اس عہدے پر مامور نہ کیا گیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایک دن سر عبد القادر نے خود مجھے بتایا کہ ' آپ کے والد نے میرے ساتھ ایک دفعہ بول چال بند کر دی تھی۔ تو میں نے ان سے (ڈاکٹر صاحب) سے دریافت کیا۔ کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میرے ساتھ بات نہیں کرتے اور بار روم میں میری طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ اگر سچ پوچھتے ہو۔ واقعی یہ درست ہے کہ میں تم سے گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ تم نے اور میاں فضل حسین نے انگریز حکام بالا کے پاس میرے خلاف باتیں کی ہیں اور مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ تو غلط ہے۔ میں آپ کو بدنام کرتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ میں

نے ایسی حرکت کی ہے تو FORGIVE ME & FORGETIT

اس پر ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کہا کہ میں تجھے forgive تو کر سکتا ہوں مگر forget نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے لئے لمبا عرصہ درکار ہے۔ مگر باوجود اس بات کے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے آخری پندرہ سال ان دونوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئے تھے۔ سر عبدالقادر کی فطرت اس قسم کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے forgivness کے بعد بھی وہ زبان سے ان کی تعریف کرتے تھے۔ مگر در پردہ ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔

دوسرا واقعہ

ایک دفعہ وائسرائے کی کیبنٹ میں ایک جگہ خالی ہوئی اور گورنمنٹ اسے ایک قابل اور پٹھانوں میں مقبول آدمی سے پر کرنا چاہتی تھی۔ سر فضل حسین نے سر ظفر اللہ خان کا تقرر کروادیا۔ حالانکہ ان کا ڈاکٹر صاحب سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا تھا جب ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا علم ہوا۔ تو انہوں نے ہنس کر کہا۔ یہ پوسٹ تو مسلمانوں کی تھی۔ ظفر اللہ کو کیسے مل گئی۔

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ پنجاب میں انگریزوں نے سر فضل حسین کے زیر صدارت ایک پولیٹیکل پارٹی بنوائی۔ جس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا۔ اس پارٹی کے ممبر بڑے بڑے زمیندار ، ہندو ، مسلم اور سکھ تھے۔ پلان یہ تھا کہ دیہاتیوں اور شہریوں میں ایک قسم کی خلیج پیدا کی جائے۔ میاں فضل حسین اگرچہ خود شہری تھے ۔ خدا جانے انہوں نے اس پارٹی کا صدر بننا کیوں منظور کیا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی تھی کہ وہ برٹش گورنمنٹ اور بڑے بڑے زمینداروں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی لڑکیاں زمینداروں کو دیں۔ ایک کی شادی ملتان میں کسی زمیندار سے ہوئی اور دوسری کی فیروز خان نون کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ہوئی۔ سر فضل حسین یہ کہا کرتے تھے کہ ہم مسلم لیگ کو پنجاب کے اندر نہیں گھسنے دیں گے۔ بہت سے لوگوں نے انہیں یہ بھی کہتے ہوئے سنا کہ میں مسٹر جناح جیسے لیڈروں کو اپنی پاکٹ میں ڈال سکتا ہوں۔ میرے والد مرحوم نے اس پارٹی کی سخت مخالفت کی اور آخر دم تک کرتے رہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں میں پہلے ہی بہت سی Divisions ہیں اور یہ پارٹی ایک اور Division پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یعنی دیہاتی اور شہری میں۔

چونکہ پنجاب کے عوام الناس سب ڈاکٹر صاحب کے گرویدہ تھے۔ اس لئے یونینسٹ پارٹی چاہتی تھی کہ یا تو اقبال انگریزوں کی پالیسی کے ساتھ اتفاق کریں اور یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو اقبال کو اور اس کی مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی آخری عمر کے ۱۵ یا ۲۰ سال کی شاعری کو سمجھنا مشکل ہے۔ جب تک کسی شخص کو اس وقت کی پنجاب کی سیاست کا علم نہ ہو۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار اسی زمانے میں لکھے گئے تھے۔

کہتا ہے زمانے سے درویش جہاں مرد
جاتا ہے جدھر بندہ حق تو بھی اُدھر جا
ہنگامے ہیں میری تیری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا نگاہ قلندر سے گزر جا
میں کشتی وملاح کا محتاج نہ ہونگا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا
توڑا نہیں جادو میری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرات تو مکر جا
مہر وماہ ،انجم کا محافظ ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

آپ کو شاید معلوم ہوگا۔ اس وقت میاں فضل حسین ،سر عبدالقادر ،سر سکندر حیات ،عمر حیات اور خضر حیات کا زمانہ تھا۔ اور یہ سب انگریزوں کے پٹھو تھے۔ مسلم لیگ کے پنجاب میں صرف ۳ آدمی تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم ،ملک برکت علی ،اور

شیخ دین محمد (ایڈووکیٹ)

یونینسٹ پارٹی نے جب دین محمد کو ہائی کورٹ کی ججی کا چکمہ دے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ تو صرف ۲ آدمی پنجاب مسلم لیگ میں باقی رہ گئے۔

اور یہ آخری دم تک یونینسٹ پارٹی سے بر سر پیکار رہے۔ ان دونوں کی وجہ سے بالخصوص ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے پنجاب میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔

جس وقت دین محمد کو مسلم لیگ سے توڑ لیا گیا۔ اس کے دوسرے دن دین محمد ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے گئے۔ اس بات کو بھانپنے کے لئے کہ آیا ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا علم ہوا ہے کہ نہیں۔ مگر ان (ڈاکٹر صاحب) کے پختہ سلسلہ سراغ رسانی کی وجہ سے ان کو راتوں رات اس کی اطلاع مل گئی تھی کہ دین محمد نے مسلم لیگ کو دھوکہ دے کر جج شپ حاصل کر لی ہے۔

ان کے ملازم علی بخش نے دین محمد کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کی کہ شیخ دین محمد ملنے کے لئے آئے ہیں۔ اس پر انہوں نے اونچی آواز میں یہ کہا کہ اس غدار کو میرے گھر سے نکال دو۔ میں اس کو نہیں ملنا چاہتا۔ کیونکہ اس نے قوم کے ساتھ غداری کی ہے۔

اسی قسم کا سلوک نواب مظفر خان کے ساتھ بھی کیا گیا تھا۔ جنہوں نے مسجد شہید گنج کے معاملے میں در پردہ سکھوں کا ساتھ دیا تھا۔ جب مسلمان ہائی کورٹ کی اپیل میں ہار گئے۔ تو صرف ظاہر داری کے لئے وہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا وفد لے کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر گئے۔ تاکہ پریوی کونسل میں اپیل کرنے کے لئے ان سے مشورہ کیا جائے۔

اور اسی قسم کا سلوک شیخ عبداللہ کشمیری لیڈر کے ساتھ بھی ہوا۔ جو اس

وقت کانگریس میں تھے اور ہندو کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔

جیسا کے میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اس قسم کے واقعات تو ان گنت ہیں مگر ان میں سے ایک واقعہ ایسا ہے جو میں آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ واقعہ آج تک کسی اخبار یا رسالے یا مسلم لیگ کی روداد میں نہیں چھپا۔ اور یہ جناح صاحب اور اقبال کی ملاقات کے متعلق ہے۔ جو غالباً" ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں جناح صاحب کے لندن سے واپس آنے پر لاہور میں ہوئی تھی۔ اتفاق سے میں بھی اس دن وہاں موجود تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ان کے ملازم علی بخش نے ڈاکٹر صاحب سے آکر کہا۔ جناب آپ کو جناح صاحب ملنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی آرام کرسی پر بیٹھ کر حسب معمول حقہ پی رہے تھے۔ اور یہ سن کر خاموش رہے۔ کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ وہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ جناح صاحب ان کو کس غرض سے ملنے آئے ہیں۔ کیونکہ وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ اور ان کو (ڈاکٹر صاحب کو) اس بات کا رنج تھا کہ جناح صاحب پاکستان بننے کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں۔ جب الہ آباد ۱۹۳۰ء میں انہوں نے خطبہ صدارت پڑھا۔ جس میں پاکستان کا تخیل پیش کیا گیا تھا۔ اور اس کا متن انگلینڈ کے اخبار ٹائمز (Times) اور ٹیلیگراف میں چھپا۔ اس وقت میں بھی لندن میں ہی تھا۔ میں نے یہ حصہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اتفاق سے ایک دن کسی پارٹی میں جناح صاحب ملے۔ تو میں نے ان کو وہ تراشہ دکھایا۔ جناح صاحب نے اس کو پڑھ کر مذاق سے کہا Nonsense یہ تو ایک شاعر کا شاعرانہ تصور ہے۔ یہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ الفاظ میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھ کر بھیج دیئے۔ خیر جب جناح صاحب کو انتظار کرتے تقریباً" ۲۰ منٹ گزر گئے ۔ تو علی بخش نے ڈاکٹر صاحب کو پھر بتایا۔ جناب جناح صاحب انتظار

کرر ہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے جناح صاحب کو فوراً" اندر بلایا اور وہ اپنی بہن مس فاطمہ جناح صاحبہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ تقریبا ۱۵ منٹ تک بالکل خاموشی رہی۔ اس وقت یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے ۲ بڑے آدمیوں کے دل آپس میں باتیں کرر ہے ہیں۔ اس خاموشی کے وقفے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جناح صاحب سے پوچھا کہ آج آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔

ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی بہتر ہوگا اگر میں اسے انہیں کے الفاظ میں بیان کروں۔

Dr. Iqbal- Mr. Jinnah what brings you here today?

Mr. Jinnah- Well, Sir Mohd, after thinking a good deal about the problem of division of India, I must fully agree with you that the creation of a muslim state carved out of india, as you demanded in your presiding address at Allahabad in 1930, is the only solution, not only of the political problem of the india muslim but of india as a whole.

اس پر ڈاکٹر صاحب نے ذرا سختی سے کہا

I have been telling you this for the last seven years, have you realized it now?

اس پر پھر تقریبا" ۵ منٹ کے لئے خاموشی رہی۔ اس خاموشی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

How can I help you in this matter.

جناح صاحب نے جواب دیا۔

I have come to you to request you to help me in consolidating the Muslim League in the Punjab.

اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر کہا۔

I shall be delighted to do so, but I must tell you. I want the Muslim League to be a Muslim Organization, not of big Zamidars & Capitalists. The only thing I can give you in this province are the poor masses.

یہ سن کر جناح صاحب نے جواب دیا۔

This is precisely what I want.

ان الفاظ کے بعد اقبال اور جناح ایک پلیٹ فارم پر آگئے۔ اور ان دونوں میں مفاہمت ہو گئی۔ اس ضمن میں آپ کو بتانا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ جناح صاحب کی اس ملاقات سے پہلے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جناح صاحب کو جب وہ لندن میں تھے ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ واپس آکر مسلم لیگ کی لیڈر شپ اپنے ہاتھ میں لے لیجئے۔ کیونکہ آپ ایک واحد شخصیت ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔

مگر میرا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

انہیں دنوں جب جناح صاحب لندن میں پریکٹس کر رہے تھے۔ ان کی ملاقات مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ سے ہوئی۔ چرچل نے جناح صاحب سے کہا۔

Mr. Jinnah why are you wasting your time here. Why don't you go back to India, makeup with the poet & work for the Creation of Pakistan,

because we want Pakistan.

آپ کو معلوم ہو گا۔ مسٹر چرچل بھی پہلے ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ جب یہ جناح صاحب کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ انگلستان کی کنزرویٹو (CONSERVATIVE) پارٹی پاکستان کے بننے کے حق میں ہو گئی ہے تو انہوں نے ہندوستان واپس آنے کا قصد کیا۔ تاکہ وہ مسلم لیگ کی لیڈر شپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ جیسا کہ اقبال چاہتے تھے۔ ان کے آنے کے بعد اقبال اور جناح کے مابین جو خط و کتابت ہوئی۔ چھپ چکی ہے اور غالباً " آپ نے اسے پڑھا بھی ہو گا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اقبال نے ہر قدم پر مسٹر جناح کی رہنمائی کی ہے اور حال ہی میں، میں نے ان کے سیکرٹری مطلوب حسین صاحب کے متعلق ایک مضمون پڑھا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ ان کو جناح صاحب نے ایک مرتبہ کہا۔

"Matloob, we have not done all that Iqbal wanted us to do."

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر اقبال نہ ہوتے تو کم از کم پنجاب میں جناح صاحب کو کتنی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

اقبال اور جناح کی اس میٹنگ کے دوران جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں ان دو بڑی ہستیوں کا موازنہ کرتے ہوئے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک طرف اقبال تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کے مطالعہ میں صرف کی۔ اور جو اردو، فارسی، عربی کے جید عالم تھے۔ اور جنہوں نے مسلمانوں اور اسلام کے مسائل کا نہایت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور جو دونوں علوم مشرقیہ و مغربیہ کا علم رکھتے تھے۔ اور دوسری طرف ان کے سامنے ایک قابل اور بہت بڑے پارلیمنٹرین اور پولیٹیشن تھے لیکن اردو، عربی اور فارسی سے ناواقف تھے۔ بلکہ اردو صحیح بول بھی نہیں سکتے تھے۔

باب ہفتم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سپاسنامہ

بگرامی خدمت عالی جناب آفتاب اقبال ایم۔ اے بیرسٹر لاء (لندن) خلف اکبر وجانشین سجادہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مجلس محبان علامہ اقبال کی مجلس تحقیق اپنے عرصہ تحقیقات میں اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ آپ کی زندگی ایک عملی اور مکمل مرقع ہے ان ہدایات کا جو آپ کے عظیم المرتبت والد نے انسان کو اور خاص کر ہر مسلمان کو معیاری زندگی گزارنے اور معراج ترقی تک پہنچنے کے لئے جاچکی ہیں۔ مثلاً" حضرت علامہ اقبال نے مسلمان کو مخاطب فرماکر تلقین کی ہے۔

فرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو ادا مثال نماز ہو جا

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس وقت جبکہ آپ اپنے والد بزرگ کی سرپرستی سے محروم ہوگئے تھے۔ اس وقت جبکہ آپ کے شفیق و بزرگ نانا جان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کا سایہ عاطفت آپ کے سر سے ہٹ گیا۔ اس وقت جبکہ آپ کی مادر مشفقہ کا سارا سرمایہ آپ کو علم کے انتہائی کمال تک پہنچانے کی تمنا میں تمام ہوچکا تھا۔ اس وقت جبکہ وطن مالوف سے ہزاروں کوس دور سرزمین یورپ میں آپ تعلیم پارہے تھے اور آپ کا نہ کوئی ساتھی رہا تھا نہ غمگسار۔ زندگی کے وسائل کی کمی تھی اور عنفوان شباب میں غمزدہ وقت آپ کاٹ رہے تھے۔ آپ نے اپنی اولالعزمی مستقبل مزاجی اور جہد مسلسل کے ساتھ پیکر زیست کو فرض خدا سمجھ کر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ آپ اپنی

ہلال کو درجہ کمال تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے اور اپنے والد بزرگ کے اس عظیم ارشاد کو سچ اور ممکن العمل کر دکھایا کہ

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے
تمام سامان ہے تیرے سینہ میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

تحصیل علم کے بعد جب آپ وطن واپس آئے تو آپ کے جلیل القدر والد نے آپ کی کوئی مدد نہ کی۔ آپ کے بعض اعزا جنہوں نے عہد طفلی سے لے کر عہد جوانی تک آپ کے ساتھ طرح طرح کی بدسلوکیاں روا رکھیں، اب بھی آپ کو نظر قہر سے دیکھ رہے تھے۔ اور آپ کے والد بزرگ کو آپ کی طرف سے بدظن کرنے کے لئے بے اصل اور بے سروپا باتیں ان کے کانوں میں بھر رہے تھے اور باپ کو بیٹے سے جدا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش میں شبانہ روز مصروف تھے۔ اس صبر آزما وقت میں بھی آپ نے کیریکٹر سے گری ہوئی کوئی بات نہیں کی۔ نہ ان نام نہاد بزرگوں کی شان میں کوئی گستاخی کی۔ نہ اپنے والدین کے بزرگانہ اصول کے خلاف کوئی قدم اٹھایا۔ بلکہ اپنے والدین کی عظمت و شرافت کو اپنی ہر ضرورت پر مقدم جانا اور نہایت محتاط زندگی گزاری حتیٰ کہ نہ کبھی سگریٹ پیا نہ کسی اور ممنوع چیز یعنی شراب وغیرہ کو ہاتھ لگایا۔ نیز نہ آپ نے کسی کے آگے دست سوال دراز کیا نہ کسی طرح کسی شخص کا بار احسان سر پر اٹھایا۔ شدید تکالیف کا نہایت صبر و استقلال کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا قدم جادہ شرافت سے نہ ہٹنے دیا۔ اس دور کشاکش، کسمپرسی اور شدید مالی بحران کی حالت میں بعض باطل فرقوں نے آپ کو اپنی جماعت میں شامل کرنے کے لئے طرح طرح کے لالچ دیئے لیکن آپ اپنے اور اپنے باپ دادا کے مسلک حق پر ثابت قدم رہے اور ان میں سے ہر ایک سے کہہ دیا۔

بروایں دام بر مرغے دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

ہندوؤں کی طرف سے لاکھوں روپے کی پیشکش کی گئی تاکہ آپ اپنا مذہب تبدیل کرلیں حتیٰ کہ تحریراً" و تقریراً" مسٹر مدن موہن مالویہ جیسے معزز شخص نے بارہا آپ کو سمجھایا کہ آپ مذہب اسلام ترک کردیں۔ آپ اصل میں برہمن زادے ہیں۔ آپ کے بزرگ سناتن دھرم کے پیشوا تھے ہم آپ کو سناتن دھرم میں شامل کرلیں گے اور ایک عالی نسب اور مقدس برہمن کی طرح آپ کی قدر و منزلت کریں گے اور آپ کو بہت بڑے کاروبار کا مالک بنا دیں گے لیکن آپ نے ان کی سنہری پیشکش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور ان کے شیطانی اور جہنمی ہتھکنڈوں کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ آپ کی اس حق پسندی اور حق پرستی میں خداوند کریم کی خاص توفیق کا بڑا دخل تھا جو غالباً" آپ کے بزرگ دادا کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کیونکہ آپ نے ان کی اولاد میں سب سے زیادہ ان کی خدمت کی ہے۔ ساری ساری رات ان کی ٹانگیں دبائی ہیں اور دعائیں لی ہیں۔ نیز حضرت شیخ المشائخ مولانا میر حسن صاحب کی تربیت کا بھی یہ فیض تھا جو آپ کے والد کے بھی استاد تھے اور آپ کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ غرض ایں سعادت بہ زور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

....لاریب حضرت علامہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر اپنی جائیداد اور سرمایہ ظاہری سے آپ کو محروم کرگئے لیکن وہ اپنے کردار کی عظمت اور عظیم علمی قابلیت اور جبلی ذہانت و فطانت کا بہت بڑا حصہ بہ حکم قضا و قدر آپ کو دے گئے۔ ہر منصف قابل اور ایماندار شخص آپ کو دیکھ کر آپ کی تحریر پڑھ کر آپ کی تقریر سن کر الولد سر لابیہ کی تصدیق کرے گا۔ آپ کو اپنے والد کا صحیح جانشین تسلیم کرے گا۔ ان حقائق کی

بنا پر مجلس محبان علامہ اقبال بھی پورے اخلاق اور دیانت کے ساتھ آپ کو اپنے والد کا جانشین قرار دیتی ہے۔

مجلس کے اراکین واقف ہیں کہ آپ شاعر نہیں ہیں، لیکن مجلس نے آپ کی زبان مبارک سے سیکڑوں اشعار آپ کے والد کے سنے ہیں۔ نہ کبھی آپ نے کوئی شعر ناموزوں پڑھا نہ بے محل پڑھا نہ اس کی توضیح غلط کی یہ آپ کی شاعرانہ صلاحیت کی واضح دلیل ہے۔ سخن گو آپ نہ سہی، لیکن سخن سنج ضرور ہیں۔ بلا تمثیل عرض ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین تھے، لیکن ان میں سے پیغمبر کوئی بھی نہ تھا۔ البتہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیم پر خود بھی عامل تھے اور ان کی تبلیغ و نشر و اشاعت اور عامتہ الناس کی خدمت، تربیت، تعلیم اور اصلاح کرنے پر قادر تھے۔

آپ کے والد بزرگ شاعر ہونے کے علاوہ قوم کے مسلم الثبوت رہنما بھی تھے۔ آپ نے بھی بلا کسی ذاتی غرض اور دباؤ کے صدارتی انتخاب کے وقت موجودہ صدر کی طرف داری میں بیانات دیئے اور ملک و ملت کی صحیح راہنمائی کی۔ اس سے آپ کی اصابت رائے اور ان جذبات مخلصانہ کا پتہ چلتا ہے۔ جن کی مظہر اور آئینہ دار آپ کے والد بزرگ کی ذات ستودہ صفات تھی۔ مجلس محبان علامہ اقبال آپ سے ان توقعات کی تکمیل میں مدد کی آرزو رکھتی ہے۔ جنہیں آپ کے والد بزرگ اپنی گوناگوں علالتوں اور کمی عمر کے باعث انجام کو نہیں پہنچا سکے۔

پدر نتو اند پسر تمام کند

ان کی دلی تمنا تھی کہ مسلمان کلام الٰہی اور شریعت حقہ کے رموز و نکات کو ان کی زبان میں سمجھیں اور عمل پیرا ہوں۔ مجلس محبان علامہ اقبال مسلمانان پاکستان کو آپ

کے والد کے دیئے ہوئے وہ تمام اسباق یاد کرانا چاہتی ہے۔ جنہیں پڑھ کر ہر مسلمان پکا مسلمان بن سکتا ہے۔ اپنے دوست دشمن میں تمیز کر سکتا ہے۔ اپنے قومی، ملی مذہبی نفع ونقصان کو پہچان سکتا ہے اور اپنے عقائد واعمال کی اصلاح کر سکتا ہے۔ امید کہ جناب والا مجلس کی درخواست کو شرف قبول بخشیں گے۔

پیش کنندگان

(مولانا مخدوم) سید حامد جلالی بخاری دہلوی۔ صدر مجلس محبان علامہ اقبال وسید مسعود احمد جلالی بخاری ازہری جنرل سیکریٹری ۔ دیگر اراکین مجلس عامہ، مجلس محبان علامہ پاکستان (رجسٹرڈ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر ابو تراب رازانی سیکریٹری پاک ایران کلچرل ایسوسی ایشن نے جناب آفتاب صاحب کو مطلع کیا کہ ہماری ایسوسی ایشن نے مورخہ ۱۳ جون ۱۹۶۸ء کو بوقت ۸۱/۲ بجے شب آپ کے اعزاز میں ایک خصوصی اجلاس اپنی مجلس کا طلب کیا ہے۔ آپ تشریف لا کر دفتر مجلس کو رونق بخشیں اور حاضرین مجلس کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے متشکر فرمائیں۔ جب آفتاب اقبال وقت مقررہ پر وہاں پہنچے تو سیکڑوں آدمیوں نے آپ کا استقبال کیا۔ پھر اجلاس کا آغاز ہوا۔ ممتاز شعر ادبائے ایران نے پہلے آفتاب اقبال صاحب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا پھر حضرت علامہ اقبال کی علمی، ادبی اور ملی خدمات کو خوب سراہا اور آفتاب صاحب کی خدمت میں بطور قصیدہ وسپاسنامہ

حسب ذیل رباعی پیش کی۔

تقدیم

یہ جناب آفتاب اقبال ایم۔ اے لندن بار ایٹ لاء خلف اکبر حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔

امشب رخ بے نقاب اقبال اینجاست
گل نیست ولے گلاب اقبال اینجاست
امشب جمال دوست روشن روز است
شب نیست کہ آفتاب اقبال اینجاست

منجانب اراکین انجمن روابط فرنگی (ایران' پاکستان) واقع چہارراہ امیر اکرم خیابان پہلوی طہران' ایران۔

اردو ترجمہ :

اس رات رخ بے نقاب اقبال یہاں ہے
گل کیا شجر گلاب اقبال یہاں ہے
یہ رات جمال دوست سے روشن دن ہے
ہاں دن ہے کہ آفتاب اقبال یہاں ہے

صیقل ادراک

(آفتاب اقبال ایم۔ اے لندن بار ایٹ لاء

میں پوری صداقت دل کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جو نسبت ایک ذرہ بے مقدار کو آفتاب عالمتاب سے ہے وہی نسبت مجھ کو اپنے عظیم المرتبت والد سے ہے۔ اگر کوئی تابندگی میری زندگی میں آپ کو نظر آئی تو اس کا سرچشمہ اور منبع وہی آفتاب تاباں ہے جس کا میں ایک ذرہ ہوں۔ مجھ میں واقعی اگر خوبی ہے جس کا نہ مجھ کو علم ہے' نہ دعوئ وہ یقیناً" میرے عظیم

انشاءاللہ والد کا ترکہ اور میرے بزرگوں کی دعاؤں کا صدقہ ہوگا۔

میں اپنی خداداد طبیعت کے بارے میں خدا قدوس کا بے حد شکر گزار ہوں، میرے بزرگ دادا شیخ نور محمد صاحب نے مجھے بارہا نصیحت کی تھی کہ ایک خدا کا ماننے والا سوائے خدا کے کسی کے سامنے نہیں جھکتا اور نہ اپنے حسب نسب پر فخر کیا کرتا ہے ۔شکر ہے کہ آج تک نہ میں کسی انسان سے ڈرا ،اور نہ ہی استخوان بزرگ فروش بنا ،میں نے کبھی اپنے باپ کے نام کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ جنگ زندگی میں نہ کسی سے کسی قسم کی مدد کا طلبگار ہوا ،کیونکہ یہ میرے والد بزرگوار کی تعلیم اور میری طبیعت کے سراسر خلاف تھا ،والد مرحوم نے حسب ذیل اشعار میں جو اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اس کا کچھ نہ کچھ عکس میں اپنے اندر ضرور دیکھتا ہوں۔

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشہ چالاک
رکھتی ہے مگر خاک میری طاقت پرواز
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک
▪ خاک کہ جبریلؑ کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس وخاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں ▪ آنسو
کرتی ہے چمک جن کے ستاروں کو عرقناک

پھر کہا

یارب یہ جہان گزراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردان صفا کیش وہنر مند

نو برگ گیا ہے وہی اہل فرد مرا
اوگشت گل ولالہ وخشد فجرے چند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندہ حق بیں وحق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند
پر سوز ونظر باز ونکوبین وکم آزار
آزاد وگرفتار، تہی کیسہ وخورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوق شکر قند
چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندہ گستاخ کا منہ بند

رہی میری پریشانیاں، ان کے لئے صرف اتنا عرض کردینا کافی سمجھتا ہوں۔

میں کیوں کہوں کہ غم زندگی گراں گزرا
وہ ساتھ ساتھ رہے ہیں جہاں جہاں گزرا
رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستین میں ہے ید بیضا

اقبال جیسے شاعر، مفکر اور لیڈر دنیا کی تاریخ میں خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے تھے جن کی عظمت وقت کے ساتھ نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی مثال ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہے جس کی بلندی اور عظمت کا صحیح اندازہ اس سے قریب کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتا، آنے والی نسلیں اقبال کو ہم سے بہتر سمجھیں گی، اور ان کی تعلیم ان کے لئے مشعل راہ ہو گی۔ لیکن جب دنیائے اسلام کی موجودہ حالت پر غور کرتا ہوں تو معاً" مجھے ان کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلہ سے ہے تو
تیرے لئے ہے مرا شعلہ نوا قندیل

(ساغر، کراچی ۲۵ دسمبر ۱۹۶۷ء)

باب ہشتم

ایک یادگار خطاب

یوم جمہوریہ پاکستان کی تقریب کے موقع پر
آفتاب اقبال صاحب کا خطاب

ہم جمہوریہ پاکستان کی اٹھارویں سالگرہ کا جشن منا رہے ہیں۔ اس کی سابقہ تاریخ کے ۱۸ سالوں کا محتاط اور غیر جانبدارانہ مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بہت سی سیاسی، معاشرتی اور معاشی رکاوٹوں کے باوجود بہت سی اہم سمتوں خصوصاً" صنعتی اور تجارتی شعبوں میں اس کی ترقی نمایاں اور تیز رفتار رہی ہے۔ ایک نوخیز اور ناتجربہ کار قوم ہونے کے سبب ہمنے غلطیاں بھی کی ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں، لیکن اگر ہم ان کو نہ دہرانے کا پختہ عزم رکھتے ہوں اور سابقہ تجربے سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتے ہوں تو ہمیں شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب میں ان شدید مصائب کے بارے میں سوچتا ہوں جو ہمارے اہل وطن نے برداشت کئے اور جو عظیم قربانیاں پاکستان کے لئے دی تھیں تو میں ان کے صبر واستقلال اور جرات واستقامت کی داد دیتا ہوں۔ دور دراز کے بہت سے لوگوں کی نظروں میں (جو اس کی جدوجہد برائے معاشی آزادی کا بغور مطالعہ کر رہے تھے) یہ ایک نادر اور عجیب وغریب واقعہ ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء سے

شروع کرتے ہوئے جب کہ ہم کچھ نہ تھے۔ ہم آج ایک ایسی قوم ہیں جو باوجود اپنی معاشی مشکلات کے ،ایک بڑی اور بڑھتی ہوئی آبادی کو برقرار اور اپنے سروں کو بلند رکھے ہوئے ہے۔ جس کی آواز اقوام کے ایوانوں میں قابل اعتنا ہے۔ ہمارے درمیان چند ناواقف اور ناسمجھ ناقدین ہیں جو مخالف نقطہ نظر رکھتے ہیں اور عجیب وغریب استدلالی نظریات پیش کرتے ہیں کہ پاکستان بطور ریاست ناکام رہا ہے کیونکہ ہمارے ہاں اب تک جو حکومتیں بھی رہی ہیں وہ تعلیمی شعبے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کرپائی ہیں۔ یہ رجعت پسند اور جذباتی ناقدین بہت عجلت میں ہیں اور اس بات سے بے خبر ہیں کہ ہر کام کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ تاہم جن مسائل کا حوالہ یہ دے رہے ہیں ان سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا کہ یہ موجود ہیں اور ان کو حل کیا جانا چاہئے ۔میں بعد از ۱۹۴۷ء ملک کی مجموعی ترقی سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں اور مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا خامیوں کے علاوہ بہت سی دوسری برائیاں موجود ہیں۔ جنہیں پاکستان کی انتظامیہ سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا لیکن ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ہمارے حکمرانوں (وہ جو کوئی بھی ہوں) کے پیش نظر جو کام ہے وہ نہایت دشوار اور کٹھن ہے۔ اگر ہم ان کے مقام پر کھڑے ہو کر دیکھیں اور پاکستان جیسی ریاست کے امور سرانجام دینے میں انہیں جن دشواریوں کا سامنا ہے۔ انہیں جان سکیں تب ہی ہمیں ان کی قدر وقیمت معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ ریاست ایسے لوگوں سے آباد ہے جو اصلاً" مختلف صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کم وبیش مختلف تہذیبوں کے حامل ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف مذہبی گرہوں سے وابستہ ہیں ،اور مختلف سیاسی خیالات رکھتے ہیں۔ ہمارے انتہائی حساس اور جذباتی عوام الناس کی جہالت اور غربت ،مالدار طبقے میں حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کی کمی ،ہماری خود غرضی ،لالچ اور ذاتی حسد ،ہمارا

مذہبی جنون ، اور وفادار محب وطن شہریوں کے اچھے اور دیانت دارانہ کام کی ناقدری یقیناً" اس ملک میں کسی بھی حکومت کے کام کو انتہائی مشکل بنادے گی۔ ہمیں یہ بات یادرکھنی چاہئے کہ ہر ملک وہی طرز حکومت اپناتا ہے۔ جس کے لئے وہ موزوں ہو۔ جب تک ہم میں یہ اخلاقی اور سماجی برائیاں موجود رہیں گی۔ پاکستان میں کوئی حکومت بھی باوجود اچھی اور مضبوط اور نیک نیت ہونے کے۔ اس رفتار سے تعمیری کام نہیں کرسکتی۔ جو عام طور پر اس سے متوقع ہوتے ہیں۔ قوم جو تقریباً" ۲۰۰ برس غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی میں رہی ہو اس کے اخلاق ، شعور اور روحانی سطح کو بلند کرنے میں معجزات دکھانا ممکن نہیں۔ ایک قوم کے اخلاقی کردار کو سنوارنے کا مشکل عمل اوپر کے بجائے نیچے سے شروع ہونا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ ایک ملک کی سیاسی اصلاح اس کے عوام کی اخلاقی اور سماجی اصلاح کے مطابق ہوا کرتی ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ جونہی ہمارے عوام کے اخلاقی معیارات بہتر ہوں گے۔ ہم ملک کے نظم و نسق کو سنبھالنے کے لئے اچھے قسم کے سیاسی لیڈر پیدا کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔ ہرچند کہ کسی بھی مہذب حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نظم و ضبط قائم رکھے اور عوام کی مجموعی ترقی کے لئے قوانین کا نفاذ کرے ، لیکن کوئی حکومت چاہے کتنی ہی باصلاحیت ہو عوام کی ایک بڑی تعداد کی عملی پشت پناہی کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں کرسکتی۔ ہم برائی کا جواب برائی سے دینے کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ یہی عمل اور رد عمل ایک دوسرے کو تشدد پر آمادہ کررہے ہیں۔ ایک ملک کی حکومت اور عوام باہم دیگر فرائض اور ذمہ داریاں رکھتے ہیں اور اس باہمی تعاون کے فقدان کا لازمی نتیجہ سیاسی ابتری اور بدنظمی ہے جو ریاست کو اندرونی اور بیرونی طور پر عظیم خطرات سے دوچار کردیتی ہے۔

ہم پاکستان کو ایک مضبوط ، طاقت ور اور خوش حال ریاست بنانے میں کس طرح مددگار ہو سکتے ہیں۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ ہم لوگ متحد ہوں ، جتنی محنت اس وقت کر رہے ہیں اس سے زیادہ محنت کریں۔ آپس میں بھی اور دوسری قوموں سے تجارتی معاملات میں بھی انتہائی ایمانداری برتیں ، انفرادی خوبیاں جہاں کہیں بھی پائی جائیں ان کی حوصلہ افزائی کریں ، حسد اور نفرت کے رذیل جذبات کو دبائیں ، اور دوستوں کے نقطہ نظر کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کے لئے زمین ہموار کریں۔ چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اس ملک سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جس میں اللہ تعالی نے اپنی حکمت سے ہم سب کو ایک ساتھ لا پھینکا ہے۔ تاریخ خود اس مہیب انقلاب عظیم کے خدائی منصوبے کی تکمیل کو دکھائے گی جو ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۴۷ء کو پیش آیا۔ بحیثیت مسلمان ہمیں اس کی حکمت اور دور اندیشی پر کامل ایمان ہونا چاہئے اور اس کی رضا پر راضی رہنا چاہئے۔ بہتر ہے کہ ہم جلد اور مکمل طور پر اپنی سابقہ جغرافیائی گروہ بندیوں کو بھول جائیں۔ جب تک ہم پاکستان کی بھلائی کے لئے مکمل موافقت سے مل جل کر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے ۔ ہم ان طاقتور بیرونی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے جو ہمارے سیاسی اور ثقافتی وجود کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ ہم اتفاق کے ذریعے ہی قائم رہ سکتے ہیں۔ منقسم ہوئے تو پستی میں جا پڑیں گے، میں ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ ہم بین الاقوامی سیاست میں آج جس نازک سیاسی مقام پر کھڑے ہیں وہاں اتفاق واتحاد سے ہی قائم رہ سکتے ہیں۔ منقسم ہوئے تو برباد ہو جائیں گے۔ یہی وقت ہے کہ ہم مکمل ہم آہنگی سے زندہ رہنے کی لازمی ضرورت واہمیت کو سمجھیں۔ چیزوں کو ان کے پس منظر میں دیکھیں۔ حقیقتوں کا اس طرح سامنا کریں جس طرح

سے وہ ہیں نہ کہ جس طرح سے ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ایک غیر متعصبانہ نظریہ زندگی کی تعمیر کریں اور ترقی دیں۔ ہمیں دیانت داری، راست بازی، ملنساری، انکساری عمل، صبر واستقامت اور اعتدال جیسی سچی اسلامی صفات کو ضرور اپنانا چاہئے۔ یاد رکھئے کہ دنیا ہمیں صرف ہمارے ذاتی اوصاف اور ہمارے مذہبی رویے سے جانچے گی۔ جب تک ہم کردار کی ان صفات کو ایک مناسب مقدار میں اجاگر نہیں کریں گے۔ ہم دنیا کی سیاست یا تجارت میں ایک باعزت مقام حاصل نہیں کر سکیں گے۔ علاوہ ازیں اخلاقی برتری کی یہ صفات اپنے اندر نظریہ افادیت کی ایک عظیم قدر بھی رکھتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اور کیا گیا ہے۔ اس سے مایوس ہونے کی قطعاً" کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس بات کو ماننے کے لئے مضبوط دلائل ہیں کہ اپنے ملک کے شاندار مستقبل کے لئے آگے کی طرف دیکھنا چاہئے۔ خوش قسمتی سے آج ملک کی قیادت مضبوط، دانشمند اور سمجھدار لیڈر کے ہاتھوں میں ہے جس کی دماغی اور قلبی خوبیاں اسے اس قابل بنا دیں گی کہ وہ ان مشکل ترین پیش آنے والے وقتوں میں اس نازک کام کو نہایت مہارت اور ہوشیاری سے انجام دے سکے اور اس سفینہ مملکت کی رہنمائی کر سکے۔ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی موجودہ خارجہ پالیسی کی دل و جان سے حمایت کریں جو یقیناً" اچھے نتائج بر آمد کرے گی۔ یہ رہنما نہایت صائب الرائے اور دور اندیش ہے اور جانتا ہے کہ بین الاقوامی بساط سیاست پر اس کی اگلی چال کیا ہوگی نیز یہ داخلی طور پر نظم و نسق کا وسیع تجربہ بھی رکھتا ہے۔ اس کا اسلوب اور اپنے عوام کی حقیقت سے آشنائی اسے قانون اور نظم قائم کرنے کے قابل بنا دے گی

ان تمام معاملات میں جن کا تعلق ہمارے عوام کی معاشرتی اصلاح سے ہے۔ اس کے اسلامی شعور کی روشنی میں کیے گئے اقدامات علاقے کو منور کردیں گے۔ آیئے ہم اس دن کی طرف دیکھیں جب اس کی قیادت میں پاکستان ایک طاقتور، خوددار اور خود مختار ملک بن کر ابھرے گا جو دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ چلے گا۔

پاکستان پائندہ باد

آفتاب اقبال ایم اے (لندن)
بیرسٹر۔ ایٹ۔ لاء، ٹیپو سلطان روڈ۔ کراچی ۸

آفتاب اقبال کی بیماریاں

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک کافی لوگ آخری عمر تک بھی صحت منداور توانار ہتے تھے اور جوں جوں دور حاضر کی آسائشوں اور رہن سہن نے ان کے قدیم معمولات کو تہس نہس کیا۔ بیماریوں کی یلغار شروع ہو گئی۔ اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ پڑھے لکھے اپنا طبی معائنہ باقاعدگی سے کرواتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل پیرا ہونا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔

پیدائش کے ساتھ ہی مختلف عوارض ان کی زندگی کے ساتھی بن جاتے ہیں اور صاحب استطاعت حضرات مناسب علاج معالجے سے بگڑی صحت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

آفتاب اقبال صاحب کو بچپن میں ناک میں تکلیف ہوئی تھی اور ڈاکٹر نے تشخیص کے بعد ان کے لئے ایک چھوٹا سا آپریشن تجویز کیا تھا۔ علامہ اقبال کو بہت تشویش ہوئی لیکن کسی طرح اپنے بیٹے کی صحت کی خاطر وہ آپریشن کے لئے رضامند ہو گئے۔

سرجن میرے دور کے عزیز مرزا یعقوب بیگ تھے۔ اور انہوں نے ایک نشست میں بتایا تھا کہ جس وقت میں آفتاب اقبال کو آپریشن تھیٹر میں لے گیا تو برآمدے میں علامہ اقبال گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کبھی ادھر آرہے تھے اور کبھی ادھر جا رہے تھے۔ اور ان کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ خدا کا کرنا کہ یہ آپریشن کامیاب رہا اور آفتاب اقبال صاحب بالکل تندرست ہو گئے۔

جوانی میں انہیں پھوڑے پھنسیاں نکل آئے تو ان کے تایا جان نے اپنے ایک خط میں اسے آفتاب اقبال صاحب کی عفت اور پاکدامنی پر محمول کیا ہے۔ اپنے خط میں وہ اس سے بچاؤ کی خاطر انہیں حدیث رسول کی روشنی میں روزہ رکھنے کی نصیحت فرماتے

ہیں۔ بہر کیف پھوڑے پھنسیوں کے لئے پہلے دور کے لوگ پچھنے لگواتے تھے اور یوں گندہ اور فاسد خون بہہ جاتا تھا اور پھر مریض پھوڑے پھنسیوں سے بچا رہتا تھا۔ بعض لوگ کڑوی جڑی بوٹیاں بھی استعمال کرتے تھے۔

جب آفتاب اقبال صاحب کی عمر پچاس سے تجاوز کر گئی تو انہیں دل کے عارضے نے گھیر لیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں وہ لاہور (حمیدہ بہن کے گھر آئے ہوئے تھے۔ اور وہ تصویر اتار رہے تھے کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ علاج کی خاطر وہ چند روز تک ڈاکٹر بشیر الدین کی کلینک میں داخل رہے۔ دوسرا دورہ ۱۹۶۳ء میں کراچی میں پڑا اور انہیں ڈاکٹر کرنل شاہ کے زیر علاج رہنا پڑا۔ پھر ۱۹۷۶ء میں سوئزرلینڈ میں دل کا تیسرا دورہ پڑا اور ڈاکٹر پروفیسر ہولز مین کے زیر علاج رہے۔ چوتھا دورہ ۱۹۷۷ء میں نوید کے فلیٹ واقع لندن میں پڑا چند روز Hospital St. Thomas میں زیر علاج رہے۔ اور ان کے معالج ڈاکٹر اسٹیفن تھے۔ پانچویں بار دسمبر ۱۹۷۸ء میں گھر پر اس عارضے میں مبتلا ہوئے اور کراچی کے ہلال ہسپتال میں زیر علاج رہے اور ان کے معالج ڈاکٹر مسعود صاحب تھے۔ ۱۹۷۹ء میں آخری اور چھٹا دورہ پڑا اور انہیں لندن کے لندن کلینک میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ روز ہشاش بشاش رہے پھر اچانک ۱۳ اگست کو لندن کے وقت کے مطابق رات ۱۰۱/۲ بجے اور پاکستانی وقت کے مطابق صبح ۳۱/۲ بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

ان کی بیماری کی کیفیت سے گھر والوں کو آگاہ کر دیا گیا۔ گھر والے لندن جانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ کی شان لندن میں ان کی دیکھ بھال پر ڈاکٹر نوید اقبال ان کے چھوٹے صاحبزادے متعین تھے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے لندن میں اپنے عزیزوں کے گھر گئے کہ انہیں نرسوں نے ٹیلفون پر اطلاع دی کہ آپ کے والد محترم انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس دورے کے بعد ان کے یار غار اور پرائیویٹ سیکریٹری جناب ہمایوں اختر صاحب نے انہیں انگریزی میں خط لکھا۔ شاید یہ خط انہوں نے آخری خط سمجھ کر پڑھا ہو۔

ہر روز ہی اپنے پیاروں کو ہم رخصت کرتے رہتے ہیں
تقدیر جہان فانی ہے یاں موت بھی مثل پیدائش
ماں باپ بہن بھائی سب کی ایذائے جدائی سہتے ہیں
اک روز اسے رونا ہے جسے اب جیون ساتھی کہتے ہیں

(فواد ایک ترکی شاعر)

وفات جناب آفتاب اقبال

محترم جناب بیرسٹر آفتاب اقبال لندن میں ۱۳ اگست ۱۹۷۹ء بوقت رات دس بجے (پاکستان ٹائم) خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان للہ وانا الیہ راجعون۔

کافی عرصہ سے وہ دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ انہیں انجائنا کا مرض تھا۔ اور اس موذی مرض کے چھ دورے پڑے اور چھٹا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔

پانچواں دورہ دسمبر ۱۹۷۸ء میں پڑا۔ وہ چند مہینے قبل ہی لندن سے طبّی معائنہ کروا کر وطن واپس آئے تھے۔ ۲۰ دن ہسپتال میں داخل رہے۔ گھر واپس آنے پر ڈاکٹر نے مکمل آرام کی تاکید کی تھی اور مزید سفر کی ممانعت کر دی تھی۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ لندن اور سوئزر لینڈ میں اپنا طبّی معائنہ ایک مرتبہ پھر کروائیں گے۔

ان کا چھوٹا بیٹا نوید اقبال موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے کراچی آیا ہوا تھا۔ اس کے ہمراہ وہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں کسی عزیز کے ہاں ٹھہرے۔ اسی رات سخت تھکاوٹ کی وجہ سے جب وہ بیت الخلاء جانے لگے تو انہیں چکر آئے۔ وہ گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر کو بلوایا گیا تو معلوم ہوا یہ دل کا دورہ نہیں بلکہ تھکاوٹ اور کمزوری سے یہ حالت ہوئی ہے۔ صبح ان لوگوں نے انہیں ایک کلینک میں داخل کروا دیا تاکہ دیکھ بھال اچھی طرح سے ہو سکے۔ ان کی صحت بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ لیکن اچانک بیسویں دن انہیں اچانک سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ نرس کو بلوایا۔ نرس آکسیجن سلنڈر کا انتظام کر کے پانچ منٹ میں واپس آ گئی۔ اتنے میں آفتاب اقبال کی روح جسد خاکی کو چھوڑ چکی تھی۔ یہ ان پر چھٹا دورہ پڑا تھا اور یہی جان لیوا ثابت

ہوا۔ انہوں نے پسماندگان میں ایک بیوہ اور تین بیٹوں کو چھوڑا۔

ان کی میت ۱۵ اگست کو صبح کے وقت کراچی پہنچی اور اسی دوپہر بعد نماز ظہر انہیں سخی حسن کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

آفتاب اقبال صاحب کی نماز جنازہ لندن کی ایک مسجد ریجنٹ پارک میں پڑھائی گئی اور جب ان کا جسد خاکی کراچی پہنچا تو دوسری بار ان کی نماز جنازہ مسجد نجم میں پڑھائی گئی یہ مسجد آفتاب اقبال صاحب کی رہائش گاہ سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔

آفتاب اقبال مرحوم کے دینی عقائد اور ان کی تدفین کا مسئلہ

از جناب سید نور محمد قادری صاحب مدظلہ

خفتگان کراچی نفیس اور دیدہ زیب کتاب نومبر ۱۹۹۱ء میں ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے مرتب صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب ہیں۔ کتاب میں ان مشاہیر کے مزاروں کے کتبے درج ہیں جو کراچی میں مدفون ہیں۔ فاضل مصنف نے ساتھ ہی مختصرا" ہر صاحب مزار کا تعارف بھی درج کتاب کردیا ہے۔ مشاہیر کا تعارف کراتے ہوئے مصنف کے قلم سے دانستہ طور پر کئی اصحاب کے متعلق غیر محتاط قسم کے الفاظ نکل گئے ہیں۔ مثلا" جناب آفتاب اقبال اور نیاز فتح پوری صاحب کے تعارف میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ کردار کشی کے ذیل میں آتے ہیں۔ پھر یہ کتاب ایک عام آدمی کے قلم سے نہیں نکلی بلکہ پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے صدر شعبہ تاریخ کی شب و روز محنت کا ثمرہ ہے۔ مذکورہ بالا ہر دو حضرات کے بارے میں فاضل مرتب نے جو غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مواخذہ از حد ضروری ہے اور اس مختصر سے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ قارئین کتاب کے سامنے اصل حقائق لائے جائیں تاکہ وہ صدر شعبہ تاریخ کے دام ہمرنگ زمین سے محفوظ رہ سکیں - سب سے

پہلے پروفیسر صاحب کے قلم سے آفتاب اقبال مرحوم کا تعارف ملاحظہ ہو۔ حافظ بشیر احمد غازی آبادی کی قبر (قبرستان سخی حسن) سے جو سڑک قبرستان کی مشرقی دیوار کی جانب جاتی ہے۔ اس کے آخری سرے پر علامہ محمد اقبال کے بڑے فرزند آفتاب اقبال کی آخری آرام گاہ ہے۔ ان کا انتقال لندن میں ہوا تھا۔ لیکن میت کراچی لائی گئی ۔پہلے انہیں کورنگی میں مفتی محمد شفیع دیوبندی کے احاطہ قبور میں دفن کرنے لگے تھے ۔لیکن ان کے عقائد واضح نہیں تھے۔ بعض لوگ انہیں قادیانی سمجھتے تھے ۔ اس لئے مفتی صاحب کے قریب انہیں جگہ نہ مل سکی ۔

نیاز فتح پوری صاحب کے بارے میں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں

پاپوش نگر کے قبرستان میں کراچی کے بہت سے شعراء اور ادباء محو خواب لبدی ہیں۔ اس قبرستان کا شمال مشرقی گوشہ تو بجا طور پر ویسٹ منسٹر ایبے کہلانے کا مستحق ہے اس گوشے میں اندرونی سڑک کے کنارے ایک چھتری کے نیچے نگارستان، مالہ، وماعلیہ ،مشکلات غالب اور من ویزدان کے مصنف اور مشہور نقاد نیاز فتح پوری آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بات زبان زد خلائق ہے کہ وہ اللہ، رسول، قرآن اور اسلام کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ان کی قبر کے تعویز پر کلمہ کندہ ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم ،نیاز صاحب مانیں نہ مانیں کلمہ ان کی قبر کے سینے پر نقش کالحجر ہے اور اپنی صداقت کا لوہا منوا رہا ہے۔

پروفیسر صاحب نے آفتاب اقبال مرحوم پر دو الزام لگائے ہیں: اولا": وہ قادیانی تھے۔ ثانیا" : قادیانی ہونے کی وجہ سے انہیں مفتی محمد شفیع صاحب کے مسلکی قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا۔

آفتاب اقبال کے بارے میں پروفیسر صاحب کی زہر آلود غیر تحقیقی تحریر کو پڑھ کر میں نے پروفیسر صاحب کو خط لکھا کہ وہ آفتاب اقبال کے عقائد اور تدفین کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالیں تاکہ عام قاری بھی آسانی سے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ سکے۔

آفتاب اقبال کی بیوہ رشیدہ آفتاب کو بھی لکھا کہ وہ تدفین کے مسئلہ کو پوری وضاحت سے تحریر کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ خدا بھلا کرے محترمہ رشیدہ آفتاب صاحبہ کا انہوں نے تدفین کے مسئلہ کو اتنی وضاحت سے لکھا ہے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔

پروفیسر اسلم صاحب نے میرے خط کا جو جواب دیا وہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے ذیل میں آتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

میں نے خفتگان کراچی کی تالیف کے دوران یہ کوشش کی ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ آفتاب اقبال کے بارے میں دوسرے ایڈیشن میں یہ فقرہ گول کردوں گا (یعنی آفتاب اقبال قادیانی تھے سید نور محمد قادری) میرا ایک مرزائی شاگرد اکرم گوجر موضع سمائیلہ تحصیل کھاریاں کا رہنے والا ہے۔ ان دنوں امریکہ میں ہے۔ اس نے گجرات میں شادی کی اور خود کو سنی حنفی ظاہر کیا۔ مرزائی اور شیعہ کتمان حق کے قائل ہیں۔ بہر حال اس کتاب کی تالیف کا مقصد مذہبی بحث و مجادلے نہیں ہے۔ میں دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردوں گا۔

پروفیسر صاحب نے اس خط سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ آفتاب اقبال صاحب قادیانی تھے اور مولانا حامد جلالی صاحب نے اپنی کتاب علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی میں آفتاب اقبال کے جو دینی عقائد آفتاب صاحب کی زبانی بیان کئے ہیں وہ تقیہ کا کرشمہ ہیں۔ پروفیسر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ان کے اس مفروضہ کی زد کہاں تک پہنچی ہے۔ اس مفروضے کا سہارا لے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب دیوبندی، مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی، مولوی شبیر احمد عثمانی، سید سلیمان ندوی اور مولوی سعید احمد صاحب اکبر آبادی وغیرہم کے وہ عقائد جو انہوں نے اپنی کتابوں میں بیان کئے ہیں۔ وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ حقیقت میں وہ لوگ مرزائی اور بد عقیدہ تھے۔ کسی کا قلم کون پکڑ سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب! اکرم گوجر کی مثال دے کر آپ اس بغض کو سامنے لے آئے ہیں جو حضرت علامہ کی اولاد کے خلاف آپ

کے دل میں تھا اور آپ مدت العمر سے اسے چھپائے ہوئے تھے۔ ہاں آپ کے خط سے ایک نئی اور دلچسپ بات سامنے آئی ہے کہ آپ کے دوستوں اور معتقدوں میں مرزائی حضرات بھی شامل ہیں۔ اکرم گوجر کا ذکر جس انداز میں آپ نے کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے تقیہ کا سہارا لے کر نکاح کے رجسٹر میں اپنے سنی حنفی ہونے کا اندراج کروایا ہے ایسی بات گھرے تعلقات والا آدمی پہچان سکتا ہے۔ آپ یقیناً" اس شادی میں شریک ہوئے ہوں گے۔ رجسٹر آپ کے سامنے پر کیا گیا ہوگا۔ آپ ولیمہ میں بھی شریک ہوئے ہوں گے اور ایک کافر کے گھر سے جی بھر کر کھانا کھایا ہوگا۔ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھا سکتا ہے۔

اس خط کے بعد میں نے پروفیسر صاحب کو ایک اور خط لکھا کہ اکرم گوجر کی مثال دے کر آپ نے مسئلہ کو مزید الجھا دیا ہے۔ اگر آفتاب اقبال واقعی قادیانی تھا تو مذکورہ فقرہ کو گول کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ آفتاب کو علی الاعلان کافر کہئے اور لکھئے لیکن کوئی ٹھوس اور معقول ثبوت پیش کیجئے۔ پروفیسر صاحب نے جوابا" تحریر کیا۔

خفتگان کراچی کوئی سوانحی کتاب نہیں ہے۔ میں نے قبروں کے کتبے محفوظ کرنے تھے۔ وہ کر دیئے ہیں۔ میں نے جو سنا تھا وہ لکھ دیا۔ اگلے ایڈیشن میں یہ فقرہ اڑا دوں گا۔ نیاز فتح پوری سنی حنفی رضوی ہوگا۔ لیکن فتنہ انکار حدیث کا بانی ضرور ہے۔

مندرجہ بالا سطور کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے پروفیسر صاحب نے محض سنی سنائی بات پر کتنا بڑا غیر معقول الزام ڈاکٹر اقبال کے بیٹے پر لگا دیا ہے۔ کاش پروفیسر صاحب یہاں جرات ایمانی سے کام لیتے۔ جس شخص یا جن اشخاص سے انہوں نے آفتاب کے قادیانی ہونے کا سنا تھا۔ ان کے نام ہی ظاہر کر دیتے۔ ویسے معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مفتی صاحب کے مدرسہ اور قبرستان کے ذمہ دار حضرات کا کیا دھرا ہے۔

واللہ علم بالصواب۔

اب میں ذیل میں محترمہ و مکرمہ رشیدہ آفتاب اقبال کا خط درج کر رہا ہوں جس سے مسئلہ تدفین کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے بعد آفتاب صاحب کے دینی عقائد تفصیل سے پیش کروں گا۔ پہلے تدفین کا مسئلہ۔ محترمہ رشیدہ آفتاب اقبال صاحبہ فرماتی ہیں: محترم بھائی سید نور محمد قادری صاحب السلام علیکم۔ آپ کا خط ملا بے حد شکریہ۔ آپ نے بہت اچھا پوائنٹ اٹھایا ہے۔ واقعی پروفیسر اسلم کو منہ توڑ جواب دینا چاہئے۔ اس بات کا جواب دینے سے پہلے تھوڑی سی بیک گراؤنڈ بیان کردوں آفتاب صاحب کا شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ وہ آخری عمر پنجاب بلکہ لاہور میں گزاریں گے۔ وہیں سکونت اختیار کریں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ لاہور میں کسی اچھے صاف ستھرے قبرستان میں ہمارا اپنا احاطہ ہو جہاں ہماری فیملی کی قبریں ہیں۔ جس طرح سیالکوٹ میں ددھیال کا ہے اور گجرات میں ننھیال کا۔ اس سلسلے میں تحقیقات شروع ہوئی کہ کہاں جگہ مل سکتی ہے۔ میرے ایک بھائی انفارمیشن آفیسر تھے اور ان کا محکمہ اوقاف سے بھی تعلق تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اول تو وہاں کوئی ایسا قبرستان نہیں ہے۔ جہاں فالتو زمین ہو بالکل فل ہیں اور ایک قبر سے زیادہ جگہ نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد ہم نے (لاہور میں) تلاش کا کام ختم کر دیا۔ یہ سوچ کر آفتاب اقبال کا انتقال لندن کلینک میں ہارٹ اٹیک سے ہوا اور ان کا چھوٹا بیٹا نوید اقبال ۱۵ اگست ۱۹۷۹ء کو ان کی میت لے کر کراچی پہنچا۔ انتقال ۱۴ اگست رات ۱/۲ ۱۰ بجے ہوا تھا۔ ہمیں اطلاع آئی تو چند ایک عزیز دوستوں اور میرے و آزاد کے درمیان دفن کرنے کا مسئلہ اٹھا کہ انہیں کس قبرستان میں دفن کیا جائے۔ کراچی کے قبرستان بھی تقریباً" فل ہو چکے ہیں۔ ان میں ایک قبر کی بھی صحیح جگہ

نہیں ہے۔ مجاور پرانی قبریں توڑ توڑ کر جگہ دے رہے ہیں۔ ہم نے یہ کام آفتاب صاحب کے ایک بہت ہی عزیز دوست کے سپرد کیا وہ ابھی تک حیات ہیں۔ وہ دور دور کے قبرستانوں پر بھی گئے۔ میرا بڑا لڑکا آزاد ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے تلاش کے بعد ہمیں دو جگہیں بتائیں ایک تو یہی کورنگی میں حضرت محمد شفیع والی۔ دوسری سخی حسن قبرستان والی۔ دیوبندی والی کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں دیوبندی فرقہ کے لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہاں بھی چار دیواری ہے۔ گیٹ لگا ہوا ہے۔ کوئی آدمی اجازت نامے کے بغیر اندر نہیں آسکتا۔ وہیں پر ان کا دفتر ہے۔ دفتر میں جا کر اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ جو ٹائم ملے وہاں جانے کا، اس وقت جانا ہوگا۔ اور وہاں بھی ایک قبر کی زمین ملتی ہے۔ احاطہ نہیں مل سکتا۔

دوسری جگہ کے متعلق معلوم ہوا کہ سخی حسن قبرستان گورنمنٹ نے نیا نیا شروع کیا ہے۔ کیونکہ شہر کے قبرستان بہت فل ہو چکے ہیں۔ نارتھ ناظم آباد کے قریب جو ہمارے گھر سے تقریباً" بارہ میل دور ہوگا۔ بہت صاف ستھرا ہے۔ اس میں سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ پھولوں اور کتبے بنانے والوں کی دکانیں ہیں اور کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ جس وقت کوئی جانا چاہے فاتحہ کے لئے جا سکتا ہے۔ بہت بڑی زمین ہے۔ اس وقت چند ایک قبریں بنی تھیں۔ پکی قبریں بنوانے کا بھی وہیں انتظام ہو جاتا ہے۔ وہاں صفائی کے لئے ملازم ہیں، مالی ہیں اور پانی کا انتظام ہے۔ سب سے بڑی بات اس قبرستان میں احاطہ بھی مل سکتا ہے۔ وہاں مجاور اسماعیل تھا۔ اس سے بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ محکمہ اوقاف سے خط لے آئیں تو ہم آپ کو احاطہ الاٹ کر دیں گے۔ میری مرحومہ بہن مس وحیدہ روشن یہاں موجود تھی۔ اس کے جاننے والے کراچی میں کمشنر لگے ہوئے ہیں۔ میری بہن نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے ہمیں خط

لے دیا۔ اس طرح آفتاب صاحب کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور ہمیں ۴، ۵ قبروں کی زمین مل گئی۔ ہم نے اس کے چاروں طرف دیوار بنوائی ہے۔ گیٹ ہے۔ اب وہاں تین قبریں بن گئی ہیں۔ آفتاب اقبال ، وقار اقبال اور مس وحیدہ روشن کی۔ یہ وہی وحیدہ روشن ہیں جنہوں نے کمشنر سے کہہ کر زمین حاصل کی تھی۔ ان کا انتقال ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ء میں ہوا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کو اسی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم نے ان کو وہاں (مفتی صاحب کے قبرستان میں) دفن کرنا مناسب نہ سمجھا یا انہوں نے یہ کہہ کر آفتاب اقبال احمدی تھے جگہ نہیں دی۔

آفتاب اقبال مرحوم کی تدفین کے بارے میں محترمہ رشیدہ آفتاب صاحبہ نے اتنی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ مزید تحقیق و جستجو کی ضرورت نہیں۔ شاید یہ تحریر پڑھ کر پروفیسر صاحب بھی مطمئن ہو جائیں۔

اب آفتاب صاحب کے مذہبی عقائد ملاحظہ ہوں جو مولانا حامد جلالی صاحب کی مرتبہ کتاب علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی میں آفتاب صاحب کی زبانی درج ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ مولانا لکھتے ہیں: پروفیسر آفتاب کو علمی ذوق اپنے باپ سے ورثہ میں ملا۔ بہ حیثیت بیرسٹر لا آپ کی قانونی واقفیت بے مثل ہے اور امور مذہبی میں اپنے دادا اور نانا سے تربیت کا شرف حاصل کیا ہے۔ میں نے عقیدہ کے متعلق سوال کیا تو بیرسٹر صاحب نے فرمایا۔

(ا) چونکہ میں نے علوم مذہبی تفسیر ، قرآن حکیم ، تشریح احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور توضیح مسائل فقہ کی تعلیم اس طرح حاصل نہیں کی جس طرح علوم مغربی ، فلسفہ و قانونی کو میں نے پڑھا ہے اور جس قدر تعلیم مجھے اس سلسلہ میں اپنے

دادا شیخ نور محمد صاحب سے اور اپنے نانا خان بہادر، حاجی، حافظ عطا محمد صاحب سے حاصل ہوئی۔ اس میں مجھے کہیں شبہ وارد کرنے کا موقع محسوس نہیں ہوا۔

(۲) میں پکا حنفی للمذہب مسلمان ہوں اور صوفی المشرب ہوں اور اپنے باپ دادا اور نانا کے جادہ عمل پر نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم اور گامزن ہوں اور اپنے والد کے فرمان کے عین مطابق اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند۔

(۳) الحمدللہ میرے دونوں بھائی بہن (جاوید اقبال اور منیرہ بانو) بھی سچے مسلمان ہیں۔ قادیانی نہیں ہیں۔ عطا محمد کی اولاد اقبال اقبال کی مالا جپتی ہے۔ لیکن اقبال کی تعلیم اور مذہب کے خلاف قادیانی مذہب رکھتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بت پرستی چھوڑ کر خدا پرستی اختیار کی تھی اور دین اسلام کی فرمانبرداری میں نام پیدا کیا تھا۔ لیکن عطا محمد نے اس خوشنما تبدیلی مذہب میں عیب لگا دیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ کاٹ کر مرزا غلام احمد سے رشتہ جوڑ لیا۔ جس نے انگریز کی تائید میں اسلام سے جہادی اسپرٹ کو فنا کرنے کی زندگی بھر کوشش کی اور انگریز سے صلہ پایا۔ مرزا غلام احمد نہ ہمارے دادا کا نبی تھا۔ نہ ہمارے باپ کا۔ اس لئے خوہ کوئی ہمارا چچا ہو یا اس کی اولاد، اگر وہ مرزا غلام احمد کو نبی مانتی ہے تو ہم سے، ہمارے آباؤ اجداد سے اور ہمارے مذہب سے اس کا دور کا واسطہ بھی باقی نہیں۔

اپنے عقائد بیان کرتے ہوئے آفتاب اقبال صاحب نے بار بار کہا ہے کہ میرے وہی عقائد ہیں جو میرے باپ دادا اور نانا کے ہیں۔ آفتاب صاحب کے باپ اور دادا کے عقائد سے تو سبھی واقف ہیں۔ ہاں ان کے نانا (حاجی شیخ عطا محمد کے عقائد کے بارے میں مختصرا" عرض ہے۔

جناب شیخ عطا محمد صاحب کی قبر کے کتبے کی عبارت یہ ہے:

یا اللہ ۷۸۶ یا محمد

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کل من علیہا فان

حافظ حاجی شیخ عطا محمد مرحوم و مغفور

تاریخ وفات ۱۴، دسمبر ۱۹۲۲ء

عمر ۷۶ سال

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

پروفیسر اسلم صاحب خفتگان کراچی کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں: کتبے پر مرقوم عبارت سے صاحب قبر کے مذہب عقائد کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً" جن حضرات پر توحید کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کے کتبوں پر یا حی یا قیوم کندہ ہوتا ہے۔ بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کی قبروں کے کتبوں پر یا اللہ، یا محمد، یا غوث الاعظم دستگیر ہوتا ہے۔

چونکہ شیخ عطا محمد صاحب مرحوم کی قبر کے کتبے پر یا اللہ اور یا محمد کندہ ہے۔ اس طرح وہ پروفیسر صاحب کے کلیے کے مطابق بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔

آفتاب اقبال مرحوم کے دینی عقائد کے بارے میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ریٹائرڈ جسٹس سپریم کورٹ سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے جواباً" تحریر فرمایا: میں نہیں کہہ سکتا کہ پروفیسر اسلم صاحب جنہوں نے خفتگان کراچی کتاب تحریر کی ہے۔ ان کی SOURCE (ذریعہ) آفتاب اقبال مرحوم کے عقائد کے متعلق کیا ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے۔ وہ حنفی العقیدہ سنی تھے اور احمدیت کے مخالف تھے۔ آج کل مسلمانوں میں تفرقہ بازی کی حالت کچھ ایسی ہے کہ جسے چاہتے ہیں کسی نہ کسی

عقیدہ کی دم لگا لیتے ہیں۔ جب انتشار کی یہ کیفیت ہو تو ہر کسی کا عقیدہ بھی متنازعہ بنایا جا سکتا ہے۔

جاوید اقبال صاحب کے خط کے اس اقتباس پر یہ مقالہ ختم کیا جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے جناب نیاز فتح پوری مرحوم کو منکر خدا اور منکر رسول کہا ہے اور طنزاً" حنفی سنی رضوی لکھا ہے۔ اس کا جواب ایک علیحدہ مضمون میں دیا جائے گا۔

وما علینا الا البلاغ المبین
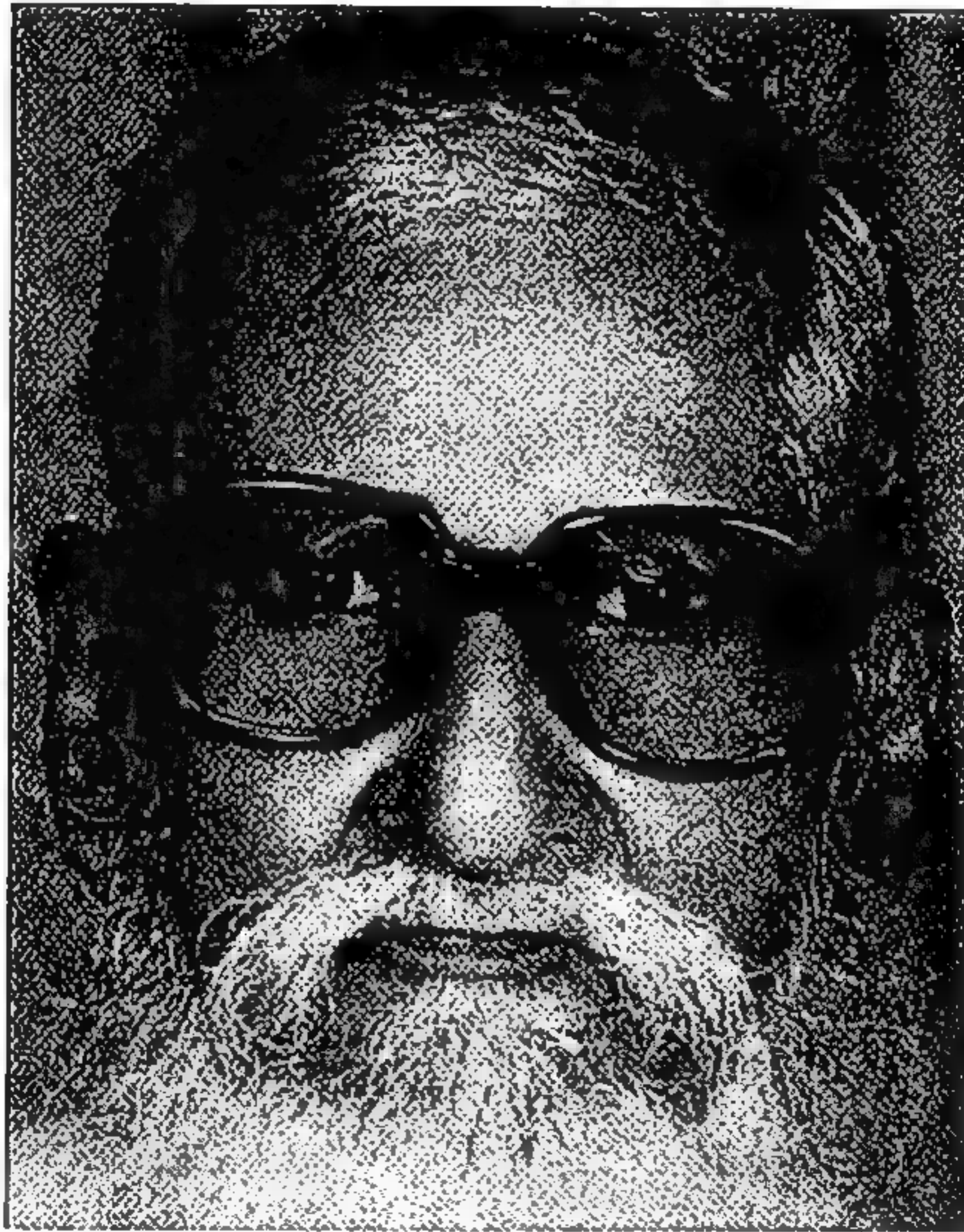
مشہور محقق اور ماہر اقبالیات جناب سید نور محمد قادری

مرثیہ بر وفات

آفتاب اقبال

فرزند اکبر حضرت علامہ اقبال شاعر مشرق

میری آنکھیں خون برساتی ہیں چہرہ زرد ہے
کس کے غم میں آج میرا دل سراپا درد ہے

کیوں مقدر ہو گیا ہے عمر بھر حزن و ملال
اب نظر آتی ہے وائے زندگانی بھی وبال

سوز گریہ سے جھلس جائے نہ دل کا آشیاں
کس کو جا کر ہم سنائیں اپنے غم کی داستاں

زیست کیا ہے چار دن دنیائے فانی میں قیام
مرگ جس سے آخرش لیتی ہے اپنا انتقام

زندگی ہر شخص کی ہے اک متاع مستعار
یہ حقیقت ہے تو پھر کیا زندگی کا اعتبار

بزم ہستی ہے وہی لیکن وہ صورت ہے کہاں
جو تھی وجہ راحت دل، باعث تسکین جاں

کیوں نظر آتے نہیں ہیں میرے بھیا آفتاب
جو شرافت اور نجابت میں تھے فرد لاجواب

چھوڑ کر تنہا ہمیں وہ چل دیئے سوئے عدم
کر گئے ہیں ہم کو وہ اب مبتلائے رنج و غم

بجھ گئی ہے آفتاب اقبال کی شمع حیات
کس بشر کی زندگانی کو میسر ہے ثبات
محفل ہستی کی رونق ماند آتی ہے نظر
اس کے مرنے کا ہر اک کو رنج و غم ہے کس قدر
لٹ گیا صد حیف ہمشیرہ رشیدہ کا سہاگ
بیوگی کا رنج آخر بن گیا ہے اس کا بھاگ
اس کے دل کے سارے ارماں خاک میں ہی مل گئے
نوحہ خواں دیکھا اسے تو دل ہمارے ہل گئے
اک مرقع رنج و غم کا صورت آزاد ہے
ہے غم مرگ پدر، وہ اس لئے ناشاد ہے
ہے شریک ماتم والد وقار اقبال بھی
تلخی احساس سے ہے غیر اس کا حال بھی
نوید اقبال میں دیکھا گلوں کا بانکپن
منعکس ہے اس کے چہرے پر خزاں دیدہ چمن
بسمٹ وپاشا وسپرو کا ہوا ہے غیر حال
ان کو بے حد وگماں مرگ پدر کا ہے ملال
ان کے ارمانوں کا گلشن ہوگیا تا راج کیوں؟
گھر کا نقشہ اس قدر بدلا ہوا..ہے آج کیوں؟
ایک انسان کے چلے جانے سے کیا کچھ ہوگیا
کس کو جا کر ہم سنائیں اپنے غم کا ماجرا

گھر کے سقف وبام و در بھی محو ماتم ہوگئے
آفتاب اقبال لبدی نیند جب سے سو گئے

ہے وہی محفل مگر وہ جان محفل ہی نہیں
اس کے مرنے کا مگر آتا نہیں ہم کو یقیں

یاد ان کی ہے ہمارے دل میں اب بھی موجزن
جیسے ہو باد بہاراں محو گلگشت چمن

کر عطا مرحوم کو فردوس میں اونچا مقام
یہ دعا کرتے ہیں تجھ سے اے خدا ہم صبح وشام

کر عطا پسماندگاں کو دولت صبر جمیل
اے خدائے ذوالجلالِ والے کرم والے جلیل

اے میرے مرحوم بھیا آفتاب اقبال سن
سن سکے تو ہاں ذرا پروین کے غم کا حال سن

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(از قلم مس وحیدہ روشن پروین جالندھری)

میری نظر میں آفتاب اقبال

محبت اور رفاقت جذبوں کے وہ خوبصورت سائے ہیں جو جدائی کے اندھیروں میں بھی ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ فرصتوں کی عمر کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو مگر لمحوں کا حسن جب بھی ماضی کی ورق گردانی کریں، یادوں کے چہرے پر پھیل جاتا ہے۔ آج عہد رفتہ کا وہی جمال میرے قلم کے ساتھ رواں دواں ہے۔ آفتاب اقبال کی شخصیت ان کے نام کی طرح واضح، درخشاں۔ بے داغ اور عیاں ہے۔ وہ نہ صرف علامہ اقبال کے پہلے بیٹے، شیخ نور محمد کے پہلے پوتے، صوفی و درویش صفت ڈاکٹر خان بہادر سول سرجن رئیس گجرات کے نواسے اور مولوی میر حسن شمس العلماء کے شاگرد تھے بلکہ بذات خود عربی، فارسی و دنیاوی علوم کے عالم، فلاسفر اور بیرسٹر تھے۔ باکمال شعری ذوق کے مالک تھے، علامہ اقبال کے اشعار انتہائی عقیدت سے بیان کرتے۔ گو کہ باپ کی شفقت اس حد تک نہ پا سکے جو ان کا حق تھی۔ مگر پھر بھی ان سے والہانہ محبت کرتے اور اپنی اس محرومی کا عکس انہوں نے اپنے بیٹوں پر نہ ہونے دیا بلکہ ان کی تربیت اور پرورش میں بے پناہ محبت، دولت اور توجہ صرف کی۔ انہیں بہترین اسکولوں کالجوں میں داخل کر دیا، نیز اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن اور امریکہ بھیجا۔ دولت کی جو کمی انہوں نے اپنی زندگی میں محسوس کی تھی وہ مجھے اور بیٹوں کو کبھی محسوس نہ ہونے دی۔ یہاں تک کہ زندگی کے بعد بھی ان کی آسائشوں کا معقول انتظام کیا۔

سیر و سیاحت کے رسیا تھے۔ بچوں سے ملاقات کے لئے لندن اور یورپ کے علاوہ مجھے دنیا کی سیر کروائی۔ مصر، بیروت، اٹلی، سوئزرلینڈ، جرمنی، آسٹریا، ہالینڈ، بلجیم، فرانس، انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی شاہراہیں ہمارے قدموں کے نشانوں کی آج بھی گواہ

ہیں۔ وہاں کے اعلیٰ ہوٹلوں میں ہمارے وجود کی خوشبو آج بھی بسی ہوئی ہے۔ وہاں کے خوبصورت مناظر آج بھی آفتاب اقبال صاحب کی تصویر کشی میں پنہاں ہیں۔ کیونکہ وہ بہترین فوٹوگرافر تھے اور قیمتی کیمرے، اٹلی کے شوز، سوئزرلینڈ کی گھڑیاں ان کا شوق تھے۔ بیش قیمت مووی کیمرے، بے شمار گھڑیاں، جوتے اور سوٹ ان کی شاپنگ کا مرکز۔ اپنے بیٹوں نوید اور آزاد کو ۱۹۶۵ء میں اور پاشا کو ۲۶ اگست ۱۹۶۴ء میں ایرڈین اسکاٹ لینڈ چھوڑنے گئے۔ بحیثیت باپ اور شوہر ان کی شخصیت مسحور کن تھی۔ مگر بحیثیت انسان بھی وہ مکمل تھے۔ دردمند اتنے کہ ہر دکھی انسان کی پریشانی پر تڑپ اٹھتے اور حتی المقدور اس کی ہر ممکن مدد کرتے۔ دوستوں کو قرض دیتے مگر تعلقات کی خرابی کے باعث بعد میں قرض دینا چھوڑ دیا۔ دوغلے پن سے سخت نفرت کرتے۔ بعض لوگ اپنی اس عادت کی وجہ سے گھر سے نکالے گئے جن میں فقیر وحیدالدین قابل ذکر ہیں۔ انتہائی مہمان نواز تھے۔ اکثر خوبصورت محفلیں گھر میں منعقد کرتے۔ ہر ماہ دوستوں کو مدعو کرتے۔ بلکہ ان کی ایک دلنشیں عادت آج بھی ہم اپنائے ہوئے ہیں کہ ۴ بجے کی چائے ہمیشہ اکٹھے پیتے ہیں۔ آج بھی جب شفقی دھوپ میرے آنگن میں اترتی ہے تو ان کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے اور ہم دلوں میں اداسی لئے اپنی اپنی چائے کی پیالیاں تھامے مل بیٹھتے ہیں۔ صاف گوئی، فیاضی، دلجوئی، شفقت، محبت کے علاوہ نفاست پسندی ان کی نمایاں خوبی تھی۔ لباس انتہائی قیمتی، صاف اور فیشن کے مطابق پہنتے۔ سوٹ مع ٹائی ان کا پسندیدہ لباس تھا۔ بلاناغہ غسل، دن میں ۲ دفعہ برش کرنا، وقت پر سونا، سیر کرنا، ان کے معمول اور کتابیں پڑھنا ان کا مشغلہ تھا۔ وعدہ خلافی سے سخت نفرت تھی۔ اصولوں کے پابند اور حقیقتوں کے دلدادہ اقربا پرور تھے۔ دوست نواز اس حد تک کہ ہزاروں قرض میں دے دیتے۔ ان مقروض دوستوں میں

رفیع پیرزادہ مرحوم اور نواب رشید علی خان مرحوم شامل ہیں۔ ہر سال سوئزر لینڈ چیک اپ کروانے جاتے مگر باوجود احتیاط . . . چل بسے . . .

بچھڑا کچھ ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

اور رب مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بیگم آفتاب اقبال
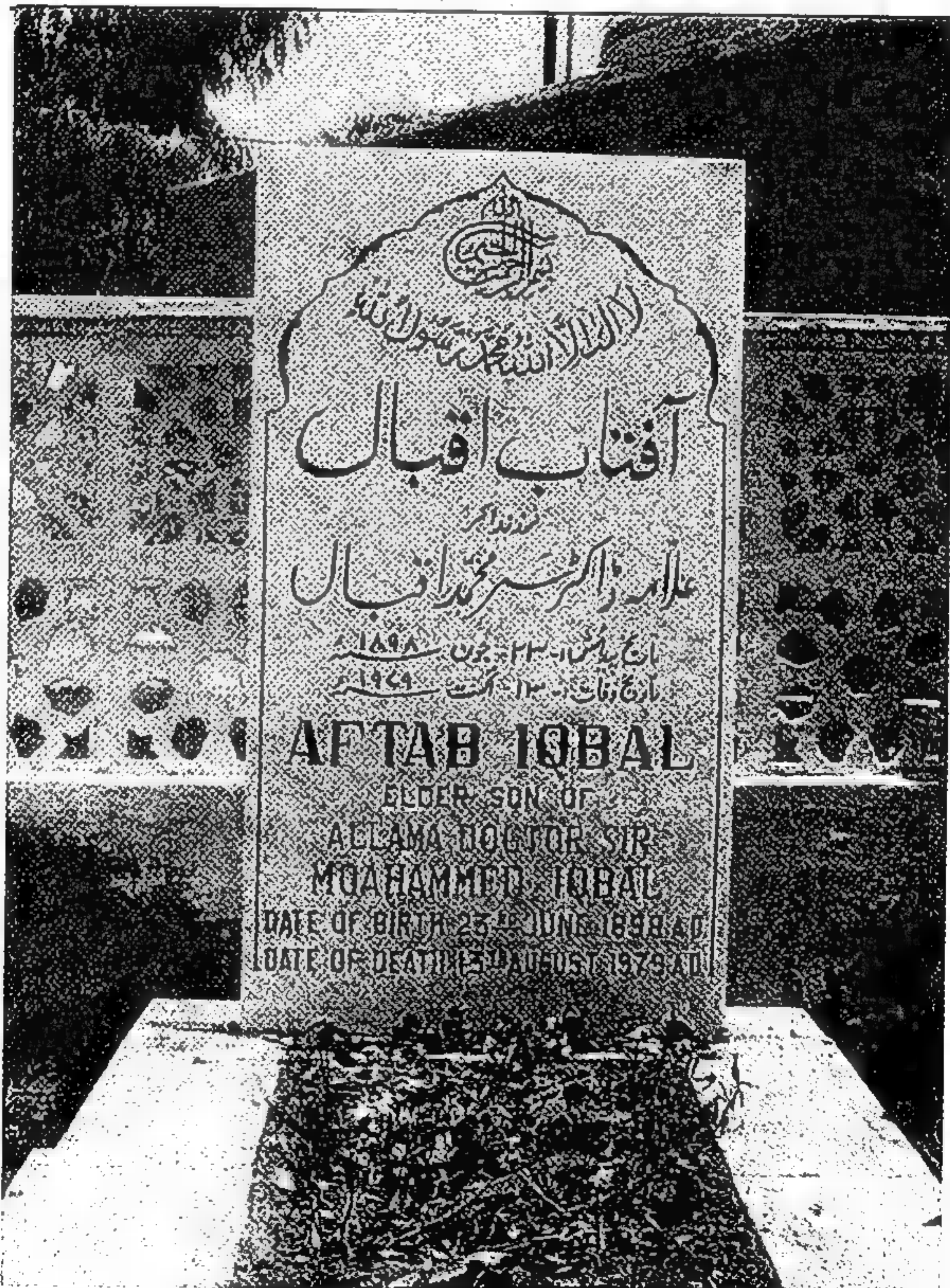
سید سجاد شمسی

عالمی ادب میں کئی ایسے شعرا گزرے ہیں جو نور بصارت سے محرومی کے باوجود بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔

ان ناموں میں عربی ادب میں ابو العلاء معری، طہٰ حسین مصری، شعلان مصری گزرے ہیں، اردو ادب میں جرات لکھنوی قدما میں اور جناب پروفیسر اقبال عظیم عصری ادب میں ایک مقام رکھتے ہیں ان کا کلام صدیق اسمٰعیل نعت خواں کی نوک زبان پر رہتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند سے باہر ہمارے ممدوح سید سجاد شمسی صاحب ہیں۔ ۱۹۷۷ء سے پہلے تقریباً اپنی زندگی کے ساٹھ سال گزار چکے تھے۔ اور ۱۹۷۷ء میں کار حادثہ نے انہیں نور بصارت سے محروم کر دیا لیکن ان کی باطنی صلاحیتوں کو اس قدر جلا بخشی کہ وہ تقریباً بیس سال کے کٹھن سفر میں قارئین کو پانچ مجموعہ ہائے کلام سے نواز چکے ہیں۔ میں شاعری کے فن سے بے بہرہ سہی لیکن ان کے لندن سے شائع شدہ چار مجموعہ کلام پر نظر ڈال چکی ہوں اور اپنی طرف سے ان کے کلام پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ سیارہ ڈائجسٹ ۱۹۶۶ء کے دسمبر کے شمارے میں ان کی شاعری پر ایک بڑا خوبصورت مضمون شائع ہوا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ اردو کے مسکن اور مامن سے کالے کوسوں دور دھونی رمائے ایک مست اور قلندر صفت انسان دہلی لکھنو کی صاف شفاف اور اجلی زبان میں بڑی

سہولت سے اپنے مافی الضمیر کو اشعار کی لڑیوں میں پرونے کے فن میں مصروف ہے اور اپنی محرومی کو سدِ راہ نہیں بننے دیتا اور رجائی انداز اپنا کر خود بھی زندگی گزار رہا ہے اور دوسروں کو بھی حوصلہ بخشتا ہے کہ وہ زمانے کی محرومیوں کے سامنے سرنگوں ہونے کے بجائے اپنی پوری توانائیوں سے اپنی ذات کے حصار سے باہر نکلیں اور کچھ کر دکھائیں۔

شمسی صاحب نے آفتاب اقبال صاحب کی وفات پر اپنے تاثراتِ یادوں کی کلیاں میں رقم کیے ہیں۔ اتنا پیارا انداز اپنایا ہے کہ واقعی آفتاب اقبال صاحب کی زندگی کو چند اشعار کے کوزے میں بڑی خوبصورتی سے بند کر دیا ہے۔

شمسی صاحب کے آباؤ اجداد ملتان کے نواح سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا خاندان ایران کے شہر سبزوار سے برصغیر میں وارد ہوا۔ ان کے اجداد میں سید شمس الدین نامی ایک بزرگ گزرے ہیں اور انہی کے نام کی مناسبت سے وہ شمسی کا تخلص استعمال کرتے ہیں۔

کینیا اور انگلستان کی بود و باش کو اپنانے کے باوجود وہ اپنی اصلی مٹی کی خوشبو سے لاتعلق نہیں ہوئے۔ وہ کئی زبانوں پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ براڈکاسٹنگ کی اعلیٰ افسری میں گزرا ہے۔ دوہری مہاجرت اور محرومی بصارت کے اعصاب شکن واقعات کے باوجود بڑے صبر و شکر سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں اور ان کی رفیقہ حیات انہیں محرومی کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔ وہ لندن کی ادبی مجالس اور تقاریب میں باقاعدگی سے حاضری دیتے ہیں اور اپنے شعری ذوق سے

حظ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو اپنے کلام سے مستفید فرماتے ہیں۔

جولائی ۹۸ء میں ان سے سعودی عرب سے لندن رابطہ کر کے پوچھا کہ شمسی بھائی آپ اپنے بارے میں کچھ فرمائیں تو گویا ہوئے: بہن میری کتابوں کے آغاز میں جو حالات دیئے ہیں وہ کافی ہیں۔ ویسے میں اس وقت چوراسی کے پیٹے میں ہوں یعنی ۱۹۱۴ء میں کینیا میں پیدا ہوئے۔

رشیدہ بیگم

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مشہور شاعر جناب سجاد شمسی صاحب

آفتاب اقبال

یادوں کی کلیاں

از سجاد شمسی لندن

میں کینیا سے لاہور ۱۹۳۶ء میں گیا ہوا تھا۔ سنا کہ مرحوم حفیظ جالندھری آئے ہوئے ہیں۔ سوچا کہ جن بزرگوں کا کلام اردو رسالوں میں پڑھتا چلا آیا ہوں۔ ان سے ملاقات کی جائے۔ حفیظ صاحب سے ملا اور رخصت ہوتے وقت ان سے درخواست کی کہ مجھے علامہ اقبال کی زیارت کے لئے لے چلیں۔ اگلے روز ہم علامہ صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ آپ ان دنوں اکثر علیل رہا کرتے تھے۔ ملاقات کا تو فقط ایک بہانہ تھا۔ مجھے علامہ صاحب کے رخ انور کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ کینیا کو خود مختاری ملنے کے بعد ہم ۱۹۶۴ء میں انگلستان چلے آئے اور اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ ایک روز ہمیں دعوت نامہ وصول ہوا کہ اسلامک کلچر سینٹر ، ریجنٹ پارک کے زیر اہتمام یوم اقبال کی ہونے والی تقریب میں شرکت کریں۔ ہم وہاں پہنچے تو بیگم نے مجھے بتلایا کہ علامہ اقبال صاحب کے فرزند اکبر آفتاب اقبال اور ان کی بیگم رشیدہ اس محفل میں موجود ہیں اور ان کے ہمراہ ان کے بیٹے۔ آزاد اقبال، وقار اقبال اور نوید اقبال بھی آئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان سے ملاقات کی اور ان کے قریب بیٹھ گئے۔ ہمیں یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ یوں لگا جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔

جتنے روز آفتاب صاحب اور باجی رشیدہ لندن رہے خوب ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔تعلقات بڑھتے گئے۔ گھنٹوں گپ شپ ہوتی تھی۔ علامہ صاحب کا کلام انہیں ازبر تھا اور بات بات میں وہ ان کا حوالہ دیتے۔

علامہ صاحب مرحوم کے متعلق جو معلومات مجھے حاصل ہوتے رہے۔ بہت کم لوگوں کے علم میں ہیں۔ آفتاب صاحب کے چند ایک لطائف ہمیں آج تک یاد ہیں جو ہم کئی مجالس میں بیان کرتے ہیں۔ آپ نہایت نفاست پسند انسان تھے۔ لباس اور گفتار پر خاص توجہ دیتے۔

چائے کا ایک کپ بھی پی لینے کے بعد وہ فوراً" باتھ روم میں جا کر دانتوں کو برش کرتے۔ آفتاب صاحب ذرا تیز بولنے کے عادی تھے۔ ان کی گفتگو کا براق کچھ تیز گام تھا اور ہمارے فہم اور ادراک کا رہوار ست رو جس کی وجہ سے وہ کئی باتیں دہرا کر بیان کرتے۔ جس کا کچھ اور ہی لطف ہوتا۔ ان کے کراچی واپس جانے کے بعد ان کے بیٹے بھی گاہے بگاہے ملتے رہے۔ یہ تعلیم کے سلسلے میں یہاں رک گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء کے شروع میں ہمیں لندن سے کراچی ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور دعوت وصول ہوئے۔ ہم نے سفر کی تیاری کر لی۔ ایئر پورٹ پر سامان ہوائی جہاز پر جا چکا تھا۔ کہ بیگم کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں ایمبولینس ہسپتال لے گئی اور میں ہمارا اپنا ہوائی جہاز سے سامان اتروا کر بیک بینی ودو گوش گھر لوٹ آئے۔

خط و کتابت اور ٹیلی فون پر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ جب کبھی لندن آتے مل بیٹھ کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے۔

وقت کا کارواں چلتا گیا اور وہ منحوس گھڑی آن پہنچی جب آفتاب صاحب ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد موٹر کار کے ایک حادثے میں میری بینائی نے مجھے خیر باد کہہ دیا۔ زندگی تہ وبالا ہو گئی۔ زمانہ بدل گیا ،لوگ بدل گئے۔ خود میں بدل گیا اور زبان حال سے یہ کہنا پڑا

آئینہ دیکھ کر میں حیراں ہوں

میرا چہرہ بدل گیا کیسا

مگر ایک چیز نہ بدلی اور وہ تھی باجی رشیدہ کی اور آزاد کی بے لوث محبت۔ جو خط وکتابت کے ذریعے بڑھتی گئی۔ آزاد اقبال بیرسٹری کی تعلیم سے فارغ ہو کر کراچی واپس جا چکے تھے۔

۱۹۸۱ء میں ہمارا کراچی جانا ہوا اور ہم باجی رشیدہ سے ملنے گئے۔ وہ جس تپاک سے ملیں ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان کے یہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں جب انہوں نے آزاد سے کہا۔ بیٹا انکل کو ابا جان کی مخصوص کرسی پر بٹھاؤ۔ ان جملوں میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میرا سر انکسار سے خم ہو گیا۔ ایک مرتبہ باجی رشیدہ وقار اقبال کے ہمراہ کراچی سے امریکہ جاتے ہوئے کچھ روز ہمارے یہاں رک گئیں۔ اردو مرکز لندن میں ایک جلسے کا انعقاد ہوا جس میں پاکستان کے کچھ جانے مانے شعرا اور صحافی بھی موجود تھے۔ ہماری درخواست پر باجی رشیدہ نے امریکہ کا سفر دو ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا اور اردو مرکز کی مجلس میں ہمارے ساتھ شرکت فرمائی - جہاں اپنی خوبصورت اور پرسوز اور دلگداز آواز میں علامہ صاحب مرحوم کی مشہور نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں سنائی۔ میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو جانے کا احساس ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سامعین میں سے کسی کی بھی آنکھ ایسی نہ تھی جس نے اشکوں سے باوضو ہو کر باجی رشیدہ کو خراج تحسین اور علامہ صاحب مرحوم کو خراج عقیدت نہ پیش کیا ہو۔

خط وکتابت اور ٹیلی فون کا سلسلہ زوروں پر ہوتا اور کبھی سست بھی ہو جاتا۔ مگر یادوں کی لڑی ٹوٹنے نہ پائی۔

آزاد اقبال اپنے کام کے سلسلے میں سعودی عرب چلے گئے اور آج کل جدہ میں مقیم ہیں۔ ۱۷ فروری ۱۹۹۷ء لندن کی ایک بھیگی ہوئی اور سرد دوپہر کو میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ بیگم پاس بیٹھی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بیگم نے فون اٹھایا اور جب میں نے ان کی زبان سے یہ سنا آزاد بیٹا کیسے ہو تو میں بھی اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا کہ ارض مقدس حجاز کی خوش گوار ہوا میرے کمرے میں داخل ہوئی اور لندن کی تکلیف دہ سرد دوپہر اپنا بستر بوریہ لپیٹے کھڑکی کی راہ سے نو دو گیارہ ہو گئی۔

کئی ایک پرانی باتوں کا ذکر ہوتا رہا اور آخر میں آزاد نے یہ بتلایا کہ امی جان ابا جان کے بارے میں ایک کتاب شائع کروا رہی ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ میں بھی دو چار جملے لکھوں۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ امی جان بھی جدہ آئی ہوئی ہیں تو میں سمجھ گیا کہ اس فرمائش کے پس پردہ باجی رشیدہ کا دست شفقت ہے اور انہوں نے مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھا۔

چشم ما روشن و دل ما شاد۔ میرا دل بھر آیا اور یہ چند جملے لکھوائے گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

میرے طاق دل پر یادوں کے خوشنما پھولوں کا گلدستہ ایک نازک سے گلدان میں رکھا ہوا ہے۔ جس کے گرد لمحات کی پریاں دن رات رقصاں رہتی ہیں۔ تاکہ وقت کے قدموں کی گرد پھولوں کی پتیوں پر نہ جمنے پائے۔

کہنے کو تو اور بہت کچھ ہے مگر جب تک زندگی باقی ہے۔ آفتاب صاحب کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی اور اللہ کرے کہ ان کے گھرانے سے ہمارے تعلقات استوار رہیں۔ فی الحال چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

سامنے ہے عہد ماضی کی کتاب
یاد تیری آرہی ہے بے حساب
خوش طبیعت ، خوش بیاں خوش پوش تھا
ماند تیرے سامنے تھا مہتاب
حسن صورت ، حسن سیرت ، حسن خلق
تیرے اوصاف حمیدہ لاجواب
جان محفل تھا تو روح انجمن
تو نہیں تو چپ ہیں اب چنگ ورباب
قدر گوہر جانتا ہے جوہری
بے خبر ہے اپنی خوشبو سے گلاب
بات شمسی مختصر ہے اور سچ
آفتاب آمد دلیل آفتاب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہمہ اوصاف ہستی

آفتاب اقبال سے ہمارا رشتہ دوستی شیزان ہوٹل کے حوالے سے پروان چڑھا۔ میرے میاں عبوشی مرحوم فلسطینی نژاد تھے اور ان کی دوستی کوئی تیس سال قبل شروع ہوئی۔ میاں کے حوالے سے میں بھی ادبی گفتگو اور لطائف میں شامل محفل ہونے لگی۔ علامہ اقبال کے اشعار انہیں ازبر تھے۔ اپنی گفتگو میں نگینوں کی طرح اشعار جڑتے تھے۔ اپنے وسیع مطالعے کے تناظر میں ہر موضوع پر بات کرنے پر قادر تھے۔ اشعار کی تشریح میں ان کا پیرایہ بڑا پیارا اور دلکش ہوتا تھا۔

انہیں سیر و تفریح کا شوق تھا۔ جب کبھی ان کا لندن آنا ہوتا۔ میں انہیں اپنے گھر ضرور مدعو کرتی تھی۔ ان کی محفل میں بیٹھنے میں معلومات کا خزینہ ہاتھ لگتا تھا۔ آخر کالجوں میں اردو ادب ،انگریزی اور فلسفہ کے پروفیسر کی شان ہم ایسوں کے لئے قابل رشک تھی۔ ان کے انگریزی لب و لہجہ پر لندن کے دس سالہ قیام کی چھاپ تھی۔ لباس کی صفائی ،پسند کا اونچا معیار اور عمدہ سوٹ زیب تن ،ان کی شناخت تھی۔ بچوں کو بھی صفائی اور ستھرائی کا درس دیتے تھے۔ اپنی اہلیہ کو بے حد چاہتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے لندن میں رہنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لیکن صرف اپنی اہلیہ محترمہ کے انکار کی وجہ سے وہ لندن کے باسی نہ ہو سکے۔ وہ کراچی کی نسبت لندن کے گلی کوچوں سے زیادہ باخبر تھے۔ لندن کے لوگوں کے اخلاق ،اطوار اور بود و باش کے مداح تھے۔

میں نے عموماً" انہیں قیمتی سوٹ میں ملبوس ،جیب میں سونے کا سگریٹ کیس ، کلائی پر قیمتی گھڑی اور انگوٹھی پہنے دیکھا ہے۔ ان کے لباس سے ان کی نفاست طبع کا اندازہ ،بخوبی لگ سکتا تھا۔ وہ انتہائی مہذب انسان تھے۔ ہمدردی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وعدے کے پابند تھے اور ہاتھ کے سخی تھے۔ پابندی اوقات کے

عامل تھے۔

ادیبوں اور مشاعروں کو عموماً" دیکھا گیا ہے کہ وہ اگر لڑکے کی نعمت سے محروم ہوں تو لڑکیوں پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور اگر لڑکی کی نعمت سے محروم ہوں تو انہیں لڑکیوں اور عورتوں سے محبت ہو گی۔ وہ اپنے دوستوں کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے۔ ان کی پہلوٹھی بیٹی صرف آٹھ دن زندہ رہ کر اپنے والدین کی آنکھوں میں شبنم بصورت اشک چھوڑ گئی۔ فیض احمد فیض نرینہ اولاد سے محروم تھے اور اپنے ڈرائیور غفور کو اچھے سے اچھے لباس میں دیکھتے تھے۔ بعض اوقات لوگ ڈرائیور کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر انہیں فیض صاحب کا فرزند سمجھتے تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کی تعلیم پر بے دریغ خرچہ کیا اور آج ان کی اولاد کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ عظیم دادا کی سچی نشانیاں ہیں۔

تقریباً" سبھی اخلاق حمیدہ کی چھاپ ان کی شخصیت میں نمایاں تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اخلاق اور انسانیت کو اس انداز میں اپنایا کہ ان کے حلقہ احباب میں مسلمان، عیسائی، اور سکھ مذہب کے لوگ شامل تھے۔ ایک مرتبہ کسی کو اپنے حلقہ دوستی میں لائے تو مرتے دم تک اسے نبھایا۔ ان کے نقش قدم پر ان کی اہلیہ محترمہ چل رہی ہیں۔ اپنے میاں کے آنکھیں موندھ لینے کے بعد وہ ان کے احباب کے اہل خانہ سے سابقہ رشتوں کو استوار رکھے ہوئے ہیں۔ آفتاب صاحب کی رفاقت سے ان کی اہلیہ محترمہ میں ان کے بہت سے اوصاف کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ دل کی صاف ہیں، سخی ہیں، ہمدرد ہیں اور خدمت خلق کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں اور ان کی ذات سے غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی خیر خواہی اور مالی امداد کا سامان وابستہ ہے۔

آفتاب صاحب کیا رخصت ہوئے، ایک ہنس مکھ، مہذب اور باکمال شخص اپنی

زندگی کے دن اپنے والد محترم علامہ اقبال کے تصور کے مطابق گزار کر اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

ابھی کل کی بات ہے (اٹھارہ سال پہلے) کہ آفتاب اقبال صاحب اپنے فرزند خورد ڈاکٹر نوید اقبال کے ہمراہ لندن وارد ہوئے۔ وہ دراصل چیک اپ کے لئے تشریف لائے تھے اور سفر کی وجہ سے ان پر بے ہوشی طاری ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے سفر کی تھکاوٹ کا ردعمل قرار دیا۔ پھر بھی احتیاطا" انہیں ایک پرائیویٹ کلینک میں داخل کروادیا گیا۔ ان کی عیادت کے لئے ہسپتال جاتی رہی اور وہ ہشاش بشاش دکھائی نہ دیتے تھے۔ ان کے چہرے پر وہی بشاشت اور مسکراہٹ تھی اور اپنے معمول کے مطابق وہ باتوں میں مصروف تھے۔ میں ان کی وفات سے ایک روز پہلے بھی ان کے ہسپتال موجود تھی اور دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے آگئی اور اتنے میں کراچی میں ان کے اہل خانہ بھی لندن جانے کی تیاریوں میں لگے تھے کہ دوسرے روز ڈاکٹر نوید کلینک میں ان سے مل کر اپنے عزیزوں کے گھر پہنچے تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلیفون کے ذریعہ ہسپتال سے ان کی فوتیدگی کی اطلاع دی گئی۔ ڈاکٹر نوید اور میں ایک روز قبل ہی انہیں ہشاش بشاش چھوڑ کر آئے تھے۔ اور دوسرے روز بغیر کسی نزع کا عالم طاری ہوئے وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ ہر ایک کو اپنے خدا کے حضور پیش ہونا ہے۔ صرف اپنی باری کے بغیر اس حادثے سے دوچار ہونا ناممکن ہے اور اپنی باری کا کسی فرد کو علم نہیں۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے

مسز عبوشی ممتاز۔ لندن

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مکرمہ و محترمہ ہمشیرہ صاحبہ زاد عنا تیکم

السلام علیکم ور حمتہ اللہ

اللہ کریم آپ کو سلامت باکرامت رکھے اور دین ودنیا میں عزت و عظمت عطا فرمائے۔ میری صحت ہنوز درست نہیں۔ عارضہ قلب نے صاحب فراش کرر کھا ہے۔ دوائیاں کھارہا ہوں۔ لیکن تاحال صحت خاطر خواہ بحال نہیں ہو سکی۔ آپ دعا فرمائیں کہ شافی مطلق مجھے عوارض سے نجات دے۔

میں طالب علمی کے زمانے میں محترم پروفیسر آفتاب اقبال مرحوم کا شاگرد رہا اور میرے دل میں ان کا بے حد احترام تھا۔ کالج یونین کے وہ صدر تھے اور میں اسلامیہ کالج (لاہور) کے (انگلش۔ اردو) میگزین کا چیف ایڈیٹر تھا۔ مرحوم سے میرے تعلقات ہمیشہ خواشگوار رہے۔ ان دنوں وہ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے قریب بریگانزا ہوٹل میں رہتے تھے اور اکثر اپنے مقبول شاگردوں کو بعض اوقات ہوٹل میں بلا لیتے تھے۔ جہاں مختلف امور پر دل کھول کر بات چیت ہوتی تھی۔ وہ ایک دلچسپ اور شگفتہ شخصیت کے مالک تھے اور بہت عمدہ اور دلچسپ تقریر کرتے تھے۔ تقریر کے دوران ماحول پر چھا جاتے تھے۔ چیدہ طلباء کو انگلش آنرز کی کلاسیں بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔ انہوں نے انگلستان (لندن) سے بار۔ ایٹ۔ لاء کی ڈگری حاصل کرر کھی تھی اور موقع و محل کے مطابق تقریر پر چھا جاتے تھے۔ انہیں تصوف سے بھی دلچسپی اور شغف تھا اور وہ ایک دلنواز شخصیت کے مالک تھے۔

پروفیسر آفتاب اقبال کراچی میں ایک ہر دلعزیز شخصیت تھے اور وقتاً فوقتاً اہم مواقع پر ان کی اہم ادبی اور سیاسی تقریریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ سابق صدر پاکستان محمد ایوب خان کے ہاں بھی ان کی آمد رفت رہتی تھی۔ وہ فن تقریر کے ماہر تھے۔ ان

کے بے وقت انتقال سے قوم کو نقصان پہنچا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

بشیر ساجد

330 آر، بلاک

ماڈل ٹاؤن ایکس ٹنشن

لاہور

آفتاب اقبال کے شاگرد رشید جناب بشیر صاحب کا تازہ خط کا عکس۔ اس میں سنہ 1939ء کے زمانہ شاگردی کی یادوں کو تازہ کیا گیا

علامہ کے اشعار موت کے سلسلہ میں

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں

آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں

ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

ہائی کورٹ

تعزیتی خطوط

لاہور

مورخہ ۲۱ اگست ۷۹ء

محترمہ بھابھی جان

سلام مسنون

آپ کے ساتھ ایبٹ آباد سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ میں ناصرہ اور بچے دس پندرہ دنوں کے لئے چھٹیوں میں نتھیا گلی اور ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے۔ کل شام واپس لاہور پہنچے۔ بھائی آفتاب کی رحلت کی خبر ایبٹ آباد میں اخبار میں پڑھی اور آپ کو فون کیا۔ بعد میں لاہور سے فون آیا۔ منیرہ آج کل لندن میں ہے اور بھائی صاحب کی وفات کے وقت وہیں تھی۔ اس کے گھر میں ہماری ایک عزیز مسرت بیگم رہتی ہیں جنہوں نے اخبار میں خبر پڑھ کر کراچی بھائی اعجاز کو فون کیا اور پھر ہمیں اطلاع دی کہ میت لندن سے لائی گئی اور اڑھائی بجے انہیں کراچی میں سپردخاک کردیا گیا۔

بھائی صاحب کی رحلت کا پڑھ کر بہت رنج ہوا۔ عجیب بات ہے کہ ایبٹ آباد میں بیٹھا میں چند دنوں سے سوچ رہا تھا کہ عرصہ ہوگیا ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بلکہ ناصرہ اور میرے بچے کہہ رہے تھے کہ میں نے انہیں کبھی بھائی آفتاب سے نہیں ملوایا اور میں نے انہیں کہا کہ اب کی مرتبہ اگر ہم لوگ کراچی گئے تو ناصرہ اور بچوں کو ان سے ملواؤں گا۔ لیکن خداوند تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

آج صبح ہائی کورٹ میں ڈاک ملی جو میرے انتظار میں وہیں پڑی تھی۔ بہت سے لوگوں کے خط تھے جنہوں نے بھائی صاحب کی تعزیت کے سلسلے میں تحریر کررکھا تھا۔ آج صبح انہیں خطوط کے جواب لکھتا رہا۔

آج شام میں منیرہ کے گھر گیا تو وہاں اس کے شوہر کے چھوٹے بھائی بھی ملے

جو پرسوں لندن سے واپس آئے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بھائی صاحب' آپ اور شاید نوید ان کے کسی دوست حبیب کے فلیٹ کے قریب مقیم تھے اور جب بھائی صاحب کو قلب کا عارضہ ہوا تو حبیب بھی ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ حبیب کو میں بھی جانتا ہوں اور منیرہ و صلاح الدین بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ لندن میں ان سے ملتا تھا لیکن بدقسمتی سے اس نے بھائی صاحب کے متعلق منیرہ یا صلاح الدین کو خبر نہ دی ورنہ وہ ضرور بھائی صاحب کے پاس پہنچتے۔

ان حالات میں انسان کی پیش نہیں چلتی۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے۔ لڑکوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اب تو لڑکے بھی بڑے بڑے ہو گئے ہوں گے۔

میرا کراچی آنے کا اتفاق کم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ایک دو ماہ میں کراچی آیا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور بچوں سے بھی ملوں گا۔ میری طرف سے انہیں دعا اور پیار دیں۔ خداوند تعالیٰ انہیں زندگی میں ہمیشہ کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔

ناصرہ اور بچے آپ کو اور آزاد' وقار اور نوید کو پیار اور سلام بھجواتے ہیں۔

خیراندیش

جاوید اقبال

۱۶ اگست ۱۹۷۹ء

اقبال اکیڈمی پاکستان

محترمہ بیگم صاحبہ

تسلیم و نیاز!

محترم ڈاکٹر آفتاب اقبال صاحب کی اچانک رحلت کی خبر سے بے حد رنج ہوا۔ خداوند تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔اکیڈمی مین تعزیتی اجلاس کی رپورٹ کی ایک نقل اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔

نیاز مند

معزاللہ

ڈاکٹر محمد معزالدین

ڈائریکٹر

۲۳ اگست ۱۱ بجے شب

محترم و معظم جناب آزاد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لاء

فرزند ارجمند فراست ماب آفتاب اقبال (مرحوم) تسلیمات۔ اخبارات میں جناب آفتاب اقبال فرزند دانشمند علامہ ڈاکٹر علامہ اقبال کی رحلت کی خبر پڑھ کر سخت صدمہ ہوا! مرحوم کی شہرت تو بہت سنی تھی۔ مگر زیارت کا اتفاق نہ ہوا۔

کیا نابغہ شخصیت دنیا سے اٹھ گئی۔ اس ضمن میں راقم مع اہل خانہ آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ہو سکے تو جناب آفتاب اقبال کی بیو گرافی ضرور شائع کیجئے۔ حضرت علامہ سے ان کے فکری اختلاف کی Out Line مکمل معلوم نہ ہو سکی تاہم سنا ہے کہ کچھ مضامین مرحوم کے قلم سے ضرور نکلے۔ کچھ روشنی ڈالیئے۔

میرے پھوپھی زاد بھائی کراچی میں جناب رئیس امروہوی سید محمد تقی (سابق ایڈیٹر جنگ) اور جون ایلیا ایڈیٹر عالمی ڈائجسٹ وہاں موجود ہیں غالباً" آپ کی ملاقات ان سے ہوئی ہو۔ یہ ہمہ خانہ آفتاب است! آپ سے پہلی مراست ہے لہذا کیا لکھوں اور کیا بتاؤں کہ کس باغ کی شاخ پژمردہ ہوں! اگر مناسب سمجھیں تو مراسلت جاری رکھئے اور ایک تصویر اپنی اور جناب آفتاب اقبال مرحوم کی ارسال فرمادیں تاکہ البم کی زینت بنے اور ان کے حالات معلوم ہونے سے مضمون کے ساتھ شائع ہو سکے۔

میری طرف سے اپنے بھائی نوید اقبال صاحب کی خدمت میں اظہار تعزیت فرما دیجئے۔

مخلص

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی

محترمہ، سلام مسنون

آج کے روزنامہ جنگ پر آفتاب اقبال صاحب کے حادثہ رحلت کی خبر پڑھ کر صدمہ ہوا۔ خداوند کریم ان کی مغفرت فرمائے اور دامن رحمت کے سایہ پر ڈھانپ لے۔ میری طرف سے تعزیت قبول فرمایئے اور اپنے تینوں صاحبزادگان تک بھی پہنچا دیجئے۔ آپ جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کا حوصلہ اور اس پر جزائے جزیل عطا فرمائے۔

والسلام

نیازکیش خسروی

(کنور محمد اعظم علی خاں)

اصلی کریانہ اسٹور

بی بی پاکدامن۔ ایمپریس مارکیٹ لاہور

۱۳۔۸۔۷۹

عزیزہ رشیدہ سلمہا

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی عزیزہ وحیدہ کا دستی رقعہ موصول ہوا۔ جس میں آفتاب بھیا کی وفات کا ذکر تھا۔ کسی کا بھی بساط عالم سے اٹھنا بہر صورت اضطراب انگیز ہوتا ہے اور اگر یہ معاملہ کسی عزیز سے متعلق ہو تو غم اندوہ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی بیوگی کی ابتداء ہوچکی ہے اور ایک بھائی کو اپنی بہن کی بیوگی کا جو شدید احساس ہوتا ہے اسے ضبط تحریر میں لانا بڑا ہی مشکل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کا جہان سکوں زیر و زبر ہوچکا ہے اوراب آپ کو زندگی کے راستے پر قدم بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ اٹھانا چاہیے۔

آپ کے بچے ماشاء اللہ جوان اور سیانے ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ انہیں خوش وخرم رکھے۔ اور آپ کی اطاعت گزاری کی توفیق مرحمت فرمائے۔ خصوصاً عزیزی آزاد اقبال کو اب بڑی ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ مولا کریم اس ضمن میں اسے ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

آخر میں رب العزت کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ آپ کو صبر وضبط کی توفیق مرحمت فرماکر مرحوم کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین۔

میں خود کراچی آتا مگر نامساعد حالات نے اپنے مضبوط شکنجے میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ ہلنا بھی قریب قریب ناممکن ہوچکا ہے۔ اور کیا لکھوں بچوں سے بھی مناسب تعزیت کردیں۔

شریک غم بھائی

حضرت خلیفہ محمد امجد

۱۳-۸-۷۹

میری پیاری بہن رشیدہ

السلام علیکم،

آج ہم ایک بڑی عظیم ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ خدا تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آپ کی خدمت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحت کامل دے۔ آپ کے غم دور کرے آمین۔

بھائی آفتاب صاحب بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ سچے ہمدرد، برائیوں سے پاک پر خلوص عظیم شخصیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کتنا بڑا مہینہ رمضان شریف کا پایا۔ بیسویں رات رمضان شریف۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے سب دروازے انہیں کھلے ملے۔ بغیر حساب کتاب داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی ضرور کوئی بات پسند ہو گی۔ لندن کے عاشق تھے۔ سچے عاشق کی طرح یہیں آخری سانسیں لیں۔ وہ جس لندن کے عاشق تھے۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ آج کتنی چاہنے والی ہستی سے محروم ہو گیا۔ آج آزاد پاشے نوید یتیم ہو گئے۔ باپ کا سایہ سر سے ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ خدا تعالیٰ ان کو صحت دے۔ اپنی رحمت کا سایہ ان پر ڈالے۔ دلی دعا ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو ہمت دے۔ آپ کے فکر و غم دور کرے۔ آمین۔

آپ نے جو ٹیلیفون نمبر مجھے دیا تھا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن نوید سے نمبر نہ مل سکا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی جواب دیا۔ آج صبح ایسے ہی دل میں آیا اوپر سے آکر نیچے فون کیا۔ انہوں نے پھر کہا یہاں سے چلے گئے تو میں نے ان کا فون نمبر مانگا تو مجھے دیا اسی وقت میں نے ٹیلیفون کا نمبر ملایا تو مجھے جواب ایسا ملا جس کا خواب میں بھی گمان نہ تھا

اس کے بعد نوید سے ملایا تو بات ہوئی۔ واقعی وہ بیچارے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ بہت روئی اور آپ کی یاد بہت ستائی۔ اگر آپ ہوتیں کچھ آپ کی تسلی کا سبب بنتی۔ پھر وضو کر کے پڑھنے بیٹھ گئی۔ جتنا ان پڑا پڑھا۔ ہر نماز کے بعد ان کی بخشش کے لئے دعا کرتی ہوں۔ اسی وقت میں نے جنگ اخبار والوں کو بتایا۔ وہ اپنے عزیز ہی ہیں۔ انہوں نے نوید سے بات کرنا چاہی تو وہ گھر پر نہ تھا۔ انتظام میں لگا ہوا تھا۔ صبح کے جنگ میں خبر آجائے گی۔ صبح وہ لندن سے روانہ ہو جائیں گے۔ اللہ آپ کا نگہبان ہو۔ میری طرف سے آزاد بیٹے کو بہت بہت تسلی دیں۔ پاشا کو بھی نوید تو ساتھ آ رہا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ ایک دن سب کو کوچ کر جانا ہے۔ صبح ہم ایسٹ لندن پہنچیں گے۔ آخری بار ان کی میت کو دیکھ لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب بہت رنجیدہ ہوئے۔ ہمیں اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ہماری ان سے آخری بار ملاقات نہ ہو سکی۔ شاید اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی منظور تھا۔ اب دیکھیں کب ملاقات ہوتی ہے۔ زندگی ایک میلہ ہے۔ جس میں باہم ملاقات ہوتی ہے اور پھر جدائی کی راہیں درپیش ہوتی ہیں۔ پیاری بہن بھاوج کا رشتہ ہمیشہ قائم رکھنا۔ آپ اپنی صحت پر توجہ دیجئے گا۔ آزاد` نوید اور پاشا کو بہت بہت دعا و پیار۔

آپ کی خیر اندیش

بہن مریم

آفتاب اقبال بنام اہلیہ

اہلیہ کے نام خط

معزز قارئین، یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ یہ خطوط آفتاب اقبال صاحب نے خالصتاً اپنی اہلیہ کے نام تحریر فرمائے ہیں اور ان کی اشاعت کا کبھی ہمیں خیال بھی نہ گزرا تھا لیکن چونکہ آفتاب اقبال صاحب کی زندگی کی جھلکیاں دی جارہی ہیں لہٰذا ان کے اپنی اہلیہ کے نام ذاتی خطوط کو بھی شامل کررہی ہوں اور میرے پیش نظر یہ ہے کہ ان خطوط میں انہیں بچوں کی تعلیم، آئندہ زندگی میں سہولتوں کا انتظام اور اپنی کاروباری زندگی کا خیال ہمیشہ ستاتا رہتا تھا۔

اور اندرون ملک کچھ اہل قلم حضرات نے ان کے والد محترم سے معمولی اختلاف کو ایک مستقل نزاع کا روپ دے کر بے سروپا باتیں لکھ کر اپنے قلم کو ہی آلودہ نہیں کیا بلکہ ایک نامور شخص کے خانگیمعاملات میں ٹنگ اڑانے کو اپنی تحقیق کا محور قرار دے کر اس ٹوہ میں رہے کہ کس نے کس موقع پر کیا فرمایا ہے۔

ایران کے ایک دورے کا پروگرام ان کے بہنوئی شمشاد احمد صاحب ے حال سیکرٹری خارجہ) نے بنایا تھا وہ 1968ء میں ایران میں قونصلر متعین ہوکر قیام پزیر تھے اور ان کے مساعی سے آفتاب صاحب نے ایران میں تہران یونیورسٹی میں اقبال اور ایران کے عنوان سے ایک بڑی شاندار تقریر کی تھی جس کی کاپی مجھے دستیاب نہ ہوسکی اور افغانستان میں وہبطور شاہر مہمان ٹھہرے تھے اور حکمران طبقے کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی تھی اور پھر وہ اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے افغانستان سے سیدھے یورپ روانہ ہوگئے۔

جرمنی، سوئزرلینڈ اور لندن سے ان کے خطوط سے ان کی گھریلو

زندگی اور کاروباری زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

ان کے سیدھے ہاتھ میں تکلیف تھی اور وہ تھوڑا سا لکھنے کا کام انجام دیتے تھے تو ہاتھ میں تکلیف محسوس کرتے تھے اور بعض اوقات اپنی تکلیف کی وجہ سے اپنی مرضی کے مطابق کھل کر مفصل خط نہ لکھ پاتے تھے اور فوراً آخری جملوں میں تحریر کردیتے تھے کہ اب ہاتھ میں تکلیف کی وجہ سے خط ختم کرتا ہوں۔ 1968ء سے 1971ء تک کے خطوط کے بعد ہمیں تبدیلی نظر آتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ میں اتنی تکلیف محسوس کرتے تھے ان کے اردو خطوط کے جوابات ان کی زبانی میری تحریر میں لکھے ہوئے تھے اور میں خود کو ان کا پرائیوٹ سیکرٹری سمجھتی تھی اور ان کے دوست جناب ہمایوں اختر صاحب ایک منجھے ہوئے انگریزی صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب تاجر اور مستند حکیم تھے۔ آفتاب اقبال کے انگریزی خطوط کے سلسلے میں سیکرٹری تھے۔ انگریزی خطوط عموماً ٹائپ ہوتے تھے۔

آفتاب صاحب نے مالیر کوٹلہ میں اقبال میموریل ٹرسٹ کے سیکرٹری محمد کفایت اللہ سیکرٹری تعلیم شمس الحق اور بی اے ڈار (اقبال اکیڈمی کراچی) کو انگریزی میں خطوط لکھے ہیں جبکہ کفایت اللہ صاحب کے خط کا زیادہ حصہ اردو میں لکھوایا ،۱۹۶۹ء میں علامہ اقبال کے خادم علی بخش کا انتقال ہوا تو اس کے بھتیجے اقبال کے نام تعزیتی خط بھی اردو میں لکھوایا۔ ان خطوط سے ان کی زندگی کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے تاریخی حقائق سے پردہ اٹھتا ہے جن کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے تھے۔

حکیم احمد شجاع کا ۱۹۶۷ء کا خط بڑا تاریخی خط ہے۔ اس خط میں آفتاب اقبال صاحب نے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے دو مضامین کے اچھے شستہ انداز میں جواب دینے کے لئے علامہ اقبال کے ایک نوجوان عقیدت مند کا انتخاب کیا۔ معلوم نہ ہو سکا

کہ واقعی حکیم احمد شجاع صاحب نے مختلف اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ ویسے اسی سال مولانا حامد جلالی صاحب نے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے مضامین کا سخت جواب ایک کتاب علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی لکھ کر دیا۔

مجھے امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد آفتاب صاحب کے خطوط میں بہت سی باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ مثلاً شاعر کے اقبال نمبر ۱۹۸۸ء میں اکبر علی خان عرشی زادہ نے اپنے مضمون میں انکشاف کیا ہے کہ آفتاب صاحب نے انہیں بتایا تھا کہ انہوں نے اپنا نام آفتاب احمد سے آفتاب اقبال ۱۹۲۲ء میں تبدیل کیا حالانکہ ۱۹۷۸ء میں بھارت سے آئے ہوئے کفایت اللہ صاحب کے خط کے جواب میں انہوں نے کفایت اللہ صاحب کو بھی ہمایوں اختر صاحب کے دستخط سے یہی جواب لکھوایا ہے۔

کفایت اللہ صاحب کے خط کے جواب میں آفتاب صاحب واضح کرتے ہیں کہ ان کے نانا خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد صاحب ۱۹۱۲ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو پھر ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۸ء تک مالیر کوٹلہ میں بطور میڈیکل آفیسر ریاست میں نواب احمد علی صاحب کے ذاتی معالج کی حیثیت سے رہے۔

کفایت اللہ صاحب کی طرف سے مالیر کوٹلہ میں علامہ کے خلاف دائر مقدمہ کی زوردار الفاظ میں تردید فرمائی ہے۔ نجانے لوگ بے پر کی اڑانے میں کیوں دلچسپی لیتے ہیں۔ حافظ صاحب سے علامہ اقبال کے بڑے اچھے مراسم تھے اور بعض محقق اور نقاد اپنے فارغ لمحات میں حافظ صاحب اور علامہ اقبال کے مابین کشیدگی کے قصے لے بیٹھتے ہیں۔

آفتاب اقبال، حافظ ڈاکٹر عطا محمد صاحب کی بڑی بیٹی کریم بی بی صاحبہ کے فرزند تھے اور اپنے ننھیال میں سب سے بڑے نواسے تھے اور شاعر کے اقبال نمبر میں ایسے خطوط چھاپے گئے ہیں جن کی روشنی میں نانا اور نواسہ کے مابین ایک رسہ کشی دکھائی دیتی ہے۔ قریبی عزیز خط میں بعض اوقات، غصے کے عالم میں نہ جانے کیا کچھ لکھ

دیتے ہیں۔ جب حقیقت کھلتی ہے تو ان کے تعلقات میں معمول کا برتاؤ شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر آفتاب اقبال اور علامہ اقبال کے مابین کوئی کشیدگی تھی تو اسے اتنا طول دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا موجودہ دور میں بھی ایک شخص کے اپنے والد سے تعلقات کشیدہ نہیں ہوتے اور پھر وہ اپنے خونی رشتے کا پاس کرتے ہوئے ہنسی خوشی رہتے ہیں۔

علامہ اقبال سر اکبر حیدری کو اپنے مکتوب محررہ ۲ مئی ۱۹۳۱ء میں اپنے بیٹے کی کوتاہیاں گنوانے کے بعد آخر میں فرمایا انگریزی کی عبارت کا حوالہ تھا پتہ نہیں اسے کیوں گول کر دیا گیا۔ ایسی کیا پدرانہ شفقت کا بہتر مظاہرہ کوئی فرد کر سکتا ہے اور اپنی اولاد سے نالاں باپ اس کی بھلائی کے لئے درخواست کرے اور اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی سے کام لے۔

اس ٹکڑے سے علامہ اقبال کی محبت کا اندازہ کیجئے۔ اگر آپ خطوط کو ان کے صحیح سیاق و سباق کی روشنی میں انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو اقبال ایسا حکیم اور ہمدرد شخص اپنی اولاد سے مستقل بیزار رہنے کا تصور نہیں کر سکتا۔

۲۸-۶-۶۸

پیاری رشیدہ

۲۴ تاریخ کو میں استنبول پہنچا تھا اور تیس تاریخ یعنی اتوار کے بعد یہاں سے میونخ روانہ ہو رہا ہوں۔ یہاں بھی ایک دو پروفیسروں سے ملاقات ہوئی ہے۔ کل پروفیسر تالان علی استاد نے ابا جان کی فارسی کتابوں کو ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔ مجھے کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ بہت دلچسپ گفتگو رہی مگر INTERPERTER کے ساتھ انھوں نے کچھ کتابیں دی ہیں جو بذریعہ پوسٹ روانہ کر دوں گا۔ انقرہ میں مسٹر اور مسز کوپرنے میری بڑی خاطر تواضع کی اور ایک پارٹی بھی دی جس میں بہت سے آدمی شامل تھے۔

استنبول آنے کے بعد میری طبعیت پیٹ کی گڑبڑ کی وجہ سے خراب رہی مگر اب ٹھیک ہوں اور آج ایک Excursion کے لئے ہوٹل پارٹی کے ساتھ جا رہا ہوں امید ہے کہ پارسیوں نے باقی ۷۴ روپیہ کا چیک دیدیا ہوگا۔ تین جولائی کو میں زیورک پہنچ رہا ہوں۔ امید ہے تمہارا خط وہاں ملے گا۔

امید ہے دفتر کا کام سب ٹھیک ہو رہا ہوگا۔ اب چیک کے متعلق لکھو کہ وہ کس کی طرف سے تھا اور کتنی رقم کا۔ امید ہے کہ منشی نے یہ رقم اکاؤنٹ کی فائل میں بھیجنے والے کے نام کے سامنے درج کر دی ہوگی۔ گو کہ مفصل حالات سے آگاہ کرو۔ سپرو کا نتیجہ نکل چکا ہے۔ امید ہے وہ پاس ہو گیا ہوگا۔ بسکٹ کے امتحان ابھی تک ہو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ستمبر میں نکلے گا۔ آج کل تمہارے پاس کوٹھی میں کون رہتا ہے۔ امید ہے وحیدہ آنے والی ہوگی۔ امید ہے کہ دہران سے وحیدہ کو اخبار کی کٹنگ جس میں میری تصویر چھپی تھی پہنچ گئی ہوگی۔

میں نے اس شخص کو کہہ دیا تھا کہ وہ براہ راست وحیدہ کو بھیج دے۔ کیا تم نے ایک ہزار حسن الاعظمی کو دیدیا تھا۔ یہ چیک مسٹر اسلام کو پوچھ کر دینا۔ وہ اتحاد اسلامی عربی

پاس بک Pass Book دیکھے گا۔ اگر انہوں نے ایک ہزار اکٹھا کر کے بینک میں جمع کرادیا ہے تو تم یہ رقم بطور کراس چیک تنظیم اتحاد اسلامی کے نام دے دینا۔ فلیٹ کی فروخت کے متعلق سب کچھ لکھو۔ چھوٹا فلیٹ اگر بک سکتا ہے تو لکھو میں Power of Autorney انگلینڈ سے بھجوادوں گا۔ یہاں موسم بہت اچھا ہے۔ شام کو سردی ہو جاتی ہے۔ باقی آئندہ خط میں۔

تمہارا آفتاب

شاہ افغانستان کے چچا شاہ ولی خان . کی تصویر جس کا ذکر آفتاب اقبال صاحب نے اپنے افغانستان کے خط میں فرمایا ہے

Kabul Hotel

۱۴-۵-۷۱

پیاری رشیدہ

آج ہز ہائنس مارشل شاہ ولی خان نے اپنی کار بھیج کر اپنے گھر بلایا اور دوپہر کا کھانا وہیں کھایا۔ بڑی طویل گفتگو ہوئی۔ تقریباً دو گھنٹے یا تین گھنٹے میں اس کے عالیشان مکان میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کا مکان شاہ افغانستان کے پاس ہی ہے۔ جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ بادشاہ کا چچا ہے۔ شاہ افغانستان کی طرف سے شاہ ولی نے مجھے پیغام دیا کہ میں جشن افغانستان مین اگلے ستمبر کابل آؤں۔ باقاعدہ دعوت نامہ کراچی میں وصول ہوگا۔ میری شاہ سے ملاقات بھی ہوئی مگر آج کل Cabinet کے اندرونی معاملات کی وجہ سے شاہ ولی نے کہا کہ میں یورپ سے واپسی پر پھر کابل آؤں اور اس وقت ظاہر شاہ سے ملاقات کروں۔ شاہ ولی نے پہلے تو مجھے ماتھے پر چوما۔ اس کے بعد کابل کی فتح کا پورا حال سنایا اور یہ بتایا کہ بچہ سقہ کو کس طرح سزا دی گئی۔ پاکستان کی سیاسیات پر طویل گفتگو ہوئی۔ اس نے اپنی لکھی ہوئی دو کتابیں اپنے دستخطوں کے ساتھ دی ہیں جو اپنے ساتھ لاؤں گا یا بذریعہ ڈاک بھیج دوں گا ۔ کابل تو بالکل ایک جدید شہر ہو گیا ہے۔ افغان لڑکیاں پتلونیں پہن کر بازاروں میں پھرتی ہیں اور امریکنوں کے ساتھ کلب میں ناچتی ہیں۔ اچھے اچھے ہوٹل اور ریستوران کھل گئے ہیں۔ کابل ہوٹل میں میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ پرسوں میں یہاں سے بیروت روانہ ہو رہا ہوں۔ باتیں تو لکھنے کی بہت ہیں مگر افسوس کہ ہاتھ نہیں چلتا۔

تمہارا آفتاب

Excelsior Hotel

۱۹ مئی ۱۷ء

پیاری رشیدہ

امید ہے میرا تار اور خط تمہیں مل گئے ہوں گے۔ میری طرف سے تمہیں یہ تیسرا خط ہے۔ میں کل بیروت پہنچ گیا تھا۔ یہ ہوٹل کافی اچھا ہے۔ میرا اردہ یہاں سے ہفتہ یعنی ۲۲ تاریخ کو یہاں سے میونخ چلے جانے کا ہے۔ صحت تو اچھی ہے مگر کوئی جان پہچان کا نہ ہونے سے طبعیت اداس رہتی ہے۔ بائیں پیر میں درد کی وجہ سے لنگڑا کر چل رہا ہوں۔ اس درد کا آغاز پہلے ہی سفر کے دن سے شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ کافی کاغذ پیر کے نیچے تھے اس اوپر کی طرف چمڑے کا دباؤ پڑنے سے درد ہونے لگا۔ یہ درد دن بدن بڑھتا ہی گیا اور باوجود اس بات کے کہ اب جوتا حال ہے۔ درد نہیں ہٹا بلکہ زیادہ ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خون کی رگ بوٹ کے اوپر کے حصے کے دباؤ سے کچل گئی ہے۔ خدا کرے یہ درد جلد دور ہو جائے ورنہ سفر میں بہت دقت ہو گی ۔لنچ کے بعد کافی آرام کرتا ہوں مگر باوجود اس کے تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں ۔ امید کرتا ہوں کہ شاید تمہاری طرف سے اس ہوٹل کے پتہ پر تمہارا گھر کے حالات کے متعلق تار مل جائے ورنہ میونخ Regina Hotel کے پتہ پر اور اس کے بعد زیورخ کے پتہ پر تو تمہارے یقیناً خط آنا شروع Express Inc Amreican ہو جائیں گے۔ میں ایک خط آزاد کو بھی لکھ رہا ہوں۔ بیروت تو بالکل ایک یورپین شہر کی طرح ہو گیا ہے۔ یہاں کے عرب مسلمان تو معلوم ہی نہیں ہوتے اور عورتیں تو یورپین عورتوں کو بھی مات کر گئی ہیں۔ آج امریکن بینک کے منیجر سے بھی ملاقات ہوئی اور کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد Lufthansa گیا اور ہفتے کی نیٹ بک کرائی۔ میرا دایاں پیر بالکل ٹھیک ہے۔ باقی آئندہ تمہارا آفتاب

مشاہیر کے خطوط بنام آفتاب اقبال

جناب سید حیدر امام ، مولوی فضل الحق اور حکیم احمد شجاع کے خطوط شامل ہیں

سید حیدر امام ، سر سید علی امام کے بھائی ہیں۔ قانون کی دنیا میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ آفتاب اقبال صاحب نے ملازمت کے سلسلے میں بڑے بڑے باوقار لوگوں سے رابطہ کیا اور زیادہ تر انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۴۲ء کا سال آفتاب اقبال کے لئے مشکلات لے کر آیا ، آپ اسلامیہ کالج لاہور سے فارغ ہونے کے بعد دہلی اپنے ایک سکھ دوست کے ہاں مقیم تھے۔ ملازمت کے لئے کوشاں رہے لیکن مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے مشکل وقت میں مولوی فضل الحق صاحب کا دم غنیمت تھا۔ وہ ایک مشفق بزرگ کی حیثیت سے ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ اور آخر کار ۱۹۴۳ء کا سال بڑا خوش قسمت ثابت ہوا ، وہ میرے رفیق حیات بنے اور اسی سال کلکتہ میں ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ پر ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

دو خط حکیم احمد شجاع کے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں حکیم موصوف نے آفتاب اقبال کو دو خط لکھے ستمبر ۶۷ کے خط میں مواد مانگا اور مضمون لکھنے کا مژدہ سنایا۔ ۱۱ نومبر ۶۷ء کو نقوش میں علامہ اقبال کی خودی پر مضمون لکھا۔ باپ بیٹے کے تعلقات سے حکیم احمد شجاع صاحب باخبر تھے۔ انہوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اس مسئلے پر قلم اٹھائیں گے اور لوگوں میں پھیلی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کریں گے لیکن افسوس ۶۷ء میں لکھا جانے والا مضمون بھی ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اور اصل حالات سے آگاہی نہ ہو سکی۔ اس مصلحت سے کوئی آگاہ نہیں۔ ۶۸ کے آغاز میں ہی وہ چل بسے۔ بہر کیف حکیم احمد شجاع کی صلاحیتوں کے علامہ مرحوم معترف تھے اور اقبال

کے ہم صفیر نامی کتاب میں علامہ سے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم احمد شجاع کے لئے علامہ کیسی بصیرت کا اظہار فرماتے تھے۔ یوں سمجھ لیجئے ایسے ہم راز سے دل کی باتیں کہتے ہوں گے اور حکیم احمد شجاع بھی خلوت کی باتوں سے پردہ اٹھانے کے متمنی تھے لیکن قدرت کو یہ شیوہ پسند نہ آیا اور ان کا اقدام بس موت کے اچانک حملے نے تہ وبالا کر دیا اور اپنے طور پر مفروضوں کے گھوڑے دوڑانے والوں کے رحم وکرم پر یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ اے کاش پروفیسر ایوب صابر کو علامہ اقبال کی صحبت میسر آئی ہوتی تو بصیرت کو پس پشت ڈال کر لایعنی باتوں سے گریز کرتے لیکن اپنے طور پر حقائق سے پردہ اٹھا رہی ہوں اور ہمیں علامہ اقبال سے کوئی عناد نہیں۔ ہمیں جاوید اقبال سے کوئی دشمنی نہیں۔ وہ تعزیت کے لئے تشریف لائے تھے لیکن میں اپنے عزیزوں سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھی۔ جاوید اقبال کا تعزیتی خط بڑا موثر ہے۔ لیکن ہمدردان اقبال دو بھائیوں کے مابین ایک فرضی محاذ کھولے بیٹھے ہیں۔ اے کاش لوگوں میں سچ بات کہنے کا حوصلہ ہوتا ،وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے ان کے منہ سے اور قلم سے حق بات نہیں نکلتی۔

رشیدہ بیگم

کوشک اچھرہ

فیروز پور روڈ- لاہور

۱۷ نومبر ۶۷ء

عزیزی سلمہ

بعد از دعا واضح ہو کہ آپ کے والد ،ماجد علیہ الرحمتہ پر میرا پہلا مضمون نقوش کی تازہ اشاعت میں شائع ہو گیا ہے- میں نے مالک رسالہ سے کہا ہے کہ اس رسالے کی ایک کاپی آپ کے نام بذریعہ وی پی پارسل بھیج دے- وہ آپ وصول کر لیں- اس کے علاوہ ایک علیحدہ کاپی جو محض اس مضمون پر مشتمل ہے- میں بھیج رہا ہوں تا کہ آپ کے ریکارڈ میں رہے- اس میں بہت مفید اور مستند معلومات ہیں- اس کے بعد دوسرے مضمون میں وہ تمام معلومات ہوں گی جن کا تعلق آپ سے اور آپ کے خاندان سے ہے ـکسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں- میں اس مضمون میں جس طرح موجودہ مضمون میں واقعات اور حالات بیان کئے ہیں- اصلی حالات بیان کروں گا جن کو پڑھنے سے ان تمام غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا جو لوگوں نے سنی سنائی باتوں کی بنا پر پھیلائیں ہیں- یہ سب مضمون سلسلہ وار تمام اخبارات میں بھی شائع ہو جائیں گے جن کی کاپیاں میں آپ کو بھجواتا رہوں گا- امید ہے آپ بفضلہ تعالیٰ مع اہل و عیال بخیریت ہوں گے-

نیاز مند

حکیم احمد شجاع

آفتاب اقبال کے چند عزیز

مولوی الف دین نفیس

سب عزیزوں میں ایک اعلیٰ شخصیت جناب مولوی الف دین صاحب کی تھی۔
مولوی صاحب کے ایک فرزند خواجہ احمد علامہ اقبال کے برادر اکبر شیخ عطا محمد کی نواسی (اکبری بیگم اور شیخ فضل الٰہی کی بیٹی) سے رشتہ ازدواج میں منسلک تھے اور ماشاء اللہ مولوی صاحب کے پوتے بڑے نامور ہیں اور اپنے دادا جان کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔
ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی مولوی صاحب کے کلام نفیس کو پیش کرتے ہوئے صفحہ ۱۲ پر رقم طراز ہیں:
مولوی الف دین نفیس ۱۸۵۸ء میں بمقام مغلا نوالی (تحصیل ضلع سیالکوٹ) متولد ہوئے ،ان کے جد امجد صاحب حال صوفی حضرت عبدالقادر کشمیر میں اپنے آبائی گاؤں چراٹ (چراٹ شریف) سے انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہجرت کر کے ناحیہ سیالکوٹ میں وارد ہوئے۔ صوفی صاحب کے دو بیٹے تھے ،ایک بیٹے خواجہ جمال دین وائیں نے لاہور کا رخ کیا اور دوسرے بیٹے خواجہ کمال الدین وائیں نے سیالکوٹ کے نواحی گاؤں مغلا نوالی میں ،جو نالہ ایک کے بائیں کنارے پر واقع ہے ۔ ایک اقامت اختیار کرلی۔ مولوی صاحب نے اپنی ایک پنجابی نظم میں جو سہ حرفی کی طرز پر نوجوانی کے زمانے کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہا ہے۔

یاد رکھیں تینوں دساں ہاں مغلاں والی اے تھاں مکان میرا
کنڈے ایک دے وسدا پنڈ چھوٹا ،تھانہ ضلع سیالکوٹ پچھان مرا

خواجہ کمال دین کے تین بیٹے تھے۔ فضل دین سب سے بڑا تھا۔ خواجہ فضل دین کے پانچ بیٹے ہوئے۔ محمد رمضان ، مولا بخش ، الف دین ، محمد دین اور قطب دین ۔ فضل دین کی ایک بہن بھی تھی جس کی شادی ساہووالہ ضلع سیالکوٹ میں ہوئی ، اس کا ایک پوتا خواجہ محمد عبداللہ آج کل گوجرانوالہ میں ٹرانسپورٹ کا کام کرتا ہے۔

مولوی صاحب نے کوٹلی امیر علی کے پرائمری اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔پانچویں جماعت نمایاں حیثیت سے پاس کی اور سرکاری وظیفہ حاصل کرلیا۔

سرکاری وظیفہ مل جانے پر الف دین نے ورنیکلر مڈل اسکول ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں داخلہ لے لیا۔ دوران تعلیم انہوں نے فارسی ، اردو اور عربی میں کافی مہارت حاصل کرلی۔ چنانچہ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد معلم بن گئے۔ کچھ عرصہ ڈسکہ میں معلم رہے۔ پھر مڈل اسکول جالندھر میں منتقل ہوگئے۔ ساتھ ہی قانون کی تعلیم حاصل کرنی شروع کردی۔

انیس بیس سال کی عمر میں وہ راولپنڈی میں (۹۱-۱۸۹۰ء) مقامی عدلیہ میں وکالت کرنے لگے اور وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے انگریزی زبان پر بھی اتنا عبور حاصل کرلیا کہ مقامی عدلیہ میں اور بعد ازاں عدالت عالیہ میں انگریزی زبان ہی میں مقدمات کی پیروی کرتے تھے۔

وکالت کے ساتھ ساتھ وہ علمی وادبی مجالس میں حصہ لیتے تھے اور آزادی ہند اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں بھی عملی دلچسپی لیتے تھے۔

مولوی الف دین نفیس کی انجمن جماعت اسلام لاہور کے قریبا" ہر سالانہ جلسہ میں شمولیت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ وہ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مولوی صاحب نے مرحوم سرسید احمد خاں

کی تحریک علی گڑھ میں صرف مالی معاونت پر ہی اکتفانہ کی بلکہ اپنے سب سے بڑے سات آٹھ سالہ بیٹے خواجہ محمود کو تحصیل علم جدید کی خاطر علی گڑھ بھی بھجوادیا۔ جہاں سے ۲۶-۱۹۱۹ء میں خواجہ محمود بی اے ، ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے واپس آئے اور ابتدا" اپنے والد محترم کے زیر سایہ کیمبل پور میں وکالت کا آغاز کیا اور بعد میں سیالکوٹ منتقل ہو گئے۔

علی گڑھ تحریک کے پہلو در پہلو مولوی صاحب ایک اور تحریک میں بھی زور و شور سے مشغول تھے ، یہ تحریک ان کشمیری مہاجرین ، کے ہندوستان میں شہری اور انسانی حقوق کے لئے جاری کی گئی تھی جو مدتوں قبل کشمیر میں حالات سے مجبور ہو کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اقامت پذیر ہو چکے تھے۔ یہ مہاجرین شمال مغربی صوبہ پشاور ، راولپنڈی ، لاہور ، امرتسر ، لدھیانہ وغیرہ سے لے کر بنگال تک پھیلے ہوئے تھے۔

تحریک آزادی کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف اور دور دراز شہروں میں جلسے اور خصوصی مشاعرے منعقد ہوئے تھے۔ مولوی صاحب عدم شرکت کی وجہ سے اپنی غزل یا نظم بھجوادیتے تھے۔ مولوی صاحب کی ایک غزل جو انہوں نے ایک آل انڈیا مشاعرہ کے لئے لکھی ، کئی شہروں کے جلسوں میں پڑھی گئی۔ ایک شعر ہے۔

پہلے مانگا، اب نہ مانگیں گے، مگر لیں گے ضرور
حق آزادی، کہ ہم حقدار ہیں، سائل نہیں

مولوی صاحب ۲۲-۱۹۲۱ء میں کیمبل پور سے ڈسکہ منتقل ہو گئے۔

مولوی صاحب کے دوسرے فرزند ڈاکٹر خواجہ احمد کو کسی حد تک شعر و شاعری

سے دلچسپی تھی۔ وہ خوش ذوق ، وخوش الحان بھی تھے۔ مولوی صاحب کی اکثر طویل نظمیں انجمن حمایت اسلام اور انجمن کشمیری مہاجرین کے جلسوں میں یا دیگر ملی و مذہبی اجتماعات میں پڑھی گئی ہوں گی۔

مولوی صاحب کی مثنوی معارف اسلام کو ایک مقام حاصل ہے۔ مثنوی میں اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ان کی مختصر تشریح یا سادہ الفاظ میں درسی کتب کے نمونے پر ترتیب دی گئی تھی۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے مولانا کی مثنوی پر تقریظ لکھی ہے

مثنوی معارف اسلام میں نے دیکھی۔ خاک پنجاب سے اس نور کا ظہور آپ کے اہل وطن کو مبارک ہو۔ اس سے زیادہ صاف اور سلجھے ہوئے خیالات اس وقت کی کسی نظم میں نظر سے نہیں گزرے۔ یہ تصنیف آپ کے عمدہ ترین اعمال صالح میں انشاء اللہ محسوب ہوگی۔

حب شخص حب وطن اور حب اللہ یہ باب تو بے مثل ہے۔ افسوس ہے کہ نا تندرستی اور ناتوانی زیادہ تحریر سے روکتی ہے۔ آپ نے آیات قرآنی کو جو جابجا نہایت خوبی سے اشعار میں داخل کر دیا ہے ، لڑکے یاد کر لیں تو بہت مفید ہو۔ اب اور کیا کہوں ، آپ نے خود ہی ہدایت کر دی ہے۔ و تبتل الیہ تبتیلا

الف دین نے خوب لکھی کتاب
کہ ب دین نے پائی راہ صواب

سید اکبر حسین اکبر

الہ آباد (۱۸/ مارچ ۱۹۲۰ء)

مولوی صاحب کے بیٹے کی

اقبال کے بڑے بھائی کی نواسی سے شادی

خانوادہ اقبال اور مولوی صاحب کے تعلقات کئی سال سے قائم تھے ۱۹۲۱ء میں مولوی صاحب کے دوسرے فرزند ڈاکٹر خواجہ احمد (خواجہ فاروق کے والد گرامی) کی شادی سیالکوٹ کے اس محترم کشمیری گھرانے میں علامہ اقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کی نواسی سے انجام پائی اور اب تک اقبال اور مولوی صاحب کے خاندانوں میں مودت محبت کے باہمی روابط موجود ہیں

مولوی صاحب کے لائق بھتیجے خواجہ عبدالحمید عرفانی بھی علامہ اقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کی نواسی (اکبری بیگم کی صاحبزادی) سے انجام پائی اور ۱۹۳۶ء میں اقبال منزل پر آنے والی آخری بارات تھی اور بعد ازاں اقبال منزل گورنمنٹ کی تحویل میں لے لی گئی۔

مولوی الف دین اور علامہ اقبال

۲۱-۱۹۲۰ء میں کیمبل پور میں مختصر قیام کے دوران ایک دن خواجہ عبدالحمید عرفانی کو کچھ غیر مطبوعہ متفرق اوراق کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک چھوٹی تقطیع کے لیٹر پیڈ پر کچھ شعر لکھے ہوئے نظر آئے۔ خط علامہ اقبال کی طرف سے مولوی صاحب کی طرف تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اقبال نے اپنی مثنوی سے دو یا تین شعر لکھوائے تھے اور مولوی صاحب سے ایک نظر دیکھ لینے کو کہا تھا، خواجہ عبدالحمید عرفانی نے وہ ورق مولوی صاحب کو دکھایا اور پوچھا کہ علامہ اقبال آپ کو اپنے شعر

دکھایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: اقبال بہت بڑا اور باذوق شاعر ہے ایسے ہی کبھی شک پڑجائے تو لکھ بھیجتا ہے۔

ڈسکہ میں قیام:

۲۱-۱۹۲۰ء میں دو بڑے بیٹوں کے بر سر روزگار ہو جانے کے بعد مولوی صاحب نے وکالت ترک کر دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈسکہ میں مولوی صاحب کے بڑے داماد شیخ غلام نبی بی اے ، ایل ایل بی وکیل پریکٹس کر رہے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی محدود ضروریات کے مطابق ڈسکہ سیالکوٹ روڈ پر کوٹھی تعمیر کروا چکے تھے اور اپنا وقت مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں گزارتے تھے۔

مولوی صاحب کے فرزند ارشد خواجہ محمود (علیگ) سیالکوٹ میں پریکٹس کر رہے تھے اور اچانک ایک موذی مرض میں مبتلا ہو کر ڈسکہ منتقل ہو گئے۔

مولوی صاحب کی وفات:

مولوی صاحب جواں بیٹے کی بیماری کے رنج و اندوہ کو صبر اور خاموشی سے برداشت کرتے ہوئے ۲۹ جنوری ۱۹۳۸ء مطابق ۲۹ ذی قعد ۱۳۵۶ھ بروز ہفتہ ابدی نیند سو گئے۔

مولوی صاحب کے بڑے پوتے (فرزند خواجہ محمود علیگ) پرنسپل گارڈن کالج راولپنڈی ، راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ مولوی صاحب ڈسکہ سیالکوٹ روڈ پر واقع قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کی تاریخ وفات مولوی سراج الدین علامہ اقبال کے

قریبی دوست نے۔ قطعہ تاریخ کہا۔

الف دین عارف وکیل نفیس
برفت و ہم آغوش رحمت شدہ
ملائک بہ تعظیم او خاستند
چو داخل در ایوان وحدت شدہ
چو سال وفات از ملک خواستم
مخاطب بالفاظ حکمت شدہ
پے سال رحلت بگویا وکیل
الف دین عارف جنت شدہ

ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی نے ان کی لائبریری سے ان کی تالیفات کی تعداد ۱۲ بتائی ہے۔

ظفر الحق شیخ

ظفر الحق شیخ کے بارے میں ان کی چھوٹی بیٹی گیتی شیخ (بار ایٹ لاء) سے رابطہ کیا گیتی شیخ اپنی زندگی میں کئی ادوار سے گزری ہیں اور ان کی موجودہ حالت بڑی تکلیف دہ ہے۔ ایک خوشحال اور کھاتے پیتے گھرانے کی چشم و چراغ ہونے کے باوجود محمد علی سوسائٹی کے ایک بنگلے میں قیام پذیر ہیں۔ بنگلہ ذاتی ہے نہ کرائے کا، بس جگہ مل گئی اور وہ اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔

گیتی شیخ نے بتایا کہ ان کے والد ۲۷ ستمبر ۱۹۰۹ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ علامہ کی بہن کریم بی بی (ظفر الحق شیخ کی والدہ) اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے پہلے سیالکوٹ میں اقبال منزل پر قیام پذیر تھیں اور علامہ اقبال کی اہلیہ سردار بیگم (والدہ

جاوید اقبال) کی وفات کے بعد لاہور میں اپنے بھائی کے ہاں رہنے لگیں۔ ان کے بڑے بیٹے ظفر الحق اپنی والدہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ حتی کہ ان کی وفات پر وہ پنجاب نہیں گئے اور کراچی ہی رہے۔

ظفر الحق شیخ کے والد احمد دین کا تعلق گوجرانوالہ کے ایک گاؤں نت سے تھا، شیخ ظفر الحق کی شادی بھی اپنے ددھیال کے عزیزوں میں ہوئی۔

پہلی شادی سے صرف دو ہی بیٹیاں پیدا ہوئیں کہ ان کی اہلیہ گیتی شیخ کو شیر خواری کے عالم یں چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئیں۔ گیتی شیخ اگست ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئی تھیں۔

ظفر الحق شیخ کے سسرال والوں نے یتیم بچیوں کی مناسب دیکھ بھال اور تربیت کی خاطر اپنی دوسری بیٹی بھی ظفر الحق شیخ کے عقد میں دے دی۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔

شیخ ظفر الحق مکینیکل انجنیئر تھے اور ان کے پاس دولت کی ریل پیل تھی لہذا انہوں نے اپنے ماموں زاد بھائی آفتاب اقبال کی طرح اپنی اولاد کی تربیت پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن چونکہ شیخ صاحب بڑے وسیع القلب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اس لئے بچے اور بچیوں کی تعلیم میں انہوں نے کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔

آزاد اقبال کے ساتھ ہی Lincon'sInn سے وہ بیرسٹر بن کر پاکستان وارد ہوئیں۔ ان کی بڑی بہن رفعت بھی بیرسٹر تھیں لیکن زیادہ تعلیم کی وجہ سے ان کے دل ودماغ پر منفی اثرات مرتب ہوئے اور آج وہ شکل وصورت میں فرد ہونے کے باوجود اپنے حواس خمسہ سے بہتر طریقے سے کام لینے کی استعداد سے محروم ہیں۔

گیتی قانون کی پریکٹس کے آغاز کے بعد تصوف کی ایک ایسی راہ پر گامزن ہو چکی ہیں ، جہاں سے ان کی واپسی ناممکن ہے۔ ان کے دو بھائی جوان ہیں ، سرکاری ملازم ہیں ، اچھے عہدوں پر فائز ہیں لیکن چونکہ سروں پر ماں باپ کا سایہ موجود نہیں ، ابھی تک مجرد زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

ظفر الحق صاحب نے تقریباً" بیس سال سعودی عرب میں گزارے۔ کافی دولت کمائی۔ آخر عمر میں وہ آرام سے اپنی زندگی کے بقایا ایام کاٹنے کے متمنی تھے کہ ان کی صاحبزادی نے ان کے سب خواب بکھیر دیئے اور وہ بھی اپنی لائق اور فائق بیٹی سے اتنے متنفر ہوئے کہ انہوں نے بستر مرگ پر بھی انتہائی کرب کے عالم میں اپنی بیٹی گیتی شیخ سے بات کرنے سے گریز فرمایا۔

ظفر الحق صاحب بڑے خوددار اور شریف النفس انسان تھے۔ میں ان کی بیماری کی حالت میں ، ان کی عیادت کو ہسپتال جایا کرتی تھی۔

آخر ۲۷ جنوری ۱۹۹۰ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور انہیں سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

علامہ کے خاندان پر جان فدا کرتے تھے اور کسی کی گستاخی پر بڑی سخت گرفت کرتے تھے وہ آفتاب اقبال سے تقریباً" گیارہ سال چھوٹے تھے اور بچپن کا زمانہ اقبال منزل کی چار دیواری میں شیخ اعجاز احمد ، مختار احمد اور آفتاب اقبال کی معیت میں گزارا۔

پھر تلاش معاش کے لئے سیالکوٹ کی سرزمین سے نجانے کن کن ممالک اور شہروں کا رخ کرنا پڑا اور آخر ان کی مٹی کراچی کی تھی اور یہی سرزمین ان کا مدفن بنی۔ شیخ صاحب کو خوشیاں دیکھنی نصیب نہ ہوئیں اور وہ آخری عمر میں بیمار ہوئے اور بستر مرگ پر کافی عرصہ گزارا۔

آفتاب اقبال صاحب کی طرح وہ خوش خوراک اور خوش لباس تھے اور اپنے خاندان کی خاطر بڑے بڑوں سے بھڑ جاتے تھے۔

سید سلطان محمود حسن صاحب نے اقبال کی ابتدائی زندگی ترتیب دی تو انہوں نے ایک روایت کے مطابق ایک واقعے کا ذکر کر دیا اور یہ واقعہ بہتر تاثر کا حامل نہیں تھا اس واقعہ کے راوی خود علامہ کے ایک بھانجے پروفیسر شیخ منظور احمد تھے لیکن ظفر الحق صاحب اس واقعہ کی تردید فرماتے تھے اور انہوں نے انتہائی بیماری کے عالم میں لرزتے ہوئے ہاتھوں سے سید سلطان محمود حسین کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کرنے کے لئے تحریر فرمایا۔

۱۹۹۶ء میں مولانا حامد جلالی کی کتاب علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے ترمیم شدہ ایڈیشن کی اشاعت کے موقع پر ظفر الحق صاحب کا عریضہ کتاب کی زینت بنانا چاہا لیکن نجانے پریس والوں نے کس طریقے سے وہ عریضہ گم کر دیا اور آج بھی میں کف افسوس ملتی ہوں کہ اے کاش! اصل میرے پاس ہوتی اور فوٹو اسٹیٹ کاپی پریس کے حوالے کی ہوتی۔

علامہ اقبال کے آٹھ بھانجے تھے ،ان آٹھوں میں ان کی بڑی بہن طالع بی کے ایک فرزند پروفیسر منظور احمد تھے جو مرّے (Murray) کالج میں پڑھا چکے تھے اور دوسرے ان کی چھوٹی بہن کریم بی بی کے صاحبزادے ظفر الحق شیخ تھے جو پیشے کے لحاظ سے مکینیکل انجینئر تھے اور انہوں نے بڑی آسودہ زندگی بسر کی اور اپنی اولاد کو مثالی تعلیم وتربیت سے نوازا لیکن ان کی اولاد ان کے کام نہ آسکی۔ باقی بھانجے اتنے نامور نہ تھے۔ ایک بھانجے فضل حق کے صاحبزادے جالی بین الاقوامی شہرت کے آرٹسٹ تھے۔ جبکہ گیتی لندن سے بیرسٹر بن کر آئی تو وہ ظفر الحق صاحب کو ہمارے گھر ۳۳ ٹیپو

سلطان روڈلائی اور یوں کافی عرصے سے ایک ہی شہر میں بستے ہوئے دو بھائی برسوں میل ملاقات سے قاصر رہے۔ ان کی والدہ کریم بی بی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنی بہنوں سے ذرا پڑھی لکھی تھیں ورنہ دوسری بہنیں ناخواندہ تھیں۔ صرف ناظرہ قرآن پاک اور دوسرے گھریلو کاموں سے واقف تھیں۔ اقبالیات کے حصے میں انہیں کریم بی بی صاحبہ کی اسکیم کا بھانڈا پھوڑ چکی ہوں۔ اللہ مغفرت فرمائے، پھول کے ساتھ کانٹوں کا ہونا، اس بات کا غماز ہے کہ انسان میں نیکی کے پھول کے ساتھ برائی کے کانٹے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ظفر الحق ایک بیباک اور نڈر انسان تھے۔ اللہ انہیں بخشے وہ بڑے اچھے انسان تھے۔

پروفیسر منظور احمد:

آپ آفتاب اقبال صاحب کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ۱۹۰۲ء میں نوجوانی کے عالم میں ان کی والدہ طالع بی بی کا انتقال ہو گیا۔ مرحومہ کے چار صاحبزادے نور احمد، خورشید احمد، ظہور احمد اور منظور احمد تھے۔

بڑے بیٹے نور احمد تھے جو اس زمانے کے ایک مستند حکیم تھے۔ سیالکوٹ میں اس دور میں یہ بڑا معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا لیکن اس پیشے میں روپے پیسے کی ریل پیل نہیں تھی ۔نور احمد صاحب کے بارے میں شیخ عطا محمد نے آفتاب اقبال کے نام اپنے خطوط میں چند باتیں تحریر فرمائی ہیں، جن کی روشنی میں نور احمد صاحب کا نقشہ ذرا دھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ خورشید احمد شیخ صاحب کے پوتے خالد نظیر صوفی ہیں اور اپنی مرحومہ والدہ وسیمہ مبارک (وہ بچپن میں اپنے چچا علامہ اقبال کے گھر لاہور رہی ہیں) کی زبانی روایات کو اقبال درون خانہ نامی کتاب میں جمع کر دیا ہے اور یہ کافی معتبر کتاب مانی جاتی ہے۔ اب

ایک مستند ذریعے سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اب خالد نظیر صوفی صاحب اس کتاب کا دوسرا حصہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور کتاب کی تدوین کا کام شروع ہو چکا ہے۔

خورشید احمد اور ظہور احمد کی تعلیم واجبی سی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں دونوں بھائی انتقال فرما گئے۔ پروفیسر منظور احمد نے تقریباً" بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں فلسفہ میں ایم اے کیا تھا لیکن نجانے کس غلط فہمی کا وہ شکار ہوئے کہ وہ علامہ اقبال سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ حقیقی بھانجا ہونے کے باوجود ایک یا دو بار علامہ اقبال سے ملے ہوں گے۔ بعض ثقہ حضرات کا کہنا ہے کہ پروفیسر صاحب کو ایم اے میں کم نمبر ملے اور وہ تیسرے درجے میں کامیاب ہوئے تھے اور ان کے دور میں تیسرا درجہ لائق اور فائق شخص کے مستقبل کو داغدار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا تھا کیونکہ اچھی ملازمت کے لئے ایم اے درجہ اول اور درجہ دوم تک امیدواروں کو آگے بڑھنے کے چانس ملتے تھے ورنہ تیسرے درجے میں کامیابی انہیں کہیں کا نہیں چھوڑتی تھی۔ پہلے پہل وہ مرے کالج سیالکوٹ میں فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ کچھ عرصہ اس کالج سے وابستہ رہے پھر انہوں نے تدریس کو خیرباد کہہ دیا۔

انہیں کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا اور ان کی ذاتی لائبریری میں بڑی نایاب اور عمدہ کتابیں تھیں۔ ان کے بھتیجوں کو تلاش معاش میں سیالکوٹ سے لاہور اور دوسرے شہروں میں جانا پڑا اور پھر پروفیسر صاحب پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے انہوں نے شادی سے اپنے دامن کو بچائے رکھا اور وقت کے دھارے کے ساتھ ان کی اقبال دشمنی میں اضافہ ہوتا رہا۔ سیالکوٹ کے چودھری ریاست علی صاحب سے ان کی اچھی خاصی ملاقات تھی اور چودھری صاحب کے علاوہ اور بھی معتبر اور ثقہ لوگوں سے

پتہ چلا کہ پروفیسر صاحب کے ایم اے کے پرچوں کو علامہ اقبال نے جانچا تھا، اور پروفیسر صاحب کے دل میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ ان کے ماموں نے جان بوجھ کر انہیں کم نمبر دے کر درجہ سوم میں کامیاب کروایا اور یہی بات مستقل دشمنی کا سبب بن گئی۔ حالانکہ علامہ اقبال ممتحن کی حیثیت سے کسی رو رعایت دینے کے روادار نہ تھے اور ان کے قریب بیٹھنے والے بھی کسی کی سفارش کرنے سے کنی کتراتے تھے۔ عظمت رفتہ میں ضیاء الدین احمد برنی نے اپنا ذاتی واقعہ سنایا ہے کہ سفارش کے سلسلے میں علامہ کافی خفا نظر آتے تھے۔

بڑھاپے کے باوجود وہ صبح کی ہواخوری کے عادی تھے اور اپنے گھر سے کافی دور جناح پارک کے قریب تک آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے چلے جاتے تھے۔ ایک صبح وہ معمول کی ہواخوری پر روانہ ہوئے جناح پارک کے قریب ایک جوہڑ کے کنارے چلتے ہوئے ان کا پاؤں پھسلا اور وہ گہرے جوہڑ میں جا گرے۔ صبح سویرے ان کی مدد کے لئے کوئی موجود نہ تھا، نجانے کس کسمپرسی کے عالم میں وہ پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ کافی دیر تک گھر نہ لوٹے تو ان کی تلاش شروع ہوئی۔ جس راہ پر وہ روانہ ہوتے تھے اسی راستے پر تلاش کرتے ہوئے جناح پارک کے قریب جوہڑ میں ان کی لاش نظر آئی اور یوں ایک لائق اور فائق شخص دار فانی سے رخصت ہو گیا۔

وہ انگریزی زبان کے شاعر تھے اور کسی اچھے وقت میں کوئی پچیس تیس کے لگ بھگ انہوں نے نظمیں لکھ چھوڑی تھیں اور انہیں ہی پالش کرتے رہتے تھے۔ بعض لوگ ان کی خودکشی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں کیونکہ کسی ذاتی وجہ کی بناء پر خودکشی کا ارتکاب بھی بڑے مہذب طریقے سے ہوتا ہے۔ صبح کے وقت کپڑوں سمیت جوہڑ میں کود کر اپنی جان ضائع کرنا بالکل غلط بات ہے۔

علامہ کے رشتے میں ایک بھتیجے تھے اور ان کی تدریس انگریزی کا چرچا تھا اور انہوں نے ذاتی وجہ کی بناء پر اپنی جان کو ختم کرنا چاہا تو اپنی جیب میں باقاعدہ پرچہ رکھا اور خودکشی کو ذاتی اقدام قرار دے کر کسی کو شبے میں گرفتار کرنے سے منع کر دیا۔ یہ ہستی حکیم جمشید علی مرحوم (سید سلطان محمود حسین صاحب کی کتاب اقبال کی ابتدائی زندگی کے مطابق علامہ اور حکیم صاحب کی والدہ چچیری بہنیں تھیں) کے صاحبزادے پروفیسر تجمل علی راٹھور تھے جو علامہ اقبال کے والدین کی قبور کے قریب ہی الٹے ہاتھ پر محو استراحت ہیں۔

پروفیسر صاحب کے ایک بھتیجے (ظہور احمد صاحب کے صاحبزادے) ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں اور سیالکوٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ تین بھائی لاہور میں اقامت پذیر ہیں اسی سال ان کی بہن مسرت کا سیالکوٹ میں انتقال ہوا ہے۔

اگر ان کے کتب خانے میں ان کے کاغذات کو الٹ پلٹ کیا جائے تو شاید مضامین کے سلسلے کی کوئی عمدہ تحریریں ہاتھ لگ جائیں۔ ان کے کتب خانے کی کتابوں کی فہرست شائع ہونی چاہئے۔ تقریباً" آج سے کوئی بائیس برس پہلے ان کا انتقال ہوا ہے اور کتابوں کو دیمک نہ چاٹ رہی ہو۔ کسی صاحب علم ہستی کو ان کتابوں کو کرم خوردگی سے محفوظ رکھنے کی سبیل کرنی چاہئے۔ یہ کتابیں تقریباً" کوئی پچاس سال پہلے کی جمع کی ہوں گی اور اب ایسی کتابیں کہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں خالد نظیر صوفی کی اطلاع کے مطابق جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ کو دیدی گئی ہیں۔

پروفیسر منظور احمد مرحوم کے بھتیجوں سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے چچا جان کے کتابی سرمائے کو ضائع ہونے سے بچائیں اور کسی طریقے سے محفوظ رکھیں۔

روایات اقبال مرتبہ عبداللہ چغتائی سے پروفیسر منظور احمد مرحوم کی چھ روایات کا

اندراج ملتا ہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ناظم خلیفہ عبدالحکیم نے بزم اقبال کی طرف سے ۱۹۵۲ء میں تجویز کیا۔ کہ ایک کمیٹی علامہ سے متعلق روایات جمع کرے تاکہ علامہ اقبال کی سوانح عمری کے سلسلے میں ثقہ معلومات حاصل کی جا سکیں۔ پروفیسر صاحب ۱۹۷۶ء میں انتقال فرما گئے اور قبرستان کشمیریاں سیالکوٹ میں مدفون ہیں۔

خواجہ عبدالحمید عرفانی

خواجہ عبدالحمید عرفانی ۱۹۰۷ء میں سیالکوٹ کے ایک قریبی گاؤں مغلانوالی میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد صاحب حال صوفی حضرت عبدالقادر کشمیر میں اپنے آبائی گاؤں چراٹ (چراٹ شریف) سے انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہجرت کر کے ناحیہ سیالکوٹ میں وارد ہوئے۔ صوفی عبدالقادر کے دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹے خواجہ جمال دین نے لاہور کا رخ کیا (انہی کے اخلاف میں خواجہ عبدالحمید، عبدالمجید، ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید اور مشفق خواجہ کے نام شامل ہیں) اور دوسرے بیٹے خواجہ کمال دین وائیں نے سیالکوٹ کے نواحی گاؤں مغلانوالی میں، جو نالہ ایک کے بائیں کنارے پر واقع ہے، اقامت اختیار کر لی۔ خواجہ عرفانی صاحب کے تایا ابا مولوی الف دین نفیس نے اپنی ایک پنجابی نظم میں، جو سہ حرفی کی طرز پر نوجوانی کے زمانے کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، کہا ہے ؎

یاد رکھیں تینوں دساں ہاں مغلاں والی اے تھاں مکان میرا

کنڈے ایک دے وسدا پنڈ چھوٹا، تھانہ ضلع سیالکوٹ پچھان مرا

خواجہ کمال کے تین بیٹے تھے، فضل دین سب سے بڑا تھا۔ خواجہ فضل دین کے پانچ بیٹے ہوئے محمد رمضان، مولا بخش، الف دین، محمد دین اور قطب دین۔ خواجہ

عرفانی صاحب کے والد گرامی کا نام محمد دین تھا۔ کتاب اقبال عرفانی میں خواجہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ان کی دو بہنیں اور وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور ان کے والد محترم غلے کا بیوپار کرتے تھے۔ وہ آس پاس کے دیہات سے غلہ خرید کر سیالکوٹ کی کنک منڈی میں ہندو آڑھتیوں کے توسط سے فروخت کرتے تھے۔ ان کی بڑی بہن کی شادی ان کی ہوش سے پہلے تایازاد بھائی سے ہوگئی تھی اور چھوٹی بہن کی شادی اواخر ۱۹۱۸ء میں جموں میں مقیم ایک سیالکوٹی خیاط (درزی) خواجہ شیر محمد سے ہوگئی۔ ممتاز بیگم کی شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد جنگی بخار (انفلوئنزا) کی وبا میں مبتلا ہوئے اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

والدہ انہیں جموں لے گئیں تاکہ وہ اپنے بہنوئی سے درزی کا کام سیکھ کر اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جائیں۔ وہاں خاندان کے سربراہ نے عرفانی صاحب میں علم کی لگن اور شوق کو دیکھ کر اسے چکوال ایک ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد شفیع صاحب کے پاس بھجوانے کا مشورہ دیا۔

خواجہ صاحب نے چکوال میں تعلیم حاصل کی اور اسکول میں مشہور مصنف ڈاکٹر غلام جیلانی برق اردو پڑھانے پر مامور تھے اور ان کی راہنمائی نے خواجہ عرفانی صاحب میں خوابیدہ صلاحیتوں کو ابھارا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کے سلسلے میں وہ بہاولپور کے کالج میں پہنچے۔ دو سال کے بعد وہ جموں کے ویلز کالج میں پہنچے اور بعد ازاں لاہور میں بی اے کے امتحان کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھے لیکن ناکام رہے اور ان دنوں مولوی الف دین کے صاحبزادے ڈاکٹر خواجہ احمد کوئٹہ ڈویژن میں ریلوے کے محکمے میں متعین تھے۔ ان کے تار بھیجنے پر خواجہ صاحب کوئٹہ روانہ ہوگئے۔ کوئٹہ میں وہ ایک اسکول میں استاد کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

۱۹۳۶ء میں خواجہ عرفانی صاحب علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی نواسی اور شیخ فضل الٰہی کی صاحبزادی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور ان کی بارات مغلاں والی سے اقبال منزل سیالکوٹ آئی تھی اور اقبال منزل میں یہ آخر بارات تھی کیونکہ بعد ازاں حکومت کی تحویل میں اقبال منزل کو لے لیا گیا۔

خواجہ عرفانی صاحب کے تایازاد بھائی خواجہ احمد بھی علامہ اقبال کے برادر اکبر شیخ عطا محمد کی نواسی سے رشتہ ازدواج میں منسلک تھے اور یوں علامہ کے گھرانے سے اس وائیں خاندان کا قریبی تعلق ہے۔ خواجہ فیروز الدین بھی خواجہ عبدالحمید عرفانی کے قریبی اعزہ سے تعلق رکھتے تھے۔

خواجہ صاحب کے پاکستان کے ابتدائی دور کے سیاسی راہنماؤں اور علماء حضرات سے بڑے گہرے مراسم تھے اور ان کی کتاب اقبال عرفانی میں بڑی تفصیل سے واقعات دیئے گئے ہیں۔

۱۹۷۳ء کے بعد خواجہ عبدالحمید عرفانی سیالکوٹ میں اپنے بھانجے خواجہ انور کے ہاں مقیم رہے اور وزیر آباد میں اپنی بیٹی کے پاس بھی رہے اور آخر ۱۹۹۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب سے خواجہ صاحب کے احوال دینے کو جی چاہتا ہے۔

احباب

ہمایوں اختر صاحب

ہمایوں اختر صاحب لاکھوں روپے کی جائیداد اور چلتا کاروبار چھوڑ کر کراچی آئے تھے۔ نقل مکانی کے وقت ان کے گھرانے کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بمبئی اور کلکتہ میں کاروباری حضرات سے ان کے مراسم تھے۔ اور بڑے کاروباری لوگ بھی کراچی آچکے تھے۔ لہٰذا اپنے ذاتی اثرورسوخ اور تجربہ کی بناپر ہمایوں اختر صاحب کو ایک پرائیوٹ فرم (یعقوب برادرز) میں بطور منیجر کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۳ء تک ہمایوں اختر صاحب اس فرم سے وابستہ رہے۔

کچھ عرصہ بعد ہمایوں اختر صاحب کے والد ماجد بیمار ہوئے۔ اور معقول معالجہ کے باوجود وہ جاں بر نہ ہوسکے۔ ہمایوں اختر صاحب کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر ان کا علاج یوں ہوتا تو شاید وہ اس عارضی دنیا میں کچھ دن اور گزار لیتے۔ بہرکیف انہوں نے طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور ایک مستند حکیم قرار پائے۔

۱۹۵۳ء میں انہوں نے Orient Chemical Industries کے نام سے دوا سازی کا ایک طبی ادارہ قائم کیا۔ پہلے پہل انہوں نے جڑی' بوٹیوں سے Oil Herbinol Hair کے نام سے تیل متعارف کروایا۔ ان کی فرم عرصہ دراز سے یہ تیل تیار کررہی ہے۔ اور بیرون ملک یہ تیل برآمد کیا جاتا ہے۔

ہمایوں اختر صاحب کو آفتاب اقبال صاحب سے بڑی انسیت تھی وہ گھنٹوں محو گفتگو رہتے اور رات اپنی گاڑی میں گھر لوٹتے۔ صحت کے اصولوں اور ٹوٹکوں سے فیض یاب کرتے تھے۔ آفتاب اقبال کی تدفین کے سلسلے میں ہمایوں اختر صاحب نے نمایاں کردار انجام دیا۔ میں کئی بار ان سے کہہ چکی تھی کہ ■ آفتاب اقبال صاحب کے بارے میں کوئی مضمون لکھیں۔ وہ نجانے کیوں ٹالتے رہے' ان کی صحت قابل رشک تھی اور وہ بھلے چنگے تھے۔ موت کا فرشتہ آجائے تو کسی عذر اور شکایت کا یارا نہیں رہتا۔

چند دنوں میں وہ ہم سے رخصت ہوگئے' ان کے قلم میں بلا کی روانی تھی اور وہ زیادہ تر انگریزی اخبارات میں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔

آفتاب اقبال صاحب کے انتہائی گہرے دوست جناب ہمایوں اختر صاحب

مظہر حسین عریضی صاحب

کراچی میں آفتاب اقبال صاحب کی ملاقات عریضی صاحب سے ہوئی اور جب سر محبوب قادری صاحب (سر سید پر انگریزی میں ایک یادگار کتاب کے مصنف تھے) کے حوالے سے بات چھڑی تو آفتاب اقبال صاحب کے دل میں گھر کر گئے۔ اور انہوں نے عریضی صاحب کی دیانت اور شرافت کی وجہ سے انہیں اپنا وکیل مقرر کر دیا اور عریضی صاحب انکم ٹیکس افسر بھی رہے ہیں اور انکم ٹیکس کے تجربہ کار ایڈووکیٹ ہیں۔

عریضی صاحب گجرات کاٹھیاواڑ کی راجد ھانی احمد آباد میں ۶ دسمبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم احمد آباد ہی میں حاصل کی اور بی۔ کام اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات بمبئی سے پاس کیے۔

۱۹۴۴ء میں بمبئی میں انکم ٹیکس افسر کی آسامی پر تعیناتی ہوئی۔ ابھی بر سر کار ہوئے۔ تین سال کا قلیل عرصہ ہوا تھا کہ ۱۹۴۷ء کا خونی انقلاب رونما ہوا اور ہندوستان کے بٹوارے نے اچھے اچھوں کو اپنی لپیٹ میں لیا اور کافی گھرانے نقل مکانی کر کے پاکستان میں داخل ہوئے۔ عریضی صاحب کے خاندان کے کچھ افراد پاکستان آئے اور اکثریت بھارت میں رہی اور تقریباً" ان کے خاندان کے اکثر افراد کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔

عریضی صاحب کو آفتاب اقبال صاحب بہت چاہتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کا ایک دوسرے یہاں آنا جانا ہوتا۔ عریضی صاحب ہمارے ہاں آنکلتے تو گھنٹوں بات چیت کا دور چلتا' پچھلے دنوں

عریضی صاحب کو گھر پر بلایا اور انہیں بتایا کہ میں آفتاب اقبال صاحب کے حالات زندگی پر ایک کتاب ترتیب دے رہی ہوں اور آپ اپنی یادداشتوں کے حوالے سے اپنے دوست سے مختلف نشستوں میں سنی ہوئی باتوں سے ہمیں بھی آگاہ کریں تو عریضی صاحب گویا ہوئے:

آفتاب اقبال جیسا فصیح و بلیغ انگریزی بولنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ اگر وہ کسی سے محو گفتگو ہوتے تو لہجے سے گمان گزرتا تھا کہ بولنے والے کی مادری زبان یقیناً انگریزی ہے۔ وہ بڑی تیزی سے بولتے تھے اور بات چیت کے فن کے ماہر تھے۔ لطیفے اور چٹکلوں پر اتر آتے تو محفل کو لوٹ پوٹ کر دیتے۔

ایک روز آفتاب اقبال کے ساتھ محفل جمی تھی اور باتوں باتوں میں آفتاب اقبال صاحب فرمانے لگے کہ ایک روز اباجی (علامہ اقبال) گویا ہوئے کہ میں گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کے بعد لاہور میں اکیلا رہا تھا اور میرا معمول تھا کہ رات کو سوتے وقت کمرے کی کنڈی لگا دیتا اور پھر استراحت کے لئے بستر پر دراز ہو جاتا۔ ایک دن معمول کے مطابق بستر پر دراز ہوا تو رات کے پچھلے پہر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی چہرے والے بزرگ ہاتھ میں لالٹین لئے (اس زمانے میں اکثر گھروں میں لالٹین سے لکھنے پڑھنے کا کام لیا جاتا تھا) کمرے میں دفعتاً" داخل ہوئے میں ذرا خوف زدہ ہوا کہ کنڈی چڑھے دروازے سے یہ حضرت کیسے میری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں اور وہ نورانی صورت بزرگ فرمانے لگے: ڈرو نہیں میں مولانا رومی ہوں اور آپ کو بتانے آیا ہوں کہ اپنی شاعری کا رخ مذہب کی طرف موڑ دو۔ یہ پیغام دے کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور میں بیدار ہوا تو کمرہ بدستور بند تھا۔ بہر کیف اس روز کے بعد میں بلا تامل اپنا مافی الضمیر فارسی زبان میں شعروں کی صورت میں ڈھالنے پر قادر ہو گیا اور سجانے

کون سی روحانی قوت تھی جس کے فیضان سے میرے قلم سے فارسی اشعار نکلنے لگے۔ اور یوں اردو کے مقابلے میں فارسی اشعار کی آمد ہونے لگی۔

یہ واقعہ عریضی صاحب نے آفتاب اقبال صاحب کی زبانی سنایا اور اس واقعہ سے یہ راز کھلتا ہے کہ شاعر سے قدرت خود ناممکن بات کو ممکن ثابت کرنے پر تل جائے تو بڑے بڑے نقاد اور دانشور دنگ رہ جاتے ہیں۔ اپنے گھر پر نوے فیصد پنجابی زبان میں گفتگو کرنے والا شخص ٹکسالی اور معیاری اردو میں کس طرح شاعری کر سکتا ہے اور ایران کی سیاحت سے محروم شخص فصیح اور شستہ فارسی میں اتنے عمدہ اشعار کہنے پر قادر ہوا کہ ایران کے علماء اور شعراء مثل علامہ سعید نفیسی اقبال کی فارسی شاعری کا لوہا مانتے تھے۔

بیگم آفتاب صاحبہ کے بارے میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک عظیم عورت ہیں جنہوں نے پنجاب کے شہرہ آفاق ادارے مدرستہ البنات سے تعلیم پائی اور اخلاقی اور مذہبی تعلیم سے اپنی ذات کو آراستہ کیا۔ اور وہ ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن دوران تعلیم ہی انہیں آفتاب اقبال صاحب کی رفیقہ حیات بنا دیا گیا۔ انہوں نے عین جوانی کے عالم میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کو اپنا شریک حیات بنایا' جس کے پاس ذرائع معاش کا کوئی وسیلہ میسر نہ تھا اور محض خدا کے بھروسے پر ان کے والدین نے یہ قدم اٹھایا بیگم صاحبہ کی قسمت ایسی تھی کہ شادی کے بعد آفتاب اقبال صاحب کے مالی حالات یکسر بدل گئے اور مال و دولت اور اولاد سے نوازے گئے۔

آفتاب صاحب کی رحلت کے بعد رشیدہ بیگم صاحبہ کی زندگی محروم اور غریب انسانوں کی خدمت کے لئے وقف ہے۔

انکم ٹیکس ایڈووکیٹ جناب عزیزی صاحب

جناب مظہر علی علوی صاحب ایڈووکیٹ

چوہدری محمد دین صاحب

آفندی صاحب مصری آرٹسٹ جو علامہ کو قرآن مجید سنایا کرتے تھے

حسن الاعظمی

حسن الاعظمی صاحب اکثر و بیشتر ہمارے ہاں آتے رہتے تھے اور ان نشستوں کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے یاد ماضی کے دریچوں سے جھانک کر لب کشائی فرماتے تھے' ایک روز فرمانے لگے ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو میں مصر میں تھا' جامعہ ازہر میں پروفیسر تھا۔ میں نے علامہ اقبال سے اپنی محبت اور عقیدت کے اظہار کے لئے ایک تعزیتی جلسہ کا اہتمام کیا۔ تعزیتی جلسہ کی صدارت کے لئے جامعہ کے شیخ کو دعوت دی' لیکن علامہ اقبال کے کچھ مخالفین ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ وہ اس جلسہ کے انعقاد میں روڑے اٹکا کر رہیں گے۔ عین مہمانوں کی آمد کے موقع پر یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ اقبال شراب پیتے تھے' مذہبی لوگوں کو شرابی کے تعزیتی جلسہ میں شرکت کرنا زیب نہیں دیتا۔ اس زہریلے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر کچھ مہمان جلسہ گاہ سے واپسی کا ارادہ کر رہے تھے کہ میں نے انتہائی تیزی اور عجلت سے مائک سنبھالا اور بڑے سخت الفاظ میں مخالفین کی اس چال کو بے نقاب کیا اور الحمد للہ یہ جلسہ کامیاب رہا اور علامہ اقبال کے مخالفین کو منہ کی کھانا پڑی۔

جس زمانے میں اعظمی صاحب ہمارے یہاں عرب مہمانوں کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔ ہمارے بیٹے حصول علم کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا وسیع و عریض مکان میں مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا جاتا تھا اور آفتاب اقبال صاحب اپنی کاروباری مصروفیات سے فراغت پا کر دل جمعی سے ان محافل میں

حصہ لیتے تھے اور رات گئے تک علمی گفتگو کا دور چلتا تھا۔ اور ہمارے گھر میں گہما گہمی ہوتی تھی۔ اقبال کا کلام دراصل ایک پیغام ہے جس سے وہ اپنی قوم کے نوجوانوں اور صاحب علم و فضل لوگوں کو اسلام کی عالمگیریت کی لڑی میں پرونا چاہتے ہیں تاکہ یہ انحطاط پذیر قوم دوبارہ اپنی عظمت رفتہ کو پالے اور دنیا میں ایک پیغاماتی قوم کی حیثیت سے ابھرے اور کرہ ارض پر واقع ملکوں میں انتشار اور بدامنی کے دور کی بساط لپیٹ کر امن اور آشتی کے دور کو دعوت دیں۔

حسن الاعظمی کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے' انہوں نے سادے دین کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے اور اسلام کی روح کو اپنانے کے طریقے پر زور دیا وہ کسی میں مین میخ نکالنے کے قائل نہ تھے۔ فرقہ واریت کے سخت دشمن تھے اور اسلام کے بھائی چارے اور محبت و پیار کے درس کے علمبردار تھے کام اور کام اپنی زندگی کا اوڑھنا' بچھونا بنائے رکھا۔ پوری زندگی عربی زبان کی نشر و اشاعت کی نذر کردی۔ اور بابائے عربی کا خطاب پایا۔ آخر زندگی کی ستتر بہاریں دیکھ کر ۱۹۹۵ء میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے اور عزیز آباد کے قبرستان میں محو استراحت ہیں۔

حاجی عبدالسلام

(۱۸۹۸ء - ۱۹۷۶ء)

آفتاب اقبال کے ہمجولی اور ہم جماعت حاجی عبدالسلام سیالکوٹ شہر کے رہنے والے تھے اور ان کا آبائی گھر علامہ اقبال کے گھر کے بالمقابل واقع تھا۔ حاجی صاحب علامہ اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد اور علامہ سید میر حسن مرحوم کی آنکھیں دیکھے تھے۔ شیخ اعجاز احمد اور ظفر الحق کے ساتھ بچپن میں کھیلے تھے اور مشن اسکول میں شیخ اعجاز احمد اور آفتاب اقبال کے ہم جماعت تھے۔

ان کا آبائی مکان اقبال منزل کے بالمقابل تھا لیکن جب انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو وہ اسلام آباد (موجودہ محلہ ملا کمال) میں شاہی مسجد کے عقب میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ان کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر محلہ دہاروال میں علامہ غلام قادر فصیح کا پریس تھا۔ اڈہ پسروریاں کی طرف جاتے ہوئے اسماعیلیوں کا بر صغیر کا قدیم ترین جماعت خانہ ہے۔ اس جماعت خانے کے بالمقابل لیڈی اینڈرسن گرلز ہائی اسکول واقع ہے جہاں محترمہ فاطمہ جناح ۱۹۵۴ء میں تشریف لائی تھیں۔ اس اسکول کے قریب ہی صدر دروازے کی طرف جاتے ہوئے سیدھے ہاتھ پر ایک چار دیواری کے اندر سائیں عبداللہ کا مزار ہے جو شیخ نور محمد کے پیر بھائی تھے اور ان کی زندگی میں شیخ نور محمد کے مرشد حضرت سلطان العارفین قاضی سلطان محمود صاحب تشریف لاتے تو ننھے اقبال کو میاں نور محمد بازوؤں میں اٹھائے لائے تو قاضی صاحب نے اپنا لعاب دہن ان کے منہ میں ڈالا۔ قاضی سلطان محمود صاحب وقتاً" فوقتاً" اپنے مریدوں سے ملنے گجرات سے تشریف لاتے تو مزید برکات کے حصول کے لئے اپنے بچوں کے لئے خصوصی دعائیں کرواتے۔

حاجی صاحب لائبریری میں لائبریرین کے فرائض انجام دینے کے علاوہ راشن ڈپو کے مالک تھے اور اچھی گزران ہو جاتی تھی۔ علامہ اقبال لائبریری کے موجودہ چودھری ریاست علی لائبریرین ان کے شاگرد رہے ہیں۔ سیالکوٹ سے تبادلے کے

بعد وہ مری چلے گئے اور مری سے ہی پنشن پانے کے بعد وہ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن قریشی کے پاس کراچی چلے آئے۔

حاجی صاحب میرے بیٹے وقار اقبال اور بہو زرناز کو قرآن ناظرہ پڑھاتے تھے اور مختلف تقریبات میں آتے جاتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں آفتاب اقبال کی وفات پر وہ نہ پہنچ پائے تو مجھے ان کی فوتیدگی کا شک گزرا۔ بعد ازاں تحقیق سے پتا چلا کہ واقعی ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو رحلت فرما گئے اور محمود آباد نمبر ۵ کے قدیم قبرستان میں دفن ہوئے اور حاجی عبدالسلام کے پوتے، پوتیاں، نواسے اور نواسیاں تقریباً کراچی ہی میں مقیم ہیں۔

علامہ اقبال لائبریری کے لائبریرین چودھری ریاست علی نے اپنے خط میں بتایا ہے کہ انہیں میونسپل کمیٹی کے ریکارڈ سے تاریخ پیدائش کا سراغ نہ مل سکا اور یوں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ ہے۔ لیکن اتنا طے ہے کہ وہ حاجی صاحب کی دو صاحبزادیاں اور ایک لڑکا عبدالرحمٰن قریشی محمود آباد کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے صاحبزادے بھی انتقال فرما چکے ہیں۔

حافظ عبدالسلام صاحب

مظہر علی علوی ایڈووکیٹ

۱۹۴۳ء میں کلکتہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس شہر خوبی میں ایسے ایسے احباب سے واسطہ پڑا کہ ان کی تقریباً" دو سالہ شناسائی کا دور تجدید ۱۹۴۷ء میں ہوا' اور پھر بٹوارے کے بعد کراچی میں مستقل قیام نصیب ہوا اور دوستی کا بندھن زیادہ مضبوط ہوا۔ بعض اوقات ایسے شریف النفس لوگوں کی یاد آتی ہے تو آنکھوں کے سامنے کلکتہ اور کراچی میں گزارے' ایام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اس قحط الرجال کے دور میں علوی جیسے لوگوں کا میسر آنا بالکل ناپید ہے۔ اب تو لوگ ایک دوسرے سے کسی غرض کے تحت دوستی کا عہدو پیمان باندھتے ہیں اور جوں جوں مطلب براری کے مواقع میسر نہ ہوں ان کی عارضی دوستی اور وفاداری کے سب وعدے جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔

علوی صاحب سے ہماری دوستی کا آغاز کلکتہ کی سرزمین سے ہوا اور اس دوستی میں استحکام ہی پیدا ہوا' کسی رخنے اور بدمزگی کا سوال پیدا نہ ہوا۔

یہ جوڑا اولاد سے محروم رہا' لیکن ان کا گھریلو برتاؤ بے مثال تھا اور ان کے مزاج میں تلون مزاجی نام کو نہیں تھی۔ دوستوں کو ٹوٹ کر چاہتے تھے اور پرانے روابط کو برقرار رکھنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔

کلکتہ کے ابتدائی ایام میں ، میں ریندھے پکانے کے کام سے ناواقف تھی۔ ہماری اس خامی کا ایک پنجابی گھرانے کو علم ہوا تو وہ بے چارے دو وقت کا کھانا تیار کر کے ہمارے گھر بھجوا دیتے تھے۔ اس دوران میرے دل میں سخت ندامت کا جذبہ ابھرا اور میں نے بذات خود کھانے پکانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔

بہر کیف علوی صاحب سے ہمارے مراسم علامہ اقبال کے محب صادق کی حیثیت سے پروان چڑھے۔ وہ ایک کامیاب وکیل کے ساتھ ساتھ ایک عاشق اقبال بھی تھے انہوں نے علامہ اقبال کے کلام پر بڑی گہری نظر ڈالی تھی اور فارغ لمحات میں وہ اقبال کے کلام پر اپنے طور پر ایک مبسوط مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ یہ مضمون ایک کتابی صورت اختیار کر گیا۔

اس کتاب کا مسودہ ایک بوسیدہ سی نوٹ بک میں میرے پاس موجود ہے۔ اس انگریزی کتاب کے مسودے میں فارسی اشعار جابجا خوبصورت انداز میں ٹانکے ہیں کہ ان کی اقبال شناسی کا قائل ہونا پڑتا ہے اور بنیادی طور پر اس کتاب میں وہ انگریزی خواں طبقے میں کلام اقبال کی تشریح بڑے پیار سے انداز میں کرتے ہیں۔ ہمارے دور کے اکثر انگریزی خواں فارسی زبان کی ابجد سے نابلد ہیں۔ ان کی یہ تالیف اس نقطہ نظر سے بڑی اہم ہے اور اب وکالت سے متعلق حضرات کا علم اتنا سطحی ہوتا ہے کہ وہ کسی عمیق اور گہری تحقیقی کتاب کی تصنیف کا بھی نہیں سوچ سکتے۔

۱۹۴۷ء میں وہ کلکتہ سے لٹ پٹ کر کراچی پہنچے اور کراچی میں وہ محمود آباد کے علاقے میں ایک کشادہ اور صاف ستھرے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے بہنوئی عباسی صاحب کسٹم کے محکمے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور کوئنز روڈ پر رہائش پذیر تھے۔ اکثر تقاریب میں ان کے عزیز و اقارب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

کرم سنگھ اہلوو الیہ

اہلوو الیہ صاحب سے آفتاب اقبال صاحب کے بچپن ہی سے دوستانہ مراسم تھے۔

امرت سر کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور جب میں آفتاب اقبال صاحب سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی تو مجھے اہلووالیہ کے گھر لے گئے۔ اہلووالیہ کی ماں اور بیوی نے ہمارا شایان شان طریقے سے استقبال کیا۔

علامہ اقبال کے انتقال پر اہلووالیہ صاحب نے لاہور کے ٹاؤن ہال میں علامہ اقبال کے تعزیتی جلسے سے خطاب کیا اور اس دور میں پڑھے لکھے لوگ انگریزی زبان میں دسترس رکھتے تھے اور بے تکان لکھنے اور بولنے میں انگریزی کا استعمال کیا کرتے تھے۔ مغلیہ دور پر انگریزی زبان میں بڑی ضخیم کتابیں بڑے بڑے سرداروں نے تحریر کی ہیں۔ میں اس مضمون کے آخر میں بھائی صاحب کی ٹاؤن ہال والی تقریر نقل کر رہی ہوں تاکہ علامہ اقبال کے بارے میں غیر مسلم اہل علم کا کیا نظریہ تھا اور وہ علامہ کی خداداد صلاحیت شاعری کے دل و جاں سے معترف تھے اور ان کو خراج عقیدت پیش کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد اہلووالیہ صاحب انگلستان چلے گئے اور وہاں انہوں نے ایک انگریز عورت سے شادی کرلی۔ وہ عورت بڑی سلیقہ شعار تھی اور اس نے اپنی سوکن کے بیٹوں کو انگلستان بلوالیا اور انہیں بہتر طریقے سے تعلیم و تربیت دی اور یوں دونوں کی اولاد انگلستان میں پروان چڑھی۔

۱۹۶۴ء میں اپنے بچوں کے داخلے کے سلسلہ میں جب وکٹوریہ نامی بحری جہاز سے ہم عازم انگلستان ہوئے تو لندن میں ہماری اہلووالیہ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ اہلو والیہ صاحب میں تعصب نام کو نہیں تھا۔ وہ ہنسی مزاح کے دلدادہ تھے اور اپنی نجی محفلوں میں لطیفوں اور چٹکلوں سے محفل کو کشت زعفران بنادیتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ انسانیت اور ہمدردی کا برتاؤ روا رکھتے تھے اور مجبور آدمی کسی عقیدے اور مذہب کا پیروکار ہو اہلووالیہ صاحب ایسے لوگوں کی اعانت اور مدد اپنا انسانی فریضہ سمجھتے تھے اور

انگلستان کے قیام کے دوران وہ اکثر و بیشتر ہمارے ہاں آجاتے تھے اور پھر آفتاب اقبال اور اہلو والیہ کے درمیان گھنٹوں ادبی اور سیاسی باتوں کا دور چلتا اور پردیس میں ہم اپنے آپ کو پاک و ہند کے کسی شہر کے باسی محسوس کرتے۔

آفتاب اقبال صاحب اپنے ذاتی کاروبار کی وجہ سے انگلستان آتے جاتے رہتے تھے اور ان کی اہلو والیہ صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

میں کتابوں میں پڑھتی تھی کہ خواجہ حسن نظامی کے مریدوں میں ہندو بھی تھے تو مجھے حیرت ہوتی تھی اور خواجہ صاحب نے اپنی کتاب مادر ہم درد مطبوعہ ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا ہے کہ حیدر آباد دکن کے راجہ شاد کی مسلمان بیویوں سے مسلمان نرینہ اولاد تھی اور ہندو عورت سے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اور ان کا وارث صرف ہندو بیٹا ہی ہو سکتا تھا۔ شاد صاحب نے خواجہ حسن نظامی سے بیٹے کے لئے دعا کروائی تو اللہ نے انہیں ایک فرزند عطا فرمایا اور اس کا آدھا نام خواجہ صاحب کا ہے اور آدھا نام شاد صاحب کا یعنی خواجہ پرشاد۔

یہ واقعہ اس لئے نقل کیا تاکہ اہلو والیہ صاحب کے سلسلے میں ایک واقعہ کی صداقت کا آپ کو یقین ہو سکے۔ بھائی صاحب کہا کرتے تھے کہ میرے شیخ یوں فرماتے تھے اور ایک آدھ بار انہوں نے مرشد کا نام اور ان کی جائے رہائش کا بھی تذکرہ کیا تھا جو امتداد زمانہ سے میرے ذہن سے اتر چکا ہے۔

ایک دفعہ انہوں نے سر منڈوا دیا اور ہمارے گھر آئے تو میں نے استفسار کیا کہ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ فرمانے لگے: بہن جی (، داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ مسجد اور (سر کی طرف اشارہ کرنے) یہ مندر ہے۔ وہ ہمارے ہاں گوشت کھا لیتے تھے۔ اب ہمارے ہاں انسانیت کی سطح پر دوسرے انسانوں سے سلوک بالکل مفقود ہے

-حالانکہ اگر ہم غیر مذاہب سے بہتر سلوک روا نہیں رکھیں گے تو ہماری تبلیغی مساعی ختم ہو جائیں گی۔

اسلام کی عالمگیریت کا تقاضا ہے کہ اس کے ماننے والے دوسروں تک میل ملاپ کے ذریعہ پیغام پہنچائیں اور انہیں اسلام کی طرف راغب کریں۔ یوں دنیا میں اسلام کی اشاعت سے دوسرے مذاہب کے لوگ خود بخود حلقہ اسلام میں داخل ہوں گے اور اسلام کے دشمنوں میں کمی کا رجحان بڑھے گا۔

۲۱ فروری ۱۹۷۸ء میں ہماری لندن موجودگی کے وقت وہ اچانک سورگباشی ہو گئے۔
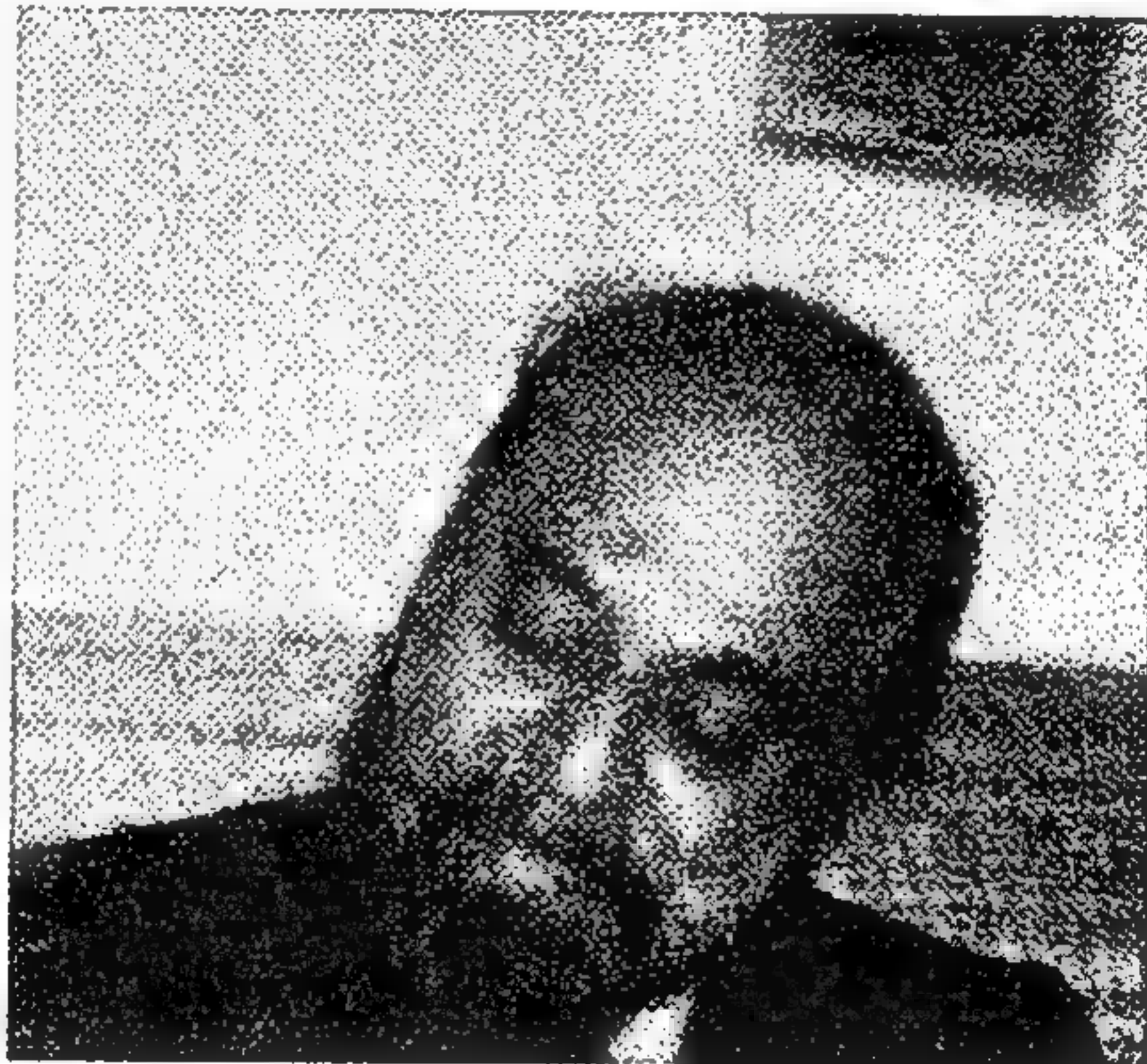
سردار کرم سنگھ اہلووالیہ صاحب

۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۸ء تک نصف صدی پر محیط تحریروں سے انتخاب پیش نظر ہے۔ علامہ اقبال کے فرزند اکبر آفتاب اقبال کے بارے میں معلومات کا دائرہ اتنا پھیلا ہے کہ اب میں اس مضمون میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ نہیں کر رہی جبکہ آج سے پچاس سال پہلے آفتاب اقبال کا صرف نام ہی لکھنے پر اکتفا کیا گیا۔

(رشیدہ بیگم)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱) "اقبال کامل"، مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی۔

مقام اشاعت: اعظم گڑھ سن اشاعت: ۱۹۴۸ء۔

اس کتاب میں ایک باب "آل اولاد" کے لئے وقف ہے۔ ۴۶ سے ۵۲ صفحات پر اولاد کا تذکرہ ہے۔ لیکن پہلی بیوی کے حوالے سے صرف ایک مرتبہ "آفتاب اقبال" کا نام لیا ہے۔

(۲) "روزگار فقیر"، مصنفہ فقیر سید وحید الدین۔ نقش اول: ۱۹۵۰ء اشاعت دو ہزار

نقش ثانی: ۱۹۶۳ء اشاعت ایک ہزار

صفحات: ۲۵۶ قیمت: سات روپے پچاس پیسے

صفحہ ۲۰۲

ڈاکٹر جاوید اقبال

ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) نے گجرات، لاہور اور لدھیانہ کے گھرانوں میں شادیاں کیں۔ پہلی بیوی بیرسٹر آفتاب اقبال کی والدہ تھیں جن کا انتقال مارچ ۱۹۴۷ء میں ہوا اور دوسری بیوی نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ تیسری بیوی لاہور کی تھیں۔ ان کے بطن سے جاوید اور منیرہ پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء میں ہوا تو جاوید سلمہ کی عمر گیارہ سال اور منیرہ کی عمر پانچ برس کی تھی۔ جاوید اور منیرہ کی عمر میں چھ سال کی چھوٹائی بڑائی ہے۔ جاوید ۱۹۲۴ء میں اور منیرہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئی۔

 ☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۳) "ذکر اقبال" مصنفہ مولانا عبدالمجید سالک

سن اشاعت: ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۵

علامہ اقبال میٹرک کے امتحان سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد ماجد نے جب کہ وہ عمر کی بیسویں منزل میں تھے شادی کر دی۔ دلہن ایک دولت مند بزرگ کی لڑکی تھیں۔ اقبال کی یہ شادی ناکام ہوئی۔ اگرچہ انہوں نے نباہ کی بے حد کوشش کی اور اس بیوی سے ایک لڑکی مریم اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ لیکن زوجین میں میل کا امکان کم ہوتا گیا اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۴) " خدوخال اقبال "، مصنفہ محمد امین زبیری

سال تصنیف: ۱۹۵۵ء

سال اشاعت: ۱۹۸۶ء قیمت: ۳۰ روپے صفحات: ۷۶ ناشر: خسروی

صفحہ ۱۳

متاہل زندگی

فاضل مصنف نے "ذکر اقبال "، کے مصنف کے حوالے سے معلومات دی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اس کتاب میں صفحہ ۱۳ ہے اور ماحولہ کتاب میں معلومات صفحہ نمبر ۱۵ پر دی گئی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۵) "اطراف اقبال"، مصنف پروفیسر ملک حسن اختر

بار اول: ۱۹۷۲ء

صفحات: ۳۸۴

صفحہ ۱۴

اس زمانے میں میٹرک کا سینٹر سیالکوٹ میں نہیں تھا۔ اس لئے آپ امتحان دینے گجرات گئے۔ وہاں کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد صاحب نے انہیں دیکھا تو پسند فرمایا۔ اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی۔ اس بیوی سے ان کے دو بچے ہوئے معراج بیگم اور دوسرے آفتاب اقبال۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۶) "دائرہ معارف اقبال"، مصنفہ پروفیسر ملک حسن اختر

بار اول: ۱۹۷۷ء

آج سے انیس سال پہلے یہ کتاب لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں موجود تھی اور اب "اقبالیات" کے تحت کیٹلاگ میں بہت ہی کم کتابوں کا اندراج ہے۔ لہذا تفصیل سے گریز کر رہی ہوں۔ آفتاب اقبال کے انتقال پر ماسٹر اکرام نے روزنامہ "حریت" میں مدیر کے نام مراسلے میں آفتاب اقبال کے بارے میں معلومات کے لئے اسی کتاب سے استفادہ کیا تھا اور ۱۹۷۷ء میں اس سے زیادہ معلومات صرف مولانا حامد جلالی مرحوم کی کتاب "علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" میں موجود تھیں جو اس کتاب سے دس سال پیشتر کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۷) "اوراق گم گشتہ "، مصنفہ رحیم بخش شاہین ایم۔ اے

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور اشاعت: اپریل 1975ء قیمت: ۲۸ روپے

صفحہ ۳۹۹

علامہ اقبال وفات پا گئے۔

روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ "، لاہور بابت ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کی رحلت پر یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا ترجمہ ہفت روزہ "چٹان "، لاہور مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء میں "ہمدرد ڈائجسٹ "، کے حوالے سے شائع ہوا۔ صفحہ ۴۰۰

چوتھا پیراگراف۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک چھ سالہ بیٹی اور دو صاحبزادے شامل ہیں۔ جن میں ایک بیرسٹرایٹ لاء ہے اور دوسرا ابھی زیر تعلیم ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۸) "اقبال سب کے لئے "، مصنفہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری

طبع اول: ۱۹۷۸ء

تعداد: ۱۱۰۰ قیمت: ۳۵ روپے

صفحہ ۱۵

اقبال کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں جبکہ ان کی عمر بمشکل سولہ سال تھی، گجرات کے رئیس خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی جن سے ایک بیٹی

مریم اور ایک بیٹا بیرسٹر آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ یہ شادی معاشرتی زندگی کے لئے کامیاب ثابت نہ ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۹) "دانائے راز،،

سن اشاعت: ۱۹۷۹ء سید نذیر نیازی ناشر: اقبال اکادمی ،لاہور۔

قیمت: ۷۵ روپے

ازدواج

۱۸۹۳ء میں محمد اقبال اینٹرینس کے امتحان میں بیٹھے۔ امتحان کے لئے گجرات جانا پڑا۔ سیالکوٹ امتحان کا مرکز نہیں تھا۔ گجرات میں بھی سیالکوٹ کی طرح بہت سے کشمیری خاندان آباد تھے۔ ان میں ڈاکٹر شیخ عطا محمد کا خاندان بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب محلہ شالبافاں میں رہتے تھے۔ شہر میں اس خاندان کی بڑی عزت تھی۔ شیخ صاحب نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ملازم ہوگئے۔ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدوں پر جا پہنچے۔ جدہ اور کامران میں سرکار برطانیہ کی طرف سے نائب قونصل رہ چکے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں خان بہادر کا خطاب پایا۔ ۱۸۷۹ء میں وائسرائے کے اعزازی سرجن مقرر ہوئے۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا۔ ان کی بڑی صاحبزادی جن سے محمد اقبال کی شادی ہوئی شاید جدہ یا کامران ہی میں پیدا ہوئیں۔ وہیں پرورش پائی۔ عربی بولتی اور سمجھتی تھیں ۔ شیخ صاحب بڑے دین دار ،بڑے عبادت گزار اور نیک انسان تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے ۱۸۹۱ء میں کامران سے واپس آئے۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں سول سرجن تعینات رہے۔ ان کا شمار میڈیکل اسکول ،اب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے

اولین سند یافتہ طلباء میں ہوتا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں بعمر ۶۳ سال وفات پائی۔

شیخ صاحب کی صاحبزادی کا رشتہ محمد اقبال سے کیسے ہوا یہ ٹھیک معلوم نہیں۔ اگر شیخ صاحب نے ۱۸۹۸ء کے بعد سیالکوٹ میں بھی ملازمت کا کچھ وقت گزارا تو یقینی بات ہے کہ میر حسن کے علم و فضل کی شہرت انہیں میر حسن کی خدمت میں لے گئی ہو گی۔ ان سے نیاز مندانہ روابط ہوں گے۔ یوں شیخ نور محمد صاحب سے بھی ملاقات کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ ان سے روابط بڑھے تو میر حسن کے توسط سے رشتہ طے پا گیا یا ان بزرگوں نے خود ہی بات چیت شروع کر دی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو جیسا کہ شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے ایک صاحب جو سیالکوٹ میں ملازم تھے اور جن کے دونوں خاندانوں سے مراسم تھے انہوں نے اس رشتے کی تحریک کی۔ سیالکوٹ اور گجرات کے کشمیری خاندانوں میں یوں بھی رشتے ناطے کا سلسلہ جاری تھا۔ بہر حال ۱۸۹۳ء میں یا اس سے کچھ پہلے محمد اقبال کی نسبت شیخ صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ٹھہر گئی اور اسی سال محمد اقبال کی بارات سیالکوٹ سے گجرات پہنچی۔ طرفین کے اعزاء اور دوستوں نے شرکت کی۔ عقد نکاح کی تاریخ ۵ مئی ۱۸۹۳ء ہے۔ حکیم کرم دین محمد اقبال کی بڑی ہمشیرہ کے خسر، سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان کے بزرگ حاجی نور محمد جن کے بھتیجے میر فضل دین کی شادی شیخ نور محمد کی بھتیجی سے ہوئی اور چند ایک اور احباب کے علاوہ میر حسن بارات میں شامل تھے۔ شادی کی رسم دھوم دھام سے منائی گئی۔ گانے کی محفل جمی۔ بزرگوں نے ایک بند کمرے میں اساتذہ اور خواجہ حافظ کا کلام سنا۔ اینٹرنس میں محمد اقبال کی کامیابی کی خبر بھی دوران تقریب ہی میں گجرات پہنچی۔ بارات ایک رات گجرات ٹھہری۔ دوسرے روز محمد اقبال دلہن کو لے کر سیالکوٹ آ گئے۔ اعزا واقربا اور دوستوں نے خوش آمدید کہا۔ مبارکباد دی۔ محترمہ کریم بی بی بیان کرتی ہیں دو

ایک روز بڑی رونق رہی۔ ہم بار بار دلہن دیکھنے جاتیں۔ ۱۸۹۸ء میں آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ پھر معراج بیگم، محمد اقبال کو اس بچی سے بڑی محبت تھی۔ معراج بیگم ۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کم عمری میں فوت ہو گئیں۔

۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۵ء تک محمد اقبال سیالکوٹ ہی میں رہے۔ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک دوران ملازمت میں جب بھاٹی دروازہ میں قیام تھا والدہ آفتاب اقبال ان کے ساتھ لاہور نہیں آئیں۔ سیالکوٹ ہی میں رہیں یا پھر گجرات اور گجرات سے سیالکوٹ آنا جانا رہتا۔ محمد اقبال بھی لاہور سے اکثر سیالکوٹ جاتے بلکہ گجرات بھی۔ اسی زمانے کی ایک غزل ہے:

ہو گیا اقبال قیدی محفل گجرات کا
کام کرتے ہیں یاں انسان بھی صیاد کا

معلوم ہوتا ہے بیوی سے کشیدگی کی ابتدا انہی دنوں میں ہو گئی تھی۔ یورپ سے واپسی کے بعد اگرچہ وہ احیاناً" لاہور آتیں۔ محمد اقبال ان کا بڑا خیال رکھتے، مگر ایک دوسرے سے کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ تا آنکہ باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود مکمل علیحدگی کی نوبت آگئی۔ یہ زمانہ محمد اقبال کے لئے بڑے اضطراب کا تھا۔ بغیر طلاق کے چارہ کار نہ رہا۔ لیکن والدہ آفتاب کی عزت نفس نے گوارا نہ کیا۔ محمد اقبال کفالت کے ذمہ دار ٹھہرے۔ فرمایا شرعاً" میرے سامنے دو ہی راستے تھے طلاق یا کفاف کی ذمہ داری۔ والدہ آفتاب اقبال طلاق پر راضی نہ ہوئیں علامہ نے بخوشی کفالت کی ذمہ داری قبول کرلی۔ چنانچہ ایک مقررہ رقم ہر مہینے بھیج دیتے۔ حتیٰ کہ آخری علالت کے دوران میں بھی یہ رقم باقاعدہ روانہ کی جاتی۔ پھر جب علالت نے طول کھینچا اور مالی دشواریاں بڑھیں

تو اس میں تخفیف کرنا پڑی۔ لیکن رقم کی ترسیل میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری منی آرڈر میرے ہاتھوں سے ہوا۔ میں نے تعمیل ارشاد کر دی۔

محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں طرح طرح کی افسانہ طرازیاں کی گئیں جو سب کی سب غلط ہیں۔ بیشک یہ شادی ناکام رہی لیکن اس کی ایک ہی وجہ تھی اور وہ طبائع کی عدم مناسبت علی ہذا خاندانی حالات میں تفاوت، میں سمجھتا ہوں رشتہ عجلت میں طے ہوا۔ طرفین نے اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ محمد اقبال نے لاکھ کوشش کی کہ نباہ کی کوئی صورت نکل آئے مگر بات نہ بنی۔ ایک تو والدہ آفتاب کا انداز طبیعت دوسرے آفتاب اقبال کی روش، حالات بگڑتے چلے گئے۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ کی کوششیں بھی کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل آئے ناکام رہیں۔ محمد اقبال چونکہ اس معاملے میں حق بجانب تھے۔ لہذا شاہ صاحب اور ان کے دوستوں نے ان کی انصاف پسندی کو دیکھتے ہوئے پھر کبھی اس میں دخل نہیں دیا۔ انہیں احساس تھا کہ محمد اقبال کی وسعت قلب اور خیر اندیشی کے باوجود ان کی باتوں کو ٹھکرایا جا رہا ہے۔ یہ ناگوار صورت حالات بالآخر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ سوانح نگار کی ذمہ داری اس باب میں اگرچہ اس سے زیادہ نہیں کہ اس شادی نے جو بھی صورت اختیار کی اس کی ناکامی کے حقیقی اسباب، علی ہذا اس باب میں طرفین کی جو روش رہی، بقدر ضرورت ٹھیک ٹھیک بیان کر دے۔ شادی ایک نجی معاملہ ہے۔ کئی شادیاں ناکام رہتی ہیں جن میں میاں بیوی اور ان کے اعزا و اقربا چھوٹی بڑی کئی ایک ناانصافیوں اور غلطیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ اس قسم کے نجی بلکہ انتہائی نجی معاملات میں بے جا تجسس، قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں سے احتراز ہی واجب ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض طبائع کسی ذاتی مخالفت یا نفسیاتی محرک کے زیر اثر اس میں طرح طرح سے مین میخ

نکالتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ملامت کرتے اور سنی سنائی باتوں کی بنا پر بڑے غلط نتائج قائم کر لیتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی "جس طرح شرفا کے محلے میں بعض اوباش ہوا کرتے ہیں جن کا کام تاکنا جھانکنا ہوا کرتا ہے ، اسی طرح کچھ ادبی اوباش ہوتے ہیں جن کی ساری دلچسپی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی خالص شخصی زندگی کا کھوج لگایا جائے اور اسے مزے لے لے کر نمک مرچ لگا کر بیان کیا جائے "۔ محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں بھی اکثر ایسی باتیں کہی گئیں جو سر تا سر بے بنیاد ہیں۔ جہاں تک راقم الحروف کی ذاتی معلومات کا تعلق ہے اسے یہ کہنے میں باک نہیں کہ عمداً" نہ سہی ، بہ سبب نامناسبت مزاج اور افتاد طبیعت گجرات نے اس معاملے میں جو روش اختیار کی سر تا سر غلط تھی۔ آفتاب اقبال بھی بہک گئے۔ باپ کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ الزام تراشیوں سے کام لیا گیا۔ بہر حال یہ امر قابل ذکر ہے اور یوں بہت سی غلط فہمیوں اور بے سر و پا روایات کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ محمد اقبال کے برادر نسبتی کپتان شیخ غلام محمد کے صاحبزادے شیخ محمد مسعود سے ، جن کا افسوس ہے جوانی ہی میں انتقال ہو گیا ، راقم الحروف کے ذاتی تعلقات تھے۔ شیخ محمد مسعود محمد اقبال کی گود میں کھیلے۔ علی بخش ان کا بڑا خیال رکھتا۔ مسعود مرحوم اور ان کے اعزا نے کبھی ان کے خلاف زبان شکایت نہیں کھولی۔ راقم الحروف کا ان سے شب و روز کا ملنا تھا۔ انہوں نے اپنے پھوپھا کا ذکر ہمیشہ عزت اور احترام سے کیا۔ کرنل خواجہ عبدالرشید بھی کہ ان کے قرابت داروں میں ہیں ، لکھ چکے ہیں کہ محمد اقبال والدہ آفتاب کا بڑا خیال رکھتے۔ ان کی عزت کرتے۔ ڈاکٹر محمد باقر والدہ آفتاب کے قریبی عزیز بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔ والدہ آفتاب کا انتقال ۲۰ نومبر ۱۹۴۶ء میں ہوا۔

ہبہ نامہ اور وصیت پر بھی محض اعتراض کی خاطر اعتراض کیا گیا۔ ان میں کوئی

بات خلاف شریعت نہیں ہے۔ نہ ان سے کسی کی حق تلفی مقصود۔ اعتراض یہ ہے کہ وصیت میں آفتاب اقبال کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ محمد اقبال نے نظر بر حالات جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ موصی کو یوں بھی اختیار ہے جس کے حق میں چاہے وصیت کرے۔ بشر طیکہ اس طرح کوئی ناانصافی نہ ہو۔ چنانچہ آفتاب اقبال کی کسی پہلو سے حق تلفی نہیں ہوئی۔ وہ خود ہی باپ سے کٹ چکے تھے۔ یہی معاملہ ہبہ نامے کا ہے جس کا ذکر آگے چل کر پھر آئے گا۔

آفتاب اقبال کراچی میں مقیم بڑے اطمینان اور آسودگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں بیرسٹر ہیں۔ انگلستان میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پائی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۰) "تلاش اقبال" مصنفہ خالد حامدی۔

طبع اول: اکتوبر ۱۹۸۰ء

مقام اشاعت: دہلی (بھارت) صفحہ ۲۴۵

حیات اقبال

ایک اجمالی جائزہ صابر کلوروی

صفحہ ۲۵۴

اقبال کی ازدواجی زندگی

ابھی میٹرک کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ اقبال کی شادی کریم بی بی سے کر دی گئی۔ یہ خاتون گجرات کے ایک ڈاکٹر عطا محمد خان کی دختر تھیں۔ ۱۸۹۵ء میں علامہ اقبال کی پہلی اولاد ہوئی جس کا نام معراج بیگم رکھا گیا۔ یہ لڑکی اپنے والد کا ہو بہو نقشہ تھی۔ لیکن اسے کنٹھ مالا نے آلیا اور اسی بیماری میں مبتلا رہ کر ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ ۱۸۹۹ء

میں آفتاب اقبال تولد ہوئے۔ باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آفتاب اقبال نے فلسفہ پڑھا ۱۹۲۳ء میں انہوں نے لندن یونیورسٹی سے بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پھر اسی یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور پھر لندن یونیورسٹی سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ آج کل کراچی میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۱) "اقبال کے ہم نشین" مصنفہ پروفیسر صابر کلوروی

سال اشاعت: اکتوبر ۱۹۸۵ء

قیمت: ۴۰ روپے صفحات: ۲۸۳ صفحہ ۲۵۸

حواشی:

آفتاب اقبال . . . . . علامہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی کی دوسری اولاد ،ولادت ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۱ء میں لندن سے بیرسٹری کی۔ کلکتہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر بھی رہے۔ ۱۹۴۱ء تک اسلامیہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر کے طور پر کام کیا ۔ ۱۹۴۲ء میں وکالت کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے فوراً" بعد کراچی منتقل ہو گئے اور تادم وفات یہیں پریکٹس کرتے رہے۔

چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔ آفتاب اقبال اور ان کی والدہ کے تعلقات علامہ سے کشیدہ رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۴) "مکالمات اقبال" مصنفہ سعید راشد

اشاعت: ۱۹۸۸ء

قیمت: مجلد دو سو روپے صفحات: ۴۸۶

بک کارنر پبلشرز، بک سیلرز، مین بازار، جہلم پاکستان صفحہ ۱۱۰

سلسلہ ازدواج

علامہ کی پہلی شادی میٹرک پاس کرنے کے فورا" بعد ۱۸۹۳ء میں گجرات کے سول سرجن ڈاکٹر عطا محمد خان کی بیٹی مریم بی بی سے ہوئی۔ یہ والدین کی پسند کی شادی تھی۔ ان سے علامہ کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا آفتاب اور ایک بیٹی معراج بیگم، بد قسمتی سے اس پہلی بیوی سے علامہ کا نباہ نہ ہو سکا۔ دونوں بچے زیادہ تر ننھیال ہی میں رہتے تھے۔ معراج بیگم نے اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ آفتاب سے ہی اجنبیت رہی۔ علامہ کی زندگی تلخ ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں انہوں نے دوسری شادی کا ڈول ڈالا۔ ابھی نکاح ہی ہوا تھا کہ اس رشتے میں پیچیدگیاں پڑ گئیں چنانچہ تیسرا نکاح کرنا پڑا۔ پھر حسن اتفاق سے دوسرے رشتے کے معاملات سلجھ گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۴) "حیات اقبال ایم۔ ایس ناز"

قیمت: ۴۰روپے صفحات: ۱۷۳ سن اشاعت: ندارد

شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

صفحہ ۵۰

آفتاب اقبال

آفتاب اقبال پنڈدادن خان ضلع شاہ پور میں ۱۸۹۹ء میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان دنوں ڈاکٹر عطا محمد خان تعینات تھے۔ آفتاب نے ابتدائی تعلیم اسکاچ مشن ہائی اسکول میں حاصل کی۔ پھر آپ کو سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخل کرادیا گیا جس کے پرنسپل اس زمانے میں ایس کے ردرا تھے۔ آفتاب اقبال کو مسٹر این کے سین پی۔این۔ مکرجی اور سی۔ ایف اینڈریوز ایسے علمی شہرت رکھنے والے پروفیسروں سے فلسفہ اور دیگر مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں سے آفتاب اقبال نے بی اے آنرز کا امتحان فلسفہ میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۲۱ء میں ان ہی اساتذہ کی سرپرستی میں فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ پھر آپ کو لندن بھیج دیا گیا۔ جہاں سے آپ نے ۱۹۲۴ء میں تحقیقات فلسفہ میں ماسٹر آف دی آرٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک آپ مدرسہ السنہ شرقیہ لندن یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے لیکچرار رہے۔ ۱۹۳۱ء میں لنکن ان لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور وطن واپس آگئے۔ بعد ازاں ۱۹۳۶ء تک اسلامیہ کالج کلکتہ میں انگریزی زبان وادب اور یونیورسٹی آف کلکتہ میں فلسفہ کے لیکچرار رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائی کے دفتر میں آپ سے دو سال تک ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام لیا گیا۔ پھر آپ ۱۹۴۱ء تک اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی زبان وادب کے لیکچرار کی حیثیت سے

کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی اور بعد ازاں کراچی میں پریکٹس کرتے رہے۔

آفتاب اقبال کی اہلیہ محترمہ رشیدہ بیگم ہیں، جو شاہ جہاں کے عہد کے سپہ سالار مرزا دولت بیگ کی اولاد سے ہیں۔ رشیدہ بیگم کے والد بزرگوار مرزا روشن بیگ جب برما میں تھے تو یہیں وہ پیدا ہوئیں۔ ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ آفتاب اقبال کی رفیقہ حیات بنیں۔ ان کے بطن سے تین صاحبزادے ہیں۔ آزاد اقبال، نوید اقبال اور وقار اقبال۔ والدہ آفتاب اقبال حضرت علامہ اقبال کی وفات کے آٹھ سال بعد تک زندہ رہیں، اور ۱۹۴۶ء میں انہوں نے وفات پائی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۵) "رجال اقبال" عبدالرؤف عروج۔

اشاعت: ۱۹۸۸ء

ضخامت: ۵۱۶ صفحات

قیمت: ۱۵۰ روپے

ناشر: نفیس اکیڈمی، اردو بازار کراچی

آفتاب اقبال

یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ آفتاب اقبال نے اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی قدر و منزلت کی اور یوم اقبال کی تقریبات کے ذریعے ان کی شاعری اور پیغام کو عام کرنا چاہا۔ آفتاب اقبال، اقبال کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کی والدہ کریم بی بی، خان بہادر شیخ عطا محمد کی صاحبزادی تھیں جن کو حجاز مقدس میں تولد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آفتاب اقبال ۲۳ جون ۱۸۹۸ء کو ضلع شاہ پور کے ایک قصبہ پنڈ دادن خان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں پائی، ۱۹۱۶ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے میٹرک کیا۔ اس کے ساتھ مولوی میر حسن سے پند نامہ فرید الدین عطار اور فارسی کی دوسری کتابیں پڑھیں، پھر اسٹیفن کالج دہلی سے بی اے کیا اور اپنے نانا خان بہادر شیخ عطا محمد کی خواہش پر اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن چلے گئے۔ وہاں سے فلسفہ میں ایم اے کرنے کے بعد لندن یونیورسٹی کے شعبہ السنہ شرقیہ میں اردو لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ۱۹۲۴ء میں لاہور آکر محکمہ تعلیم میں ملازم ہونا چاہا حسب حال ملازمت نہ مل سکی تو دوبارہ لندن جاکر قانون پڑھا اور بیرسٹری کی سند لی۔ ۱۹۳۱ء میں وکالت کے ارادے سے لاہور پہنچے۔ اقبال نے ان کی سرکشی کی بناء پر ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اقبال کے دوستوں سے اخلاقی مدد چاہی۔

اس سلسلے میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء کو ایک خط سر اکبر حیدری کو بھی لکھا۔ سر اکبر حیدری سے اقبال کے دوستانہ تعلقات تھے انہوں نے اس سے پہلے ان ہی دوستانہ تعلقات کی بناء پر آفتاب اقبال کو لندن کے قیام کے زمانے میں مالی مدد بہم پہنچائی تھی - چنانچہ اس بار انہوں نے ان کی براہ راست مدد کرنے کی بجائے اقبال کو لکھا۔

"میں ایک نہایت اہم معاملے کی جانب آپ کو لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں، آپ کے لڑکے آفتاب اقبال نے لندن میں مجھ سے مالی مدد کی درخواست کی اور مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کی اس درخواست سے بے حد متاثر ہوا۔ اس کی غربت کی داستانیں وہاں کے مسلم طبقے میں اکثر گفتگو کا موضوع رہتی ہیں۔ اس کی حالت پر تو مجھے ترس آیا ہی تھا لیکن مجھے اس الزام پر زیادہ دکھ ہوتا ہے جو ایسی شخصیت پر لگایا جاتا ہے جس کو میں ہمیشہ سے ایک عظیم انسان اور عظیم دوست تسلیم کرتا ہوں۔ آپ کے لڑکے سے آپ کی عدم توجہی کی وجہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس کی حالی پر غور فرمائیں اور اس وقت تک اس کی مدد کریں کہ جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ آپ کو یقین رکھنا چاہئے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض دوستانہ جذبہ سے لکھا ہے۔

اقبال اور گجرات

ڈاکٹر منیر احمد سلیچ "آفتاب اقبال" آخری حصہ

آفتاب کیوں فرزند اقبال کا صحیح مقام حاصل نہ کر سکا

اگر ہم غیر جانبدارانہ طریقے سے ان عوامل کا جائزہ لیں جو آفتاب اقبال کے صحیح معنوں میں فرزند اقبال بننے کی راہ میں حائل ہوئے اور ان کی مشکلات کا باعث بنے تو درج ذیل اسباب سامنے آتے ہیں۔

شفقت پدری کی کمی

آفتاب ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ تب اقبال لاہور میں تھے۔ کبھی کبھار سیالکوٹ آتے تو ملاقات ہوتی۔ پھر اقبال تین سالوں کے لئے بیرون ملک چلے گئے۔ واپسی پر بھی زیادہ تر لاہور میں ہی رہے۔ ۱۹۱۱ء میں آفتاب کو قادیان بھیج دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں جب علامہ نے دوسری اور پھر تیسری شادی کی تو آفتاب کی ہمدردیاں قدرتی طور پر ماں کے ساتھ تھیں اور یہ دوران ان کی ذہنی پرورش کا دور تھا۔ یوں والد سے اختلاف کا بیج بویا جا چکا تھا۔ ان پندرہ سالوں میں آفتاب اگرچہ دادا کے بہت قریب رہے لیکن والد کی

شفقت اور توجہ سے محروم رہے۔ ایف اے کے بعد ملازمت کرنے کا اقبال کا مشورہ بھی آفتاب کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد اختلافات بڑھتے گئے اور اقبال کی دلچسپی کم سے کم تر ہوتی گئی۔ آفتاب جب انگلستان گئے تو علامہ کو خبر تک نہیں تھی کیونکہ انہوں نے آفتاب کے سر سے دست شفقت ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ مالی اعانت بھی بند کردی تھی۔ آفتاب کی جذباتی عمر کی نادانیوں کو اقبال اپنی شفقت سے سلجھا سکتے تھے مگر وہ تو آفتاب کے خطوط کا جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کرتے تھے۔ یوں آفتاب اس "شفقت پدری" سے محروم رہے جو "آداب فرزندی" سکھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

تایا کا درشت رویہ

اقبال کے برادر بزرگ کی سخت طبیعت سے آفتاب کبھی سمجھوتا نہ کرسکے۔ شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ وہ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان تھے۔ اولاد کی تربیت کے سلسلے وہ جسمانی سزا کے قائل تھے۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب مظلوم اقبال میں چند ایک واقعات لکھے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب بچپن میں شرارتی تھے اور شیخ عطا محمد نے کئی دفعہ انہیں اپنی سخت طبیعت کا نشانہ بنایا (۵۰۶)

ایسے میں کریم بی بی کی ایک نہ چلتی اور وہ اپنے لخت جگر کو تشدد کا نشانہ بنتے دیکھتی رہتیں۔ یہ رویہ آفتاب کے لئے قابل قبول نہ تھا کیونکہ وہ ننھیال میں شہزادوں کی سی زندگی گزارتا تھا۔

اقبال کی مزید شادیاں

شاید یہ سب سے اہم سبب تھا۔ جب اقبال نے دوسری اور پھر تیسری شادی کی تو قدرتی طور پر آفتاب کی ہمدردیاں ماں کے ساتھ تھیں۔ آفتاب نے اپنے اور اپنے والد کے درمیان اختلافات اور کشمکش کا سبب صرف اس بات کو ٹھہرایا کہ انہوں نے اپنی والدہ کا ساتھ دیا۔ یہ بات بھی اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ دوسری شادی کرنے پر پہلی شادی سے ہونے والی اولاد سے والد کے اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں کیونکہ ایسی شادیوں سے جو صورت حال پیدا ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ پہلی اولاد کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

مالی دشواریاں

یہ بھی اہم سبب تھا کیونکہ تنگدستی میں انسان کا رویہ بدل جانا ایک قدرتی امر ہے۔ بچپن میں ننھیال کی طرف سے ان کو ہر سہولت میسر تھی۔ ایف اے کے بعد اقبال آفتاب کی مالی مدد سے دستکش ہوگئے اور آفتاب کبھی نانا کبھی والدہ کبھی دوستوں کے محتاج رہے۔ تنگ دستیوں کی چیرہ دستیوں نے انہیں ہمیشہ پریشان رکھا۔ غریب الوطنی میں تنگ دستی ان کے دل و دماغ پر چوکے لگاتی رہی۔

باپ سے جواب مل چکا ہو، ماں اپنی پونجی دے چکی ہو، اور نانا قرض حسنہ دینے کے لئے ایگریمنٹ مانگتے ہوں تو پرائے دیس میں جو بیتتی ہے، اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں اور ایسے میں راہ اعتدال چھوٹ جانا بعید از قیاس نہیں۔

ناپختہ ذہن

آفتاب کی شوریدہ سری کی ایک وجہ ان کا ناپختہ ذہن بھی تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ یہ وقت ہیجان خیز ہوتا ہے۔ جسے ہم نفسیاتی اور جسمانی تبدیلیوں کے اعتبار سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ نوجوانی میں انسان بہت زیادہ "آدرش پرست" ہوتا ہے۔

جب آفتاب زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کے قابل ہوئے تو انہوں نے اپنے رویے میں واضح تبدیلی کرلی۔

اقبال کے حاشیہ نشینوں کی کارستانیاں

آفتاب اور اقبال میں جب فاصلے پیدا ہوئے تو پھر بڑھتے ہی رہے۔ بڑھتے ہوئے فاصلوں اور تلخیوں کو غلط فہمیوں نے گھمبیر کردیا۔ بجائے اس کے کہ ان تلخیوں کو کوئی اپنی محبت اور صلح جوئی کی شیرینی سے کم کرنے کی کوشش کرتا ،اقبال کے حاشیہ نشینوں میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو نہیں چاہتے تھے کہ آفتاب "فرزند اکبر" کا مقام حاصل کرے اور ان کا وارث جانشین ٹھہرے۔

اقبال یقین کرلینے والے شخص تھے (جیسے انہوں نے چند گمنام خطوط ملنے پر سردار بیگم کو خطاوار سمجھ لیا تھا) ان کے حاشیہ نشین جو "خبر" سناتے وہ یقین کرلیتے۔ اگر اقبال ، آفتاب کی غلطیوں کو معاف کرکے سینے سے لگالیتے تو یہ لوگ کامیاب نہ ہوتے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فلسفہ کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے والا فلسفی اور حکیم الامت ، دانائے راز اپنے ہی لخت جگر کے ذہن کو نہ سمجھ سکا۔ اقبال ہی کی زبان میں۔

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
ترے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے
رشتہ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

ایک اور دلچسپ وجہ

انسانی فضائل و عادات اور فطرت کو سمجھنے کے لئے بیرونی حالات و واقعات کے علاوہ انسان کی اندرونی خامیوں ، خوبیوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جو اس کی جبلت اور سرشت کا لازمی جزو ہوتی ہیں۔ آفتاب اقبال کی شخصیت کو اگر ہم علم نجوم اور علم الاعداد کی روشنی میں پرکھیں تو مندرجہ ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ (۵۷)

☆ انہیں سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایک قسم کے اندرونی انتشار کا شکار رہتے ہیں
☆ مجموعہ اضداد ہوتے ہیں۔ سوچ اور خیالات میں مسلسل ارتقاء رہتا ہے
☆ سیماب فطرت اور پرجوش ہوتے ہیں۔ کامیاب وکیل ، ایکٹر ، لیکچرار اور مقرر بن سکتے ہیں۔
☆ ابتدائی زندگی مشکلات کا شکار رہتی ہے۔ اپنی محنت سے مقام بنا لیتے ہیں
☆ دولت کے حصول کے لئے بے چین رہتے ہیں
☆ حساس ترین ہوتے ہیں اور خاندانی جھگڑوں کا شکار رہتے ہیں
☆ اگر خود کو حق پر سمجھیں تو ٹس سے مس نہیں ہوتے

آفتاب اقبال عظیم مسافر

رشیدہ بیگم

۱۸۹۸ء میں اپنے سفر زندگی کا آغاز ضلع جہلم کے موضع پنڈ دادن خان سے کیا۔
پنڈ دادن سے سیالکوٹ کے لئے روانہ ہوئے۔

سیالکوٹ میں ۱۹۱۱ء تک ستائے اور پھر ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک قادیان میں رکے
قادیان سے ۱۹۱۶ء میں دہلی کے لئے روانہ ہوئے اور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک دہلی میں
ذرا تھکی لی۔ ۱۹۲۱ سے ۱۹۲۴ء تک ایک لمبے سفر پر لندن چل دیے اور آخر ۱۹۲۴ء
میں اپنے وطن مالوف واپس لوٹے اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک ملازمت کے لئے محو
سفر ہوئے۔ آخر تھک ہار کر ۱۹۲۶ء میں لندن کے لئے روانہ ہو گئے اور ۱۹۲۶ء سے
۱۹۳۱ء تک بحالت مجبوری سفر کی حالت میں رہے اور کچھ سکون اور راحت کی خاطر پھر
۱۹۳۱ء میں اپنے ہندوستان کا رخ کیا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک روزگار کی تلاش میں
محو سفر رہے اور پھر ہندوستان کے اندر سیاحت کی ٹھانی اور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک
بنگال کے مشہور شہر کلکتہ میں کام میں لگے رہے۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک بنگال سے لوٹ کر محو سفر ہوئے اور آخر ۱۹۳۹ء سے
۱۹۴۱ء تک لاہور نے ان کے پاؤں میں ملازمت کی زنجیر ڈالی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کی زنجیر
توڑ دی گئی اور آپ آزاد ہو کر دہلی کی طرف محو سفر ہوئے اور ۱۹۴۲ء تک دہلی کے بلند و
بالا ایوانوں کی رونق دیکھی۔ تنگ آکر ۱۹۴۲ء کے بعد لاہور لوٹ آئے اور ۱۹۴۳ء
میں اس مسافر کے ساتھ ایک معاون کو شامل کر دیا گیا اور وہ اپنے معاون کو ساتھ لیکر
پھر بنگال کی سیاحت کو نکل گئے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک بنگال کے عظیم شہر کلکتہ
میں ذرا ٹھیک سے ستائے اور اب کے لکشمی دیوی نے ان سے مصافحہ کیا اور یہ نیک

شگون تھا۔ اہل وفا کا ایک کارواں ان کی طرف لپکا اور پھر اس مسافر کے ساتھ اہل وفا کا یہ کارواں ۱۹۹۸ء تک پیوستہ ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد یہ دو افراد کی پر عزم ٹیم پھر پنجاب کے دارالحکومت لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔ تقریبا" دو سال تک یعنی ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک لاہور میں قیام انہیں راس نہ آیا۔ کیونکہ ٹیم کا سربراہ جو گجرات سے راہنمائی اور دلجوئی کی خاطر آیا اس نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ پھر ۱۹۴۷ء میں تین افراد کی ٹیم ایک چھوٹے شہر ساہیوال کی طرف روانہ ہو گئی۔

۱۹۴۷ء کے تقریبا" تین چار ماہ گزار کر افرا تفری میں اس ٹیم نے کراچی کا رخ کیا۔ اب ٹیم کے سربراہ کے پاؤں میں تھکاوٹ کے آثار نمودار ہوئے اور وہ تھک ہار کر اور لکشمی دیوی کے چرنوں میں ستانے رک گئے اور تقریبا" ۳۲ برس تک سکون سے ستاتے رہے اور وقتا" فوقتا" یورپ کے ممالک کی راہ لیتے تھے کیونکہ سیاحت ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور وہ ہر دم سیر سپاٹے پر نکل جانے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ تعجب ہے کہ نگری نگری پھرنے والا یہ مسافر ایک طویل عرصے تک کراچی سے وابستہ رہا اور ہندوستان کا یہی شہر ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے قدموں سے نہیں نوازا تھا۔

ہر وقت محو سفر رہنے والا عظیم مسافر اپنے طبی معائنے کی خاطر جولائی ۱۹۷۹ء میں اپنے بیٹے نوید کے ہمراہ لندن روانہ ہوا۔ لیکن اس کی بیماری پانچ بار اس پر عزم مسافر کو دبوچنے کے لئے حملہ آور ہو چکی تھی اور ہر بار حملہ کا دفاع ہوتا رہا لیکن دیار مغرب کی سرزمین لندن میں اس پر بڑا کاری اور بھرپور وار کیا اور یہ مسافر جس کے قوی اب ذرا مضمحل ہو چکے تھے اس وار کو نہ سہہ سکے اور موت نے انہیں دبوچ لیا اور یہ بیماری کا چھٹا حملہ کاری ثابت ہوا اور حملے کے وار کا وقت ایسا منتخب کیا کہ مسافر کے ایک ساتھی اور معاون اس سے دور تھے۔

آخر ۲۳ جون ۱۸۹۸ء کو دنیا میں سانس لینے والا یہ عظیم مسافر ۱۳ اگست ۱۹۷۹ء رات کے ساڑھے دس بجے لندن کلینک میں آخری سانس لے کر ابدی نیند سو گیا اور باقی رہے اللہ کا نام جو بقا ہی بقا ہے اور انسان تو فنا ہی فنا سے واقف ہے اور فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔

میں اپنے اس عظیم ساتھی کو ہمیشہ یاد رکھوں گی جس کی مسافتوں نے ہمارے لئے خوشیوں کے چمن سجائے تھے۔ ہماری سانسوں میں اس عظیم مسافر کی خوشبو بسی ہوئی ہے جو لندن میں آخری سانس لینے کے بعد سخی حسن کراچی کی آخری آرام گاہ میں محو خواب ہے۔

رشیدہ بیگم

گروپ فوٹو (آفتاب اقبال صاحب کے ساتھ)

آفتاب اقبال صاحب اپنے اہل و عیال کے ہمراہ

نوادرات

آہلو والیہ کا علامہ" کے تعزیتی جلسے سے خطاب

Speech delivered by Sardar K.S.of Allahwalia

At Town Hall (1938) Lahore [illegible] the death of Sir Mohd. Iqbal.

Mr. Chairman and Gentlemen,

It is very proud privilege to have been allowed to say a few words by way of tribute to the memory of the late Sir Mohammad Iqbal. I am sure, I shall be voicing the general feeling of the Sikh community when I say what despite Sir Mohamed's political opinions with which many Sikh leaders did not agree the Sikhs appreciated his intense sincerity of purpose, admired his extraordinary intellect combined with a remarkable spirit of independence and respected him for his high moral principles. In his versatile genius Sir Mohammad combined high idealism with sound practical common sense and heart with a marvelous intellect.

Gentlemen, I doubt whether [illegible] appreciated the genius of this extra ordinary man during his life-time [illegible] much as we should have done but he was probably one of those great men whose eminence grows more obvious with laps of years. Like a mountain obscured at first by its foothills he will rise as he recedes. The coming generations of the moral and intellectual advancement of the Punjab in particular and the country in general better than we do.

I beg to disagree with those who believe that the ultimate aim of Sir Mohammad's teaching was to disrupt the political and social life of the country. It is clear that the believed in and advocated higher forms of communalism in which an individual part of a whole seeks its highest development for the development of the whole. His early poems and the political views which developed during the last years of his life made it clear to any body who had an opportunity of coming in close contact with him that he was at heart a warm patriot and nationalist with a very sane political outlook. But we must remember that this eminent poet-philosopher has immortalised himself in the history of India not as a politician but as a great moral and intellectual force which will inspire the coming generations of this country with deep sense of pride in their spiritual and cultural heritage and have the effect of building up their characters. Iqbal has died rich in honours though not in years but the spiritual influence which he has left behind as a poet, as a thinker and above all as a teacher of mankind will ever defy the limitations of space and time. He who succeeds in touching the depths of human sentiments and emotions always lives in the hearts of men. Politicians come and go but a great poet who interprets human emotions lingers. Political intrigues and personal jealousies but rises above them and looks on them from a higher pedestal with a national indifference. Then death comes to him he occupies a unique place not only in the affections of his countrymen but also God's earth. The sacred ground in which the body of Sir Mohammed lies will be envied by princes and politicians alike. It looks and though the mighty hand of God worked swiftly in awarding him his last resting place.

Iqbal's body may become dust and ashes but his spirit will always live to mould and fashion the lives of men and women of India.

Ahluwalia

as verily as follows the benightedingth). The whole cosmos (in this Iqbalian verse) at Iqbal I the indisputable CITIZEN of the WORLD (like JMES BOSWELL, the Lowlander).

Invested with this Iqbalian Heritage of his superphysical resplendence, and his transhumant personality, you have been endowedwith the fie of his 'second sight (by whose Almighty Force, your astrally-visioned father corrected the concept-of-paradise, miss-conceived by DANTE, in his (the latter's 'COMMEDIA) and you are the spark of that lightning-light, that burnt the Mount-of-Sinai and made Moses unconscious. So, this departing greeting has message for your, in that, you are the walker on the footprints of Iqbal's.

Double-Acrostical Poem, n honour of Doctor, Sir, Mohammad Iqbal (16 lines of name).

S .... SEPTINSULAR SKIES of the pen's poetic Magnum Opus. .... S
I .... (invading CASTOR-POLLUX, recalling Martyr TIPOO, son of Hyder Ali I
R .... reign like 7 edense, on the world of MATTER-Ether .... R
M .... MUSES 9 (born like the stanzas, from womb of thy Bosom .... M
O .... outbreaking seals-of-lust, that eclipsed, golden deeds of TipoO .... O
H .... heralding Hyder's golden-age. Mysore's constitutional monarcH, ... H
A .... architect of multi-racial liberty of Afro-Asia .... A
M .... mourn pan-Indian desertion, in crusade-for-freedoM .... M
M .... mighty revoking Character-of-jingosiM, ... M
E .... enfreedoming enthralled, an Asian universE. ....
D .... Defender (thou Iqbal). of TIPOO's-SCARLET-SworD .... D

Stanza three

I .... Iqbal let thy Almighty Pen wake Martyrs Kennedy and Liaquat Ali, ... I
Q .... QURAN becoming thy ARTILLERY, that shielded TARIQ .... Q
B .... brave Martyrs rise like lion-livers, from thy HOLY niB .... B
A .... awarding peace-to-war, in Pak-and-IndiA .... A
L .... lifting EVE-and ADAM, from their, falL, ... L

________FAQIR MOHAMMAD
LONG LIVE MRS. AND. MR. AFTAB IQBAL: AMEN; ADIEU
Very Truly yours.

TO: BEGUM AND AFTAB IQBAL
14th August, 1971's echoing peal, in honour of
Mr. Aftab Iqbal, M.A. (London), Barrister-at-Law,
LONDON: (a greeting by departing Indian Muslim visitor)
(Faqir Mohammad, foreword-author),
Anthology-of-verse, New York City, N.Y., U.S.A.

فقیر محمدؒ کا نذرانہ عقیدت بحضور علامہ" اور آفتاب اقبال

Dear magister Artium and WORLD-MULTI-RACIAL FRATERNISER

THOUS SHALT BE COMMITED TO THE TASK OF WORLD-LEADERSHIP ENGRAVED IN KING-OF-METALS, this IQBALIAN clarion, which attained the young age-of-timelessness, is re-dedicated unto you, in the fervency-of-hope, that you'll cherish the quintessence of its melrose.
In replying to your kindly letter (airmailed from the Metropolis of Queen Elizabeth the second, just before sailing, from Doctor Iqbal's Free Country, homeward-to-Jawahalrla's Nation, I should like to make, both can assertion-and-affirmation, that the SON of the SUN, can never live in "comparative obscurity". The metaphor 'SUN' applies to your name worthy father, whose illustrious son, you are. The time has come for Iqbal's son to ecclesiastically exemplify the course of the metaphorical SUN. Here,y'r father's sempitern resplendency, that has illumined the 7 skies and Adam's Planet, will impair y'r obscurity and GIVE YOU LIGHTS And you are the surviving constellation of y'r father's sreflexive flambeau, with which the East-and-West have been supersaturated.
In Doctor Iqbal's POSTERITY, you are his first corridor. And his conscionable light is in the continual process of passing through this corridor, to his unborn generations, in EVITERNITY. SEER Iqbal's 2 eyes (that are metaphorically the CASTOR and POLLUX), are 2 windows to the unbeholden treasures of the ORIENT, and the OCCIDENT. His on eyey (the COSTOR) beholds the ORIENT, the other eye (the POLLUX) beholds the OCCIDENT. It is Doctor Iqbal's SIXTH SENSE, that sees these 2 hemispers, which my material eyes fail to see!.

(THE ADAMIC RACE BE MY COMMUNITY, THE COSMOS BE MY NATION) IQBAL

In this self-speaking ALMIGHTY MASTERPIECE verse, the omniscient Creator gives Iqbal, the status of a

(An Indian Muslim's valedictory Salutation to Mr. AFTAB IQBAL, Magister Artium (London), Barrister-at-Law, on the former's impending eve of returning from Quaid-e-Azam's Islamian National, homeward to Bharath.

DOUBLE-ACROSTICAL POEM, IN HONOUR OF MR. AFTAB IQBAL

Note-to-the-address: the first-and-last alphabetical letters, in each line, when collected, will spell the celebrity's ten-letered name, reading: AFTAB IQBAL (on both sides). Soberly acknowledging ■ similar poem, the late, SIR S.C.ROBERTS, President, English-Association, London, and one of the world's greatest literary critics, aerogrammed-from Cambridge University, thus: "I greatly admire the ingenuity, you have shown, in the construction of double-acrostics."

Double-acrostical salutation to Aftab Iqbal Esq.

A .... Allah builds around-thy-brow, the SUN's aurorA .... A
F .... from whose resplendent HALO, blooms a LAUREL-Leaf .... F
T .... treasuring the 30 chapters-of-QURAN, inside-thy-heart, ... T
A .... as 12 constellations of the ZODIAC's aurorA, ... A
B .... born like EDENS 12, impearl thy Barristerian garB, ... B

Stanza II

I............... Iqbal Islamian laureations, that make thy eyes, a Geminl, ... I
Q .... Quranically crown thy head, I the mosques-of IraQ, ... Q
B .... Building ev'ry inch of KA'BAH, 'tween thy ev'ry riB, ... B
A .... as the 2 hands become a MECAH-and-MEDINA .... A
L............... long live thy life's rubified horizons, O AFTAB Iqbal, ... L

FAQIR MOHAMMAD
Foreword-author: Anthology-of-verse, new Work city, contributor:
"Christmas-Anthology" (London), author: one-act-verse-drama: "TIPOOS–SCARLET SWORD

Karachi-33

Saturday-Night, Twelve, 1971

Mr. Aftab Iqbal, Tipoo Sultan road, Karachi
Dear Brother-in-Islam and CITIZEN-of-the-WORLD:

DOMINUS ILLUMINATION MEA, IN RE-DEDICATING TO YOU, THIS MOTTO OF THE OXFORD UNIVERSITY, I present this double-acrostical salutation written in your honour, on he impending eve of my returning from your great National homeward-to-Baharath. And this remembrancer is informally sincere as he ardour, in which I wrote this memento, will not decay, in the recipient's intellectual eden, after nearly 2 thousand geographical kilometers separate my physical presence. from your paradisian city on whose sublunar campus, stands our mansion, like a 10th muse. A wordsworthan setting vernally surrounds your home, like the HALO THAT SURROUNDS THE moon-in perigee. And your home, line subvulnary solitude, promotes my pen, to carve conjuring images of Dame Nature.

MAY ALLAH'S SEMPTERN BLESSINGS DESCEND ON YOUR ROOF. MAY FORTUNE BECOME THE HEIRESS TO YOUR HOME. MAY PERFECT HEALTH AND GOODLY CHEER BECOME THE VOWEL-AND CONSONANT IN YOUR LIFE MAY NECTAR SUPERSATURATE YOUR YOUTHSOME VEINS MAY OLD AGE NEVER COME TO YOU, AS YOUR SPIRIT-OF SERVICE TO THE MULTI-RACIAL HUMANITY WILL NEVER AGE.

MAY "philasophia biou kubernetes' become your semiternous intellectual companion.

Your life-in-retrospect has exemplified the timelessness of the TRUTH of the Latin Proverb OMNIA VINCIT AMOR< NOS ET CEDAMUS AMORI"

With deepening carillons-farewell,

Very truly yours in PAN-ISLAMIAN
FRATERNITY

ادارہ عقد بین المسلمین کا نصب العین

ادارہ عقد بین المسلمین کے متعلق جس کی میں صدر بھی ہوں۔ پہلے بھی لکھ چکی ہوں۔ علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی میں اور موجودہ کتاب میں بھی مختصر لکھا ہے۔ اس انجمن یا ادارہ کا نصب العین کیا ہے، بتانا چاہتی ہوں۔ مختصراً یہ ادارہ ۱۹۴۷ء سے کام کر رہا ہے اور ہمارا نصب العین درج ذیل ہے۔

چند ممبرز کی تصویر بھی شامل کر رہی ہوں۔ بانی اور پہلی صدر بیگم مسیح الدین تھیں۔ دوسری صدر میں ہوں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں میرا انتخاب کیا تھا۔

(ا) مسلم لڑکیوں کی شادی میں پیدا شدہ رکاوٹوں کو دور کرنا اور موزوں رشتوں کو دریافت میں مدد پہنچانا۔

(ب) مختلف قومیتوں (مثلاً عربی، ترکی، ایرانی، شامی، اردنی، مصری وغیرہ) کے درمیان پاکستان کے لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

(ج) غریب اور نادار لڑکیوں کی شادی میں پیدا شدہ رکاوٹوں کو اگر وہ مالی تنگ دستی یا جہیز کی وجہ سے پیدا ہوئی ہوں جہیز کی اعانتوں کے ذریعے دور کرنا۔

(د) قوم میں فروغ پانے والی غیر اسلامی رسوم و توہمات کا انسداد کرنا۔

(ہ) ایسی بیوہ یا مطلقہ خواتین جو عقد ثانی کا ارادہ رکھتی ہوں، ان کے رشتوں میں خالص اسلامی خطوط پر سہولتیں بہم پہنچانا۔

(و) خواتین کی تہذیبی، معاشی، معاشرتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

ادارہ عقد بین المسلمین کی چند اراکین

دائیں سے :- مسز پروین انوار صاحبہ محترمہ فاطمہ صاحبہ مسز غزالہ مفتی صاحبہ مسز سرفراز ملک صاحبہ مسز قیصر جعفری بیگم رشیدہ آفتاب اقبال صاحبہ بیگم طاہرہ سلیم حافظ صاحبہ۔

۴۳ ماڈرن ہاؤسنگ سوسائٹی

ٹیپو سلطان روڈ، کراچی

مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۷۸ء

مکرمی جناب کفایت اللہ صاحب

آپ کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے جو سوالات پوچھے ہیں ان کے جواب میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ بالکل درست ہے کہ میرے نانا مرحوم خان بہادر حاجی حافظ ڈاکٹر شیخ عطا محمد صاحب میانوالی سے ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہو کر ریاست مالیر کوٹلہ بطور چیف میڈیکل آفیسر چلے گئے تھے۔ میانوالی میں تقریباً دس بارہ سال تک وہ سول سرجن کے عہدے پر مامور رہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک مالیر کوٹلہ میں رہے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں میٹرک پاس کرنے کے بعد دہلی سینٹ اسٹیفنز کالج چلا گیا تھا۔ جہاں سے ایم اے کی ڈگری لی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے واسطے انگلینڈ چلا گیا تھا۔ نواب احمد علی خانصاحب میرے نانا مرحوم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ خان بہادر صاحب اور تین چار سال تک ریاست میں رہیں مگر وہ اتنا عرصہ اور نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے واپس اپنے وطن گجرات چلے گئے جہاں ۱۹۲۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

آپ نے جو میرے والد مرحوم کے خلاف کسی مقدمے کے متعلق پوچھا ہے تو وہ مطلقاً غلط ہے۔ اس قسم کی بے ہودہ افواہیں بڑے بڑے آدمیوں کے خلاف لوگ اکثر پھیلایا کرتے ہیں۔ میرے نانا مرحوم اور میرے والد مرحوم کے مابین کسی قسم کی مقدمہ بازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ان کے تعلقات آپس میں نہایت خوشگوار رہے اور میرے والد مرحوم نانا مرحوم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ میں آپ کو

جناب کفایت اللہ صاحب سیکرٹری اقبال میموریل ٹرسٹ مالیر کوٹلہ کے خط کا جواب۔

یہ رائے دوں گا کہ آپ اس بے بنیاد مقدمہ کی مثل ڈھونڈنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کریں گے کیونکہ اس قسم کی مثل کوئی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

میں جب مالیر کوٹلہ میں تھا تو اس وقت میرے ایک عزیز دوست عبدالحمید نواب صاحب کے اے۔ڈی۔سی تھے۔ میری آخری ملاقات ان سے لاہور اسٹیشن پر ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی اور چند سال ہوئے ان کے بھتیجے یا بھانجے شمشاد احمد یا شمشاد حسین کی شادی میری ایک خالہ زاد بہن کے ساتھ ہوئی وہ اس وقت Washington میں Pakistan Embassy میں Counseller ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے مالیر کوٹلہ میں ایک طالب علم کو اس کی کتاب پر اپنے Autograph دیئے تھے مگر اس کی Details مجھے یاد نہیں۔

شاید یہ بتادینا آپ کے لئے باعث دلچسپی ہوگا کہ نواب احمد علی صاحب کے چچا نواب سر ذوالفقار علی خان جو کسی زمانے میں ریاست پٹیالہ کے چیف منسٹر رہ چکے تھے میرے والد مرحوم کے بڑے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ ان کی زندگی کے بہت سے آخری سال لاہور میں گزرے تھے ان کے دو صاحبزادے رشید علی خان اور خورشید علی خان تھے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ یہ دونوں میرے عزیز دوست تھے۔

مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کے تقریباً تمام سوالات کا جواب دیدیا ہے لیکن اگر کچھ مزید معلومات کرنی ہوں تو بیشک آزادی کے ساتھ پوچھیئے۔

آپ کا مخلص

آفتاب اقبال

۱۹۸

Prince Muazzam Jah & Princess Niloufer

request the pleasure of

Mr Afzal Iqbal's company

at a Dance on 12th Oct 1938 at 9.30 p.m.

Hill Fort.

R. S. V. P.
to the A. D. C.
in Waiting.

Short coat - Black or white.

حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان کی طرف سے (۱۹۳۸ء) کے ایک دعوت نامے کا عکس۔

PERMANENT ADDRESS:
IRAN TEHRAN
مصطفی عطری نژاد

Ref. No. 538-6
Dated 5-9-7
Attached عکس اقبال

سازمان ورزشی و هنری فورت ایران

تقدیم بحضور جناب دکتر آفتاب اقبال

گفته های شاعر مشرق زمین در آسمانها جلوه عزت گرفته
نام اقبال از بلندی های دانش رتبه حکمت گرفته
عشق و عقل و دانش و علم و هنر آسان نمیاید بدست
این متاع از حسن ایمان است که از سرچشمه همت گرفته
مسجد شاهی لاهور است مزار آن شریف دیدم بعین
ذوق و روحش رفته بر عرش حجره اندر گوشه جنت گرفته

سرآینده مصطفی عطری نژاد
۲۲۹
عطری نژاد
کراچی

FERERE HALL KARACHI-4
P. O. BOX NO.3976
PRESENT ADDRESS:

۱۹۷۴ء کو علامہ کے مقبرہ کو دیکھ کر ایک ایرانی دانشور کا علامہ کے حضور نذرانہ عقیدت۔

আল্লামা ইকবাল সংসদ পত্রিকা

Iqbal Studies

Journal of The Allama Iqbal Society, Bangladesh

এপ্রিল-জুন ১৯৯৭

প্রকাশনায়
আল্লামা ইকবাল সংসদ, ঢাকা

৩৮০/বি, মিরপুর রোড (৩য় তলা), ধানমণ্ডি, ঢাকা
ফোন : ৯৫৫৪২৫৭

মূল্য : পঞ্চাশ টাকা মাত্র

بنگالی مضمون کے سلسلے میں ایک مختصر تعارف

اقبال پر اب پوری دنیا میں کام ہو رہا ہے۔ یعنی اقبال کے کلام کا ترجمہ سب زبانوں میں ہو رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں بہت کا ہو رہا ہے یہاں ادارہ ہے جو اقبال کی Iqbal Study- Journal of Allama Iqbal Society کتابوں کا ترجمہ کرتے ہیں انہوں نے علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی کا ترجمہ بھی کیا ہے اس کے علاوہ علامہ پر خود بھی کتابیں شائع کرتے ہیں اور رسالے بھی نکالتے ہیں۔

ایک پروفیسر جو اسلام آباد یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ ان کا نام لطف الرحمٰن فاروقی ہے۔ ہم نے انہیں "علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" بھیجی۔ جس میں آفتاب اقبال کے متعلق تفصیلاً لکھا گیا ہے "آفتاب اقبال ہی علامہ کے حقیقی وارث ہیں" بنگلہ زبان میں شائع کروایا ہے۔ یہ صاحب خود بھی بنگالی اور اردو میں ۱۵۰ کتابیں لکھ چکے ہیں۔

کلکتہ میں آفتاب اقبال بہت عرصہ رہے۔ اس لئے ویسے بھی انکو وہاں کا پڑھا لکھا طبقہ جانتا تھا۔ شادی کے بعد میں بھی ۳ سال کلکتہ ان کے ساتھ رہی۔

شیر بنگال مولوی فضل الحق کے ساتھ ہمارے گھریلو قسم کے تعلقات ہو گئے تھے۔ ویسے ان کی دوسری بیوی بھی اردو اسپیکنگ تھیں۔ اکثر شام کو ہم ان کے گھر جاتے تھے اور اچھے پڑھے لکھے بنگالی لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

وہاں ہی ہماری ملاقات بدرالدجی صاحب سے ہوئی تھی جو نہ صرف سیاستدان بلکہ عالم تھے کئی زبانوں پر ان کو عبور تھا۔ ان کی پرسنالٹی Personality بھی بہت زبردست تھی۔ عام بنگالیوں سے مختلف تھی۔ گورا رنگ تھا۔ شکل سے بنگالی معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ یہ ویسے بھی فضل الحق صاحب کے دست راست تھے۔

تقسیم ملک کے بعد جناح صاحب نے ان کو پاکستان آنے کی دعوت دی اور اعلیٰ

(۲۲۹)

Gram : IQDEMY

Telephones : 581507 / 581162

IQBAL ACADEMY PAKISTAN

90/B - 2, [illegible] III, LAHORE
(Near Hussain Chowk)

Ref. No. 1-36-9/18/11/86

Dated ۱۲ اگست ۱۹۸۵ء

محترمہ بیگم صاحبہ

تسلیم و نیاز

محترم ڈاکٹر آفتاب اقبال صاحب کی اچانک رحلت کی خبر سے بے حد رنج ہوا ۔ خداوند تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔

اکادمی میں تعزیتی اجلاس کی رپورٹ کی ایک نقل اس خط کے ساتھ منسلک ہے ۔

نیاز مند

ڈاکٹر محمد معزالدین
ڈائرکٹر

بخدمت بیگم رشید آفتاب اقبال
۳۲ ٹیپو سلطان روڈ
کراچی ۔

اقبال اکادمی لاہور کے ڈائریکٹر جناب معزالدین صاحب کی طرف سے رشیدہ بیگم صاحبہ کے نام تعزیتی خط

افتتاحی تقریر جناب آزاد اقبال صاحب

بیرسٹر ایٹ لاء

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ مرقع اقبال سے پیشتر خان بہادر عبدالرحمن چغتائی نے اپنے گرانقدر موئے قلم کو حیدر آباد کی فضاؤں میں بھی جنبش دی تھی اور ۱۹۴۷ء میں علامہ اقبال کے اشعار کو مصوری کے جامہ میں پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ ان کے علاوہ ملک کی ایک نامور آرٹسٹ صغر اربابی نے ان سے پیشتر علامہ کے اشعار کو رنگ میں رنگ کر علامہ کے قریب (۳۰۰) اشعار کو مصوری کے قالب میں ڈھالا تھا۔ اور آج بھی موصوفہ جناب آذر ذوبی کے دوش بدوش اس نمائش کے انعقاد میں حصہ لے رہی ہیں۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ علامہ اقبال کی کتب اور ان پر تصنیفات ، مقالہ جات، تصاویر اور خطوط سے متعلق جو کام ماضی میں ہندوستان کی بزم اقبال نے کیا تھا۔ وہ اتنا جامع اور وسیع تھا کہ اس کو ہماری اقبال اکیڈمی نے بھی پورا نہیں کیا۔ اس وقت اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا۔ لکھا جا رہا ہے۔ اور لکھا جائے گا۔ اور اس میں تحقیقات بھی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں ،میں ان مصنفوں کی خدمت میں عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ ضرور لکھیں اور کتابیں چھپوائیں مگر یہ پیش نظر رہے کہ علامہ نے اپنے پیام کو مومن کی آنکھ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نمائش اقبال منعقدہ جمعہ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۷ء میں آزاد اقبال کی افتتاحی تقریر۔

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

صد سالہ جشن ولادت اقبال

مجلس اقبال کے زیر اہتمام ۱۸ دسمبر بروز اتوار صبح کے دس بجے کانوے ہال (Conway Hall) ۲۵ ریڈ لائن اسکوائر، لندن، ڈبلیو۔ سی۔ ۱ میں شاعر مشرق ترجمان حقیقت اور دنیا کے بلند پایہ فلسفی علامہ اقبال مرحوم و مغفور کے صد سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں ایک عام جلسہ منعقد ہوگا۔ ممتاز مقررین اور مقالہ نگار فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کریں گے۔ گلوکار اور شعرائے کرام بھی اس شہرہ آفاق شخصیت کے حضور اپنا نذرانہ عقیدت پیش کریں گے۔

مقالات تقاریر کلام اقبال مشاعرہ

اس اہم اور یادگار تقریب میں لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز اور علامہ اقبال کے صاحبزادے جناب آفتاب اقبال بھی خاص طور پر شرکت فرما رہے ہیں اس تقریب میں پڑھے جانے والے چند مقالات کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

اقبال کا سفر مدینہ، لطائف اقبال، فکر اقبال کی اہمیت موجودہ دور میں اقبال کی ہمہ گیر عظمت کا راز وغیرہ۔

وقت مقررہ پر تشریف لا کر اس اجلاس کی رونق دوبالا کیجئے۔ شکریہ۔

نوٹ: نزدیک ترین ٹیوب اسٹیشن یہ ہیں

Holborn & Russell Square (Piccadilly Line)

صد سالہ جشن ولادت اقبال زیر اہتمام مجلس اقبال (لندن) کے دعوت نامے میں آفتاب اقبال کی خصوصی شرکت کا اعلان۔

پیام

جناب آفتاب اقبال صاحب فرزند علامہ ڈاکٹر اقبال

جب علامہ اقبال کا ذکر آتا ہے تو میرا جی بھر جاتا ہے۔ علامہ پر جتنا بھی لکھیں جتنا بھی کہیں وہ میری دانست میں کم ہی ہے۔ کیونکہ علامہ کی علمیت کا نہ حد ہے نہ حساب، اور آج کی دنیا میں اگر اللہ تعالیٰ کی اجازت ہوتی تو ہم ان کی پرستش کرتے۔ انہوں نے جوانوں کے روپ میں ہر ایک کو یہ پیام دیا۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے

پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نور بصیرت عام کردے

آپ کی بزم سے میری رفاقت گہری ہے۔ جس زمانہ میں اس کی تاسیس ہوئی تھی اس کے چند دن بعد ہی میں حیدر آباد دکن میں تھا۔ اور میں نے اس کے کئی جلسوں سے خطاب بھی کیا۔ غالباً" ۱۹۳۹ء میں اللہ تعالیٰ اس بزم کو ٹھوس بنیادوں پر قائم ودائم رکھے۔ اس کی مجھ سے جتنی بھی خدمت ہو گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ انجام دوں گا۔

اس وقت بھی معین الدین کولاس صاحب اس ادارہ کے معتمد تھے۔ انہوں نے اس کی بے لوث خدمت انجام دی اور اس کا دفتر بھی بڑا شاندار اور مرکزی مقام پر تھا اور اس کا ہال بھی وسیع تھا۔ آپ اس کے دفتر کے لئے عمارت بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو کامیاب فرمائے۔ آپ کی مصروفیات میں شرکت سے قاصر ہوں۔ اس لئے کہ ان دنوں میں لندن میں ہوں گا۔

آپ کا مخلص آفتاب اقبال

نمائش اقبال منعقدہ جمعہ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کے لئے آفتاب اقبال کا پیام۔

پیوست دارد
۸۰۵۹
۱۳/۱۰/۴۶

دفتر مخصوص علیاحضرت شهبانوی ایران

بانو وحیده روشن صدر معلمه پاکستانی

اشعاری راکه سروده بودید از لحاظ پیشگاه مبارک علیاحضرت فرح پهلوی شهبانوی ایران گذشت وابراز احساسات شما موجب مسرت وخرسندی خاطر مبارک علیاحضرت معظم لها گردید. مقرر فرمودند مراتب خوشوقتی خاطر مبارکشان بشما ابلاغ شود. ضمنا یکعدد سکه نقره یادبود جشن فرخنده تاجگذاری مرحمت فرمودند که به پیوست برای شما فرستاده میشود.

پیشکار علیاحضرت فرح پهلوی شهبانوی ایران. فضل الله نبیل

سابقہ ملکہ ایران عالیہ ملکہ فرح دیبا کی طرف سے وحیدہ روشن صاحبہ کو عطا کردہ توصیفی سند۔

Nature

19th May 1994

Thou led us to a joyous land,
Every beauty in a grain of sand.
The wind rustles through my mind,
The clouds and trees are beauty to mankind.

Ocean breeze

Flows to the seas,
And the waves tease.
And thunder bangs,
The rain drops feel like vampire fangs.

The Mind

My life is a philosophy,
Philosophy turns into mystery.
God controls the universe, and seas,
He does it with so much ease.
Now you will discover mankind.

Jihad Iqbal

علامہ اقبال کے پڑپوتے جہاد اقبال کی انگریزی نظمیں

GOVERNMENT OF PAKISTAN

THE PATENT OFFICE

~~KIANI-S.J.-SHAHEED-ROAD,~~
~~DEPOT-LINES,~~
~~KARACHI-3~~

Telegrams : PATENTS

Telephone : 36960 / 74974 (Controller) / 346980 / 78491 (Administrative Officer)

All communications should be addressed to the Controller of Patents and Designs by designation, and not by name, quoting No. and date of this letter.

MAQBOOL CHAMBERS
SHAHEED-E-MILLAT ROAD
KARACHI.

No. 52/145/79-Adm.

Date August 15, 1979.

Dear Mr. Azad Iqbal,

On behalf of all the officers and the staff of this office and my behalf, I offer heartfelt condolence on the sad demise of your father. May Allah give you and bereaved members of the family strength to bear this irrparable loss and bless the departed soul with peace "Amen".

Yours sincerely,

(M. O. BHATTI)
CONTROLLER OF PATENTS AND DESIGNS.

Mr. Azad Iqbal,
33, Modern Housing Society,
Tipu Sultan Road,
KARACHI.

Patent کے دفتر کی طرف سے آفتاب اقبال کی تعزیت کے سلسلے میں آزاد اقبال کے نام تعزیتی خط۔
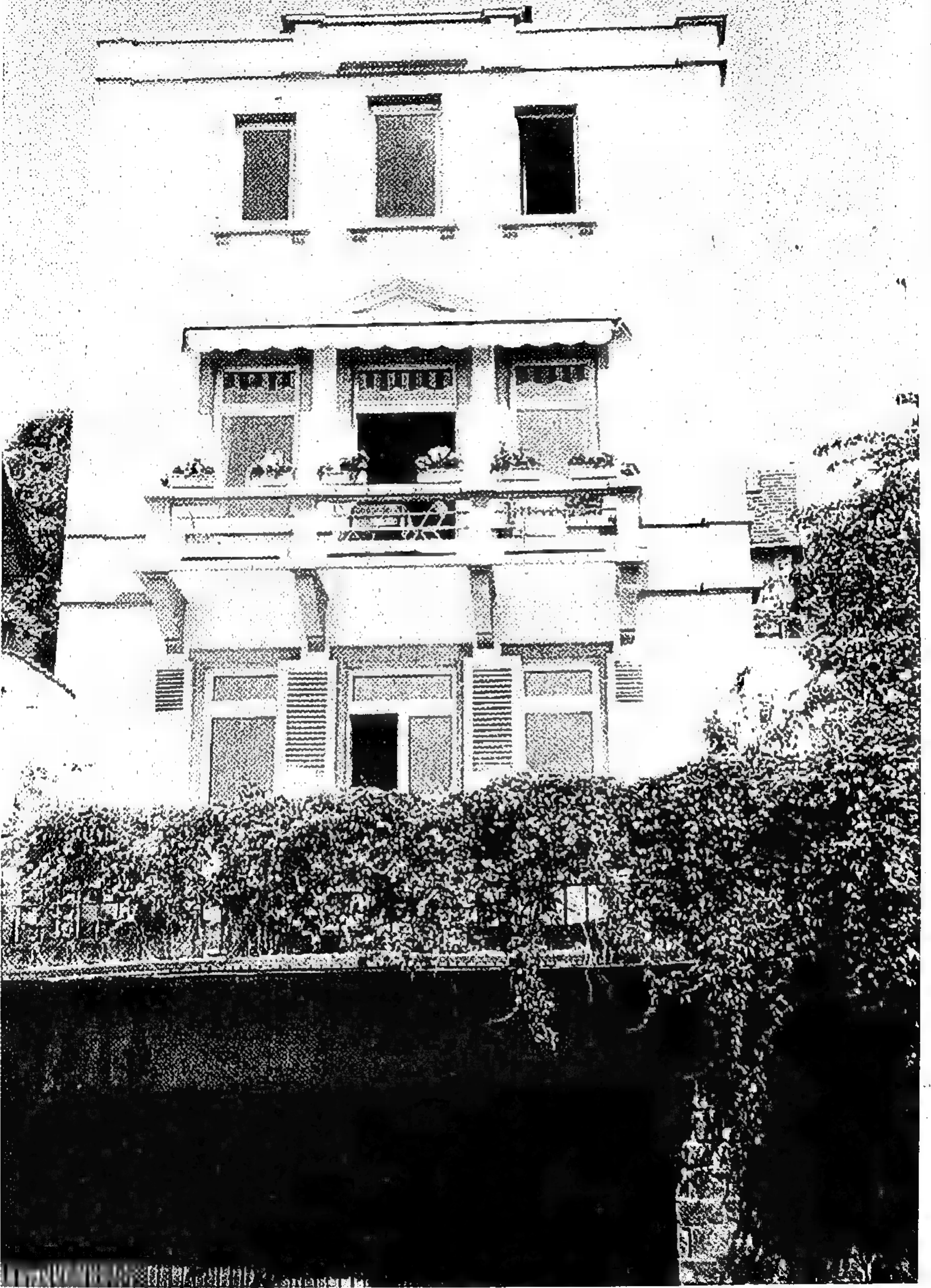
جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ میں علامہ اقبال کی قیام گاہ کا بیرونی منظر
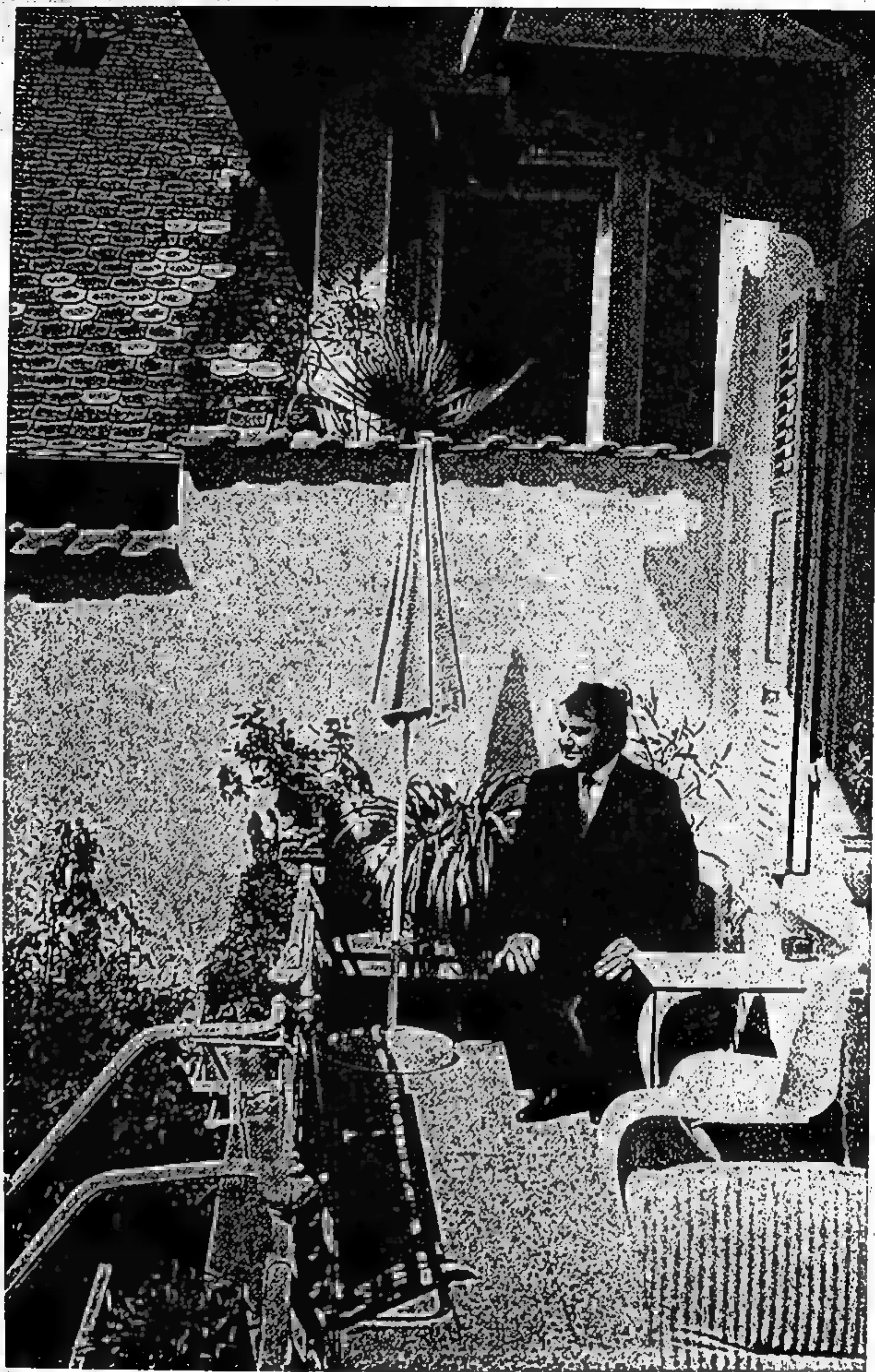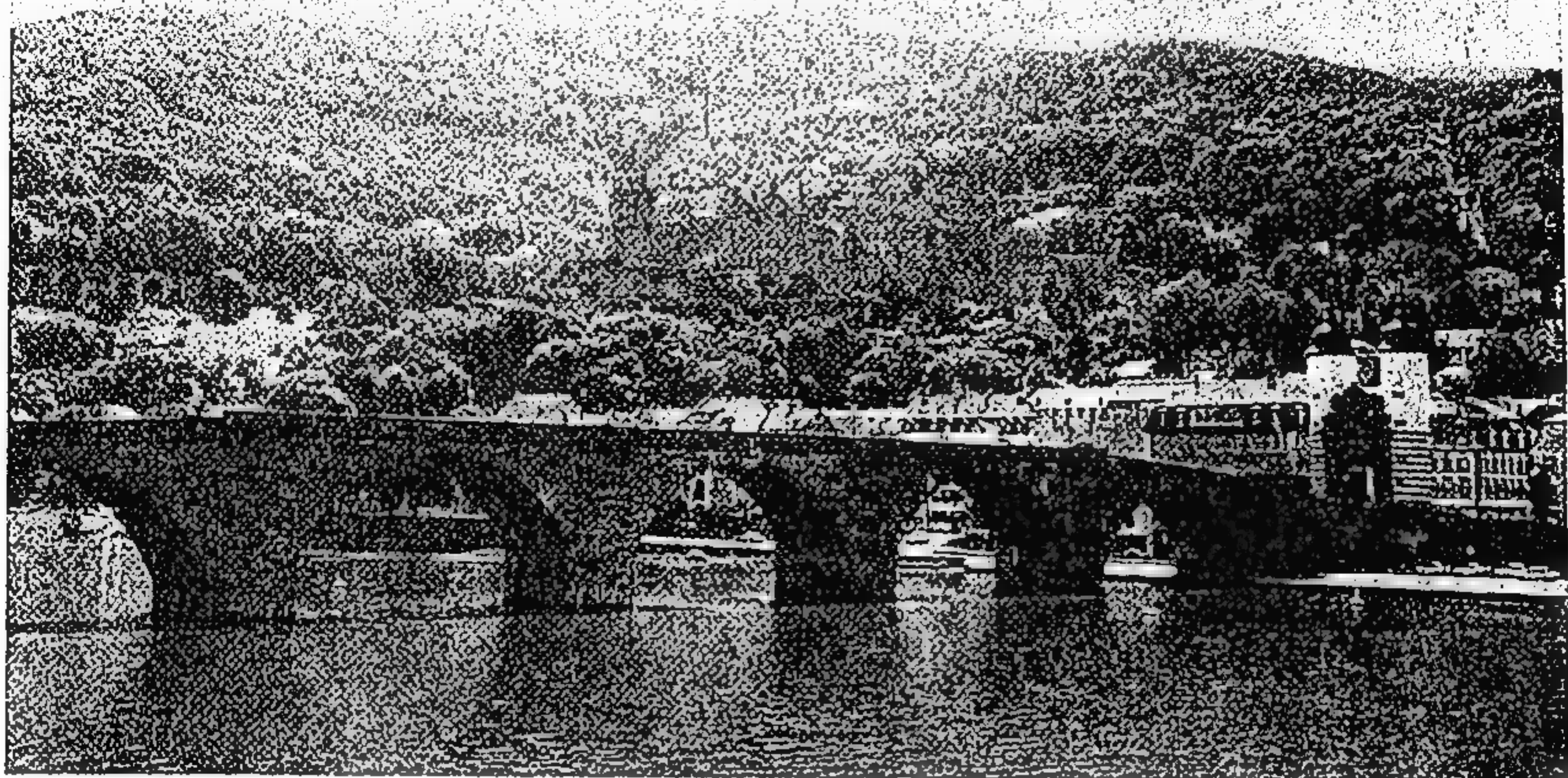
دریائے نیکر کا ایک منظر، جرمنی کا مشہور دریا (ہائیڈل برگ)

جرمنی کے شہر میونخ میں ایک باغ میں علامہ اقبال کی ایک یادگار کی تصویر

عالمی تنظیم اتحاد العالم الاسلامی کے بیسویں سالگرہ کے موقع پر آفتاب اقبال صاحب اپنے والد محترم کا کلام سنا رہے ہیں اور تنظیم کے جنرل سیکرٹری پروفیسر حسن الاعظمی عربی ترجمہ کر رہے ہیں۔ بائیں طرف شاعر ازہر شیخ صادی شعلان اور سفیر مصر علی الخشبہ اور آفتاب اقبال صاحب کے برابر میں سفیر لبنان اشعار کا مفہوم سمجھ کر اظہار مسرت کر رہے ہیں

نوٹ : شیخ صادی شعلان (مصری شاعر) نے حسن الاعظمی صاحب کی معاونت سے علامہ کا کلام عربی میں ترجمہ کیا۔ شکوہ اور جواب شکوہ کے علاوہ ترانہ ہندی عرب دینا میں مقبول ہوا شیخ شعلان اکثر حسن الاعظمی کے ہمراہ ہمارے گھر تشریف لاتے تھے۔

بیگم حفیظ صاحبہ (والدہ محترمہ قطب الدین عزیز صاحب) کے گھر پر "یوم اقبال" پر مدعو خواتین و حضرات کا ایک یادگار اجتماع۔ بیگم آفتاب اقبال و بیگم حفیظ کے برابر عرب ممالک کے سفرا کی بیگمات اور صاحبزادیاں بیٹھی ہیں۔ عقب میں سفرا کے ساتھ آفتاب اقبال اور حسن الاعظمی نمایاں ہیں۔

"اقبال ڈے" کے ایک جلسے سے عبدالقیوم خاں صاحب تقریر کر رہے ہیں

ترانۂ ملی

(اس کے عربی ترجمہ کو عالمی تنظیم اتحاد العالم الاسلامی نے ۱۹۷۶ء میں اپنا خصوصی ترانہ منتخب کیا ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اے موجِ دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو؟
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہیں
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

نوٹ: اس ترانے کا دمشق ریڈیو نے بے مثال ریکارڈ تیار کیا ہے۔

النشيد الإسلامي

الصين لنا والعرب لنا   والهند لنا والكل لنا
أضحى الإسلام لنا دينا   وجميع الكون لنا وطنا
توحيد الله لنا نور   أعددنا الروح له سكنا
الكون يزول ولا تمحى   في الدهر صحائف سؤددنا
بنيت في الأرض معابدها   والبيت الأول كعبتنا
هو أول بيت نحفظه   بحياة الروح ويحفظنا
في ظل السيف تربينا   وبنينا العز لدولتنا
علم الإسلام على الأيام   شعار المجد لملتنا
بهلال النصر يضيء لنا   ويمثل خنجر سطوتنا
وأذان المسلم كان له   في الغرب صدى من همتنا
قولوا لسماء الكون لقد   طاولنا النجم برفعتنا
يا دهر لقد جربت على   نيران الشدة عزمتنا
طوفان الباطل لم يغرق   في الخوف سفينة قوتنا
يا ظل حدائق أندلس   أنسيت معاني عشرتنا
وعلى أغصانك أوكار   عمرت بطلائع نشأتنا
يا دجلة هل سجلت على   شطيك مآثر عزتنا
أمواجك تروي للدنيا   ولتعيد جواهر سيرتنا
يا أرض النور من الحرمين   ويا ميلاد شريعتنا
روض الإسلام ودوحته   في أرضك رواها دمنا
ومحمد كان أمير الركب   يقود الفوز لنصرتنا
إن اسم محمد الهادي   روح الآمال لنهضتنا
دوت أنشودة إقبال   جرسا أيقظ فيه الزمنا

ليعيد قوافلنا الأولى
في المجد ويبعث أمتنا

مکان کا نام:- "نزہت"
ناظم آباد - ۳/ڈی - ۲/۶،
کراچی - ۱۸۰۶،
۱۱ر اپریل ۱۹۸۳ء

(فون:- ۶۱۱۹۰۴)
"خسروی"
۲ر جمادی الاول ۱۴۰۳ھ

محترمی، سلام مسنون

مجھے وہ الفاظ نہیں ملتے ہیں جن سے آپکی نوازش کیلئے احساس ممنونیت کا اظہار کر سکوں۔ ایک بالکل اجنبی و نادیدہ شخص پر آپکا یہ کرم واقعی آپکے علامہ اقبال کے فرزند رشید و خلف صادق ہونے کا ثبوت ہے۔ خدا آپکو تادیر ہم جیسے بے نواؤں کیلئے اس دنیا میں رکھے اور دونوں عالموں کے رفیع ترین درجات عطا کرے۔

جو لوگ اقبالیات کے ماہر ہونے کے مدعی ہیں ان میں سے بہت سوں نے اقبال پر کتابیات مرتب کی ہیں، لیکن کسی نے سید حامد جلالی مرحوم کی اس کتاب کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا، جو یقیناً علمی و ادبی دیانت کے خلاف ہے۔ مجھے بھی اس کا علم یوں ہوا کہ ماہنامہ "کتاب" (لاہور) کے اقبال نمبر میں صفحہ ۵۰ پر سلیم اختر صاحب نے اس پر نہایت اچھے انداز میں تبصرہ کیا۔ میں تبھی سے اس کی تلاش میں تھا اور مایوس ہو چلا تھا، آپکے کرم سے مراد حاصل ہو گئی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

اس سلسلے میں اب آپ سے یہ گزارش ہے، آپ اپنی اس زندگی میں کم از کم یہ کام تو کر جائیں کہ اپنے ددھیال اور ننھیال کا ایک مکمل و مفصل شجرہ مرتب کرا دیں جس میں دونوں خانوادوں کے افراد (مردوں اور عورتوں) کے نام، جہاں سے آپ کے علم میں فی الحال ہوں یا کوشش کرکے معلوم ہو سکیں وہاں سے اب تک کے سب شامل ہوں۔ اگر پیدائش اور موت کی تاریخیں یا کم از کم مہینے اور سال بھی ہر ایک نام کے ساتھ ہوں تو مزید تکمیل ہو گی۔ یہ کام اب نہ ہوا تو پھر کبھی نہ ہو سکے گا۔ "اقبالیون" کو تو علامہ کے نام کا ورد لگا کر اپنی دکان چلانی ہے، جس کے لیے "اقبالیات" کا یہ پہلو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ تو اسکی اہمیت کو ضرور تسلیم کرتے ہوں گے۔ خدا کے فضل سے آپکے صاحبزادے آپکے معاشی سلسلہ میں مددگار ہیں، لہٰذا فرصت نکال لینا کچھ دشوار نہ ہو گا۔ جاوید اقبال صاحب تو اپنے عدالتی فرائض میں ایسے غلطاں و پیچاں ہیں کہ ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی، لہٰذا آپ ہی سے درخواست ہے۔

شیخ عطاءاللہ صاحب کو جب علامہ نے اپنا شجرہ نہیں بتایا تو اس وقت ہی مجھے یہ بات کھٹکی تھی، ایک طرف تو وہ علامہ پر اپنے احسانات کا اس طرح سے ذکر کرتے ہیں لیکن ایسے موقعہ پر انہیں نظرانداز کر دیتے ہیں تو کیا وجہ ہے؟ اب ان کا کردار سامنے آیا تو وجہ سمجھ میں آ گئی کہ علامہ جانتے تھے کہ اگر انہیں دونوں بچوں کی سرپرستی اور جائیداد کی نگرانی کرنے والوں میں شامل کر دیا تو کیا ہو گا۔ وہ سب کو مقدمہ بازی کیلئے برانگیختہ رہے، ایسی ان کا مقصد ان کو اور دونوں بچوں کو پریشانیوں میں گرفتار کرکے علامہ سے انتقام لینا تھا۔ ہاں ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، حامد جلالی صاحب نے بڑے وثوق سے عطاءاللہ صاحب کو خاندانی بتایا ہے لیکن جتنے بھی تحقیق کے ساتھ خالد نظیر صوفی صاحب نے "اقبال درون خانہ" میں اس کی تردید کی کوئی دستاویزی ثبوت دونوں میں سے کسی نے بھی پیش نہیں کیا۔ حامد جلالی صاحب نے بغیر اس قسم کے ثبوت کے یہ الزام کیسے لگا دیا؟

باوجودیکہ سرکاری طور پر علامہ کی پیدائش ۱۸۷۷ء کی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن اختلاف کا سلسلہ جاری ہے۔ حامد جلالی مرحوم نے بھی کوئی سال وثوق سے نہیں بتایا۔ آپکے علم میں کیا آیا اور ذریعہ علم کیا ہے؟

میں خالد نظیر صوفی صاحب کو انکی مذکورہ بالا کتاب کے سلسلہ میں خط لکھنا چاہتا ہوں۔ انکے پتہ سے مطلع فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔

باوجود تنگدستی و نظر کی کوتاہی کے بھی علامہ کے افکار و گفتار و کردار کا موضوعی مطالعہ یہ معلوم کرنے کیلئے کر رہا ہوں کہ "اقبالیون" نے جو انہیں انبیاء کی طرح معصوم عن الخطاء سمجھ رکھا ہے، یہ کہاں تک درست ہے۔ والسلام

ممنون کرم و محتاج مزید
خسروی

اساتذہ صاحبان

آفتاب اقبال صاحب کے اساتذہ صاحبان کے تذکرے میں سر فہرست علامہ سید میر حسن مرحوم کا نام نامی اور اسم گرامی ہے اور بیٹے کی خوش قسمتی ہے علامہ میر حسن مرحوم سے فارسی زبان کی تحصیل کا موقع میسر آیا۔

علامہ میر حسن مرحوم مشن کے اسکول سے وابستہ ہوئے اور اسکول نے کالج کا درجہ حاصل کیا تو مشنری ادارے کے ناظمین نے علامہ میر حسن کو کالج میں اعلیٰ درجوں میں عربی اور فارسی کی تدریس پر مامور کیا اور میر حسن مرحوم نے بھی تدریس کے پیشے کو مرتے دم تک اپنائے رکھا اور تقریباً" ساٹھ سال تک تدریس سے وابستہ رہے ،بصارت سے محرومی کے بعد تدریس سے کنارہ کشی اختیار کی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب نے علامہ سید میر حسن لکھ کر علامہ اقبال کے استاد گرامی کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اور مشنری اسکول کے دوسرے استاد جناب غلام علی صاحب کا ذکر بھی ہونا چاہئے۔ جنھوں نے علوم جدیدہ اور انگریزی ادبیات کا ذوق پروان چڑھانے میں علامہ اقبال پر توجہ فرمائی۔

نشتر میڈیکل کالج ملتان کے بانی اور پرنسپل ڈاکٹر جمال بھٹہ صاحب اور تحریک پاکستان کے سرگرم رکن اور مولانا عبید اللہ سندھی کے دست راست اور علامہ اقبال کے دوست جناب اقبال شیدائی صاحب بھی علامہ اقبال کے استاد زادے ہیں۔

یہ بات دراصل برسبیل تذکرہ کہہ دی ،اب ہماری نسل نو کے ذہن میں علامہ اقبال کے حوالے سے ایسی باتیں کون لائے گا۔

علامہ میر حسن سے آخری دور میں استفادہ کرنے والوں میں علامہ غلام قادر فصیح

کے دو صاحبزادے مولوی ظفر اقبال صاحب اور ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب پرنسپل کنگ ایڈورڈ کالج لاہور، اے ڈی اظہر اور آفتاب اقبال صاحب کا نام لیا جاتا ہے۔

دہلی کے زمانہ قیام میں سی۔ ایف۔ اینڈریوز اور پرنسپل سُشیل کمار ردرا کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی استادی کا حوالہ بڑے بڑوں نے دیا ہے۔ ضیاالدین احمد برنی نے اپنی کتاب عظمت رفتہ میں اپنے استاد اینڈریوز صاحب کا خاکہ پیش کیا ہے اور آفتاب اقبال صاحب نے بھی اینڈریوز صاحب سے استفادہ فرمایا ہے۔ دہلی کے زمانہ طالب علمی میں اردو اور انگریزی زبان پر دسترس حاصل کی۔ اردو اور انگریزی کے اہل زبان سے مسلسل رابطے کی وجہ سے ان کے ادبی ذوق میں ایک نکھار پیدا ہوا۔ علامہ کے زمانہ قیام لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد کی فارسی دانی اور اردو ادب پر گہری نظر سے اہل لاہور نے فیض حاصل کیا اور علامہ کے ایک دوست مولوی احمد دین کی کتاب الفاظ کی سرگزشت مولانا آزاد کے اثر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سی۔ ایف۔ اینڈریوز : ۱۹۰۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرتے ہی اپنے دوست سید آصف علی کے مشورہ سے دہلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخل ہو گیا۔ اینڈریوز شروع ہی سے ہماری جماعت کے ٹیوٹر تھے اور اس وجہ سے مجھے ان کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

زمانہ طالب علمی میں میرے دوست ملا واحدی نے مجھ سے فرمائش کی کہ اینڈریوز صاحب سے نظام المشائخ کے لئے کوئی مضمون لکھوا کر دو۔ چنانچہ میری درخواست پر انہوں نے ایک مضمون سیکریٹ آف پریئر **(Secret of Prayer)** لکھ کر دیا جس کا ترجمہ سر الدعا کے نام سے رسالہ میں شائع ہوا۔ پھر خواجہ حسن نظامی کے ارشاد

پر میں نے اینڈریوز صاحب سے اسی رسالہ کے رسول نمبر کے لئے ایک مضمون لکھوایا جس میں انہوں نے واقعہ ہجرت کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا تھا۔ ان کے مضمون کا عنوان تھا رسول کا تیسرا ساتھی یہ مضمون اسلامی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا تھا اور فروری۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ان اللہ معنا کی تفسیر ہے۔

۱۹۱۱ء میں مولوی ذکاء اللہ کا انتقال ہوا۔ ان سے اینڈریوز کے بہت گہرے مراسم تھے۔ چونکہ میں مولوی صاحب کا ہم محلہ تھا۔ اس لئے اینڈریوز صاحب نے میرے ذمہ یہ خدمت سپرد کردی تھی کہ میں ان کی بیماری کی کیفیت روزانہ ان کے گوش گزار کردیا کروں۔ ان کی وفات کی اطلاع بھی انہیں میرے ہی ذریعہ سے ملی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ ان کی موت سے اس طرح متاثر ہوئے گویا خود ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہو۔

مولوی صاحب اینڈریوز کو بیٹا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ جس سے اینڈریوز بے حد خوش ہوتے تھے۔

۱۹۱۲ء میں اینڈریوز نے مولوی صاحب کے سوانح حیات لکھنے شروع کئے۔ اسی زمانہ میں میں نے بھی انہیں مولوی صاحب پر ایک طویل مضمون لکھ کر دیا۔ جس سے خوش ہو کر انہوں نے مجھے سوان پین (Swan Pen) عنایت فرمایا۔ ان کی کتاب ۱۹۱۴ء میں شائع ہو جاتی لیکن جنگ کی وجہ سے وہ نہ چھپ سکی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں اس لائف کو بالاقساط چھپوانا شروع کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کا ترجمہ کسی اچھے رسالہ میں شائع کروں۔ چنانچہ یہ کتاب زمانہ میں ماہ بماہ چھپتی رہی۔ اس کے بعد اینڈریوز صاحب نے ساری کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے کتابی صورت میں ۱۹۲۹ء میں شائع کرایا۔ مگر مرا ترجمہ تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی کتابی

صورت میں ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا جس کا مجھے ہمیشہ ملال رہے گا
کالج کے زمانہ کا ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن میں اسے بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرا ایک سرحدی ہم جماعت اس پرچہ میں فیل ہو گیا جسے اینڈریوز نے جانچا تھا۔ اس پر وہ بے حد بگڑا اور لگا ان کی شان میں اول فول بکنے۔ اس نے قتل کی دھمکی بھی دی تھی چنانچہ اینڈریوز صاحب نے میرے ذریعے اسے اپنے پاس بلوایا۔ وہ غریب اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ آخر مجھے ترجمانی کے فرائض ادا کرنے پڑے۔ وہ اپنی حرکت پر بے حد نادم تھا اور اس نے بغیر کسی پس و پیش کے معافی مانگ لی ،اور اینڈریوز صاحب نے مسیح کے سچے پیرو کی حیثیت سے اسے بالکل معاف کر دیا۔ اس واقعہ کے چند ہی روز بعد وہ اپنے وطن مالوف چلا گیا۔

ایک دن اینڈریوز نے ہماری جماعت کے تختہ سیاہ پر یہ عبارت لکھوا دی ایک لڑکے کو
(Mr. Andreous will not take his classes to-day)
جو شرارت سوجھی تو اس نے کلاسز کا ابتدائی حرف سی مٹا دیا۔ دوسرے دن جب اینڈریوز جماعت میں آئے تو انہوں نے بورڈ پر یہ عبارت لکھی ہوئی دیکھی۔

Mr. Andreous will not take his lasses to-day

اینڈریوز نے کسی سے کچھ نہیں کہا بلکہ مسکراتے ہوئے بورڈ کی طرف بڑھے اور لفظ لیسیز کا ابتدائی حرف ایل مٹا دیا اور اب عبارت یہ رہ گئی Mr. Andreous - will not take his asses to-day جماعت کے سب لڑکے اس لطیفہ سے بے حد لطف اندوز ہوئے۔

اینڈریوز ایک دن شیکسپیر پڑھا رہے تھے۔ اتفاق سے اس میں ایک ایسا مقام آیا جس کے مفہوم کے بارے میں انہیں شبہ تھا۔ انہوں نے جماعت کے لڑکوں سے کہا کہ اس

کا مطلب کل بتاؤں گا۔ مجھے اس کے صحیح مفہوم کے بارے میں کچھ شک ہے اور کوئی
پروفیسر ہوتا تو وہ اسے اپنی سبکی خیال کرتا اور ہر گز اسقدر صفائی نہ برتتا۔ مگر اینڈریوز
نے انکساری سے وہ بات کہہ دی جسے صرف وہی کہہ سکتے تھے۔

نومبر ۱۹۳۷ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے دہلی سے اپنی نشری تقریر
میری کالج کی زندگی میں بیان کیا۔ مسٹر اینڈریوز کا پڑھانا غضب کا پڑھانا تھا۔ معلوم
ہوتا ہے کہ ایک دریا بہہ رہا ہے۔ ٹینی سن کی In Memorium کا پڑھانا ان کا ذمہ
تھا۔ ان کی پڑھائی کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کتاب کے شروع میں جو افتتاحی نظم
ہے ،اس کو انہوں نے سو دن میں پورا کیا تھا۔ تصوف اور ویدانت کے اصول بیان
کر کے اور حضرت امام غزالی ،ابن عربی ،مولانائے روم اور گیتا کے حوالے دے کر
جب وہ ان کا مقابلہ ٹینی سن کے مصرعوں سے کرتے تھے تو آنکھیں کھل جاتی تھیں اور
معلوم ہوتا تھا کہ ان کی واقفیت عامہ کس قدر ہے اور ٹینی سن نے کس محنت سے ان
چیزوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے اور کس خوبی سے اس کتاب میں داخل کیا ہے۔ اور ساتھ
ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان باتوں میں ابھی یورپ والے ہم ایشیا والوں سے کتنے پیچھے
اور ہمارے کس قدر خوشہ چین ہیں۔ اس طرح پڑھاتے ہوئے میں نے دو ہی اشخاص
کو دیکھا ہے ; ایک مسٹر اینڈریوز اور دوسرے مولوی نذیر احمد مرحوم ۔ مولوی
صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ وہ حماسہ ،معلقات اور متنبی کے ہر شعر کے ساتھ یورپ
کے مختلف ادیبوں کے معقولے بیان کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ دیکھو اس مضمون کو
یورپ والوں نے ہم سے لے کر اس طرح ادا کیا ہے۔ دونوں کا پڑھانا صرف امتحان
پاس کرانے کے لئے نہیں تھا ،عالم بنانے کے لئے تھا اور ان سے پڑھنے کے بعد ہم
سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان دونوں کی عزت ان کی علمیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی

وجہ سے۔

ایک دن اینڈریوز نے کالج تقریر میں کرتے ہوئے فرمایا کہ شادی شدہ زندگی عیسائیت کی تعلیم کے خلاف ہے اور مسیحی نقطہ نظر سے پاکیزہ زندگی کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے تجرد کی بہت تعریف کی ہے اور کہا کہ بہترین زندگی یہی ہے جو ہمارے یسوع مسیح نے بسر کی تھی۔ بعض پروفیسروں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ شادی شدہ زندگی گناہ کی زندگی ہے۔ چنانچہ اس پر کافی ہیجان ہوا۔ چند دن بعد انہوں نے تقریر میں اس کی تردید کردی اور فرمایا۔ مزید غور وفکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شادی شدہ بھی تجرد کی زندگی کی طرح پاک ہے۔ وہ مذہبی امور بے حد غور وفکر کرنے کے عادی تھے اور اپنی آراء کا برملا اور بیباکی سے اظہار کیا کرتے تھے۔

اینڈریوز صاحب شروع ہی سے مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے عبداللہ الماعون سہروردی کی کتاب مجھے تحفہ کے طور پر دی۔ اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں اور ۳۰ نومبر ۱۹۱۱ء کی تاریخ درج ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب What i owe to christ کا آخری مسودہ جس میں کچھ حصہ تو ٹائپ شدہ ہے اور باقی سارے کا سارا خود ان کے دست خاص کا لکھا ہوا ہے ، ممبئی میں مجھے عنایت فرمایا۔

کالج کے زمانہ میں اینڈریوز ، سی۔ ٹی ینگ اور دوسرے یورپین پروفیسر طلبا کے ساتھ ہاکی ، کرکٹ ، اور ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ اس قسم کے کھیلوں میں شریک رہ کر وہ نہ صرف طلبا کو کھیلنا سکھاتے تھے بلکہ ان میں نظم و نسق بھی پیدا کرتے تھے۔ وہ ہمیں سکھاتے تھے کہ ہارنے کی حالت میں کبھی مایوسی کو پاس نہ آنے دو جیتنے کی حالت میں وہ

ہمیں سکھاتے تھے کہ جیت سے اس قدر خوش نہ ہو کہ بالکل آپے سے باہر ہو جاؤ۔ وہ ہمیں اس امر کی بھی تعلیم دیتے تھے کہ اچھا کھیل کھیلو اور اچھے کھیل کی داد دو خواہ اچھے کھیل کا مظاہرہ فریق مخالف کی طرف سے کیوں نہ کیا جائے۔

ان کی آخری علالت سے چند سال قبل میرے دل میں خیال آیا کہ میں ان کی لائف لکھوں۔ لیکن مجھے مکمل مواد نہ مل سکا۔ اس اثنا میں میرے دوست بنارسی داس چترویدی ایم۔ پی نے انگریزی میں حیات اینڈریوز شائع کر دی۔ اسے دیکھ کر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں اسے اردو میں منتقل کر دوں۔ چنانچہ اس کے پبلشرز جارج ایلن اینڈ انون کی اجازت سے میں نے آپ بیتی ایف سی اینڈریوز کے نام سے اس کا ترجمہ شائع کر دیا۔ یہ ان کی مکمل سوانح عمری ہے۔

اینڈریوز کی زندگی کا کافی حصہ جنوبی افریقہ سے گزرا جہاں رہ کر انہوں نے ہندوستانی باشندوں کے لئے بہت سے مفید کام کئے۔ انہی کی وجہ سے جنرل اسمتھس اور گاندھی جی میں باعزت معاہدہ ہو سکا۔

اسی ایک سفر سے جب وہ جنوبی افریقہ سے لوٹے تو ممبئی میونسپل کارپوریشن نے ان کی خدمت میں ۲۳ اگست ۱۹۲۷ء کو ایک سپاسنامہ پیش کیا جس میں ان کی خدمات کو نہایت شاندار الفاظ میں سراہا گیا تھا اور خدا سے دعا کی گئی تھی کہ وہ انہیں عرصہ دراز تک زندہ و سلامت رکھے تاکہ امن کے پیغامبر کی حیثیت سے جو کام وہ کر رہے ہیں اسے پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اس ایڈریس میں بالتصریح ان خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا جو انہوں نے جنوبی افریقہ، گائنا، فجی، کینیا، یوگنڈا اور ٹانگانیکا میں ہندوستانیوں کے لئے انجام دی تھیں۔

مسلم لیڈروں میں مولانا محمد علی، حکیم محمد اجمل خان، سر علی امام وغیرہ سے ان

کے تعلقات بے حد دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔ جس زمانہ میں مولانا محمد علی بیجاپور جیل میں قید تھے اس وقت اینڈریوز نے انہیں ایک خط بھیجا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ چونکہ میں ایمانداری کے ساتھ کلیسائے انگلستان کے بعض عقائد کو نہیں مانتا اس لئے میں نے پادری کے فرائض بجالانے سے دست برداری کرلی ہے۔ ان عقائد میں یہ عقیدہ بھی شامل تھا کہ نجات صرف مسیح کے ماننے والوں کے لئے ہے اور جو لوگ انہیں نہیں مانتے وہ سب جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ اینڈریوز کہا کرتے تھے کہ میں یہ کیسے مان لوں کہ مہاتما گاندھی، رابندرناتھ ٹیگور اور ذکا اللہ جیسے آدمی جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ اینڈریوز کی یہ اخلاقی جرات حد درجہ قابل تعریف ہے۔

اینڈریوز کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ ہندوستان میں رہ کر وہ ہمیشہ انہیں اپنی زندگی کے تمام واقعات سے باقاعدگی کے ساتھ مطلع کرتے رہتے تھے۔ جب انہیں اپنی ماں کی وفات کی خبر ملی تو وہ بچوں کی طرح بلبلا بلبلا کر روئے۔ انہیں آخر وقت تک اپنی ماں کا صدمہ رہا اور اس کے بعد انہوں نے میری ماں کے عنوان سے بہت دل گداز مضمون لکھا۔ زندگی بھر جس شخصیت کا ان پر سب سے زیادہ اثر رہا وہ ان کی ماں تھی۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں اینڈریوز اٹلی اور بلقانی ریاستوں کے مظالم سے بے حد متاثر تھے۔ وہ ان مظالم کو عیسائیت کے دامن پر پانیئر داغ سے تعبیر کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم چند مسلمان طالب علم صبح کے پانیئر میں سقوط ایڈریانوبل کی خبر پڑھ کر پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے کہ اتنے میں اینڈریوز نے ہمارے غم دیدہ چہروں کو دیکھ کر کہا: میرے بیٹو! آپ کی اس قومی مصیبت میں میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔ بہر حال میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ صورت حالات زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہے گی۔ عظیم المرتبت ترکی قوم کو خدا تعالی نے حیرت انگیز طاقت اور

لچک عطا فرمائی ہے۔ وہ بہت جلد اپنے ملک اور اپنے وقار کو دوبارہ حاصل کرے گی جسے وہ اپنے نااہل لیڈروں کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی بدولت کھو چکی ہے۔ اینڈریوز ترکوں کی شرافت کے بے حد مداح تھے اور اس امر کے بھی معترف تھے کہ انہوں نے نہایت پامردی سے شکستوں کو برداشت کیا ہے۔

۱۹۳۴ء میں ،میں نے ازراہ محبت اینڈریوز صاحب کی کتاب Ideas of Mahatma Ghandhi کو اردو میں خیالات مہاتما گاندھی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ اس طرح میں نے ان کے بہت سے دوسرے مضامین کا ترجمہ بھی شائع کیا تاکہ اہل ہند کو ان کی خدمات کا پورا پورا علم رہے۔ خیالات مہاتما گاندھی کو میں نے بلبل ہند مسز نائیڈو کے نام ڈیڈیکیٹ کیا تھا جو اینڈریوز کی گہری دوست تھی ۔اینڈریوز کالج میں ہمیشہ سیرت کی تعمیر میں زور دیا کرتے تھے۔ وہ شیکسپیئر کے ماہر تھے اور اسے پڑھاتے وقت وہ جس انہماک کا اظہار کرتے تھے اس کا اندازہ ان کے شاگرد ہی لگا سکتے تھے۔ وہ شیکسپیئر کے جذبہ آزادی کے بڑے قدردان تھے اور چاہتے تھے کہ طلبا ان جذبات کو اپنا لیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ شیکسپیئر کی زبان بولنے والا کبھی غلام نہیں رہ سکتا۔

وہ خود اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کے میدان میں وہ بائیں ہاتھ سے کرکٹ کھیلتے تھے ،لیکن لکھتے وہ سیدھے اور الٹے ہاتھوں سے صاف اور اعلیٰ درجہ کی تحریر لکھنے کے عادی تھے۔ وہ صفحے کے صفحے بغیر کسی ردوبدل کے لکھتے چلے جاتے تھے۔ ان کا خط بہت پاکیزہ تھا۔

دہلی کے مشن کالج میں چند سال کام کرنے کے بعد وہ ۱۹۱۴ء میں شانتی نیکتین چلے گئے جہاں انہیں رابندر ناتھ ٹیگور کی رفاقت میسر آئی۔ اس کے بعد انہیں انگلستان

اور ہندوستان کے درمیان غیر سرکاری سفیر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں وہ انگلستان کے سفر میں ہر جگہ گاندھی جی کے ساتھ ساتھ رہے۔ وہاں رہ کر انہوں نے ان بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا جو گاندھی جی کے متعلق برطانوی حکومت اور عوام کے دل میں پیدا ہو گئی تھیں۔

ذاتی طور پر اینڈریوز نہایت پاکیزہ فضائل کے مالک تھے۔ وہ انتہائی مذہبی آدمی تھے ۔ان کا مقصد حیات محض یہ تھا کہ وہ مسیح کی زندگی کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں ۔چنانچہ مرنے سے پیشتر جب ایک صاحب ان سے ملنے کے لئے گئے تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ آپ بتائیے کہ آیا میری زندگی حضرت مسیح کی زندگی کے مطابق بسر ہوئی ہے یا نہیں۔ انہیں جواب دیا گیا کہ یہ بات تو آپ کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر قایل رہے ہیں۔ آپ کے نام کے ابتدائی حروف ہیں سی ،ایف ،اے یعنی کرائسٹس فیتھفل الائیChrist's Faithful Ally- یہ سن کر انہوں نے فرمایا: میرے لئے یہ احساس کافی ہے کہ غیر عیسائی ہی یہ سمجھتے ہیں کہ میری زندگی حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے عین مطابق گزری ہے۔ اب میں اطمینان کے ساتھ جان دے سکوں گا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو مرتے وقت اپنے دل سے یا دوسروں سے اس قسم کا سوال کرتے ہوں! اینڈریوز کی شکل وصورت بھی مسیح کی مروجہ تصویر سے کافی حد تک مشابہ تھی۔

اینڈریوز نے قرآن مجید کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنی مختلف کتابوں میں انہوں نے جا بجا قرآنی آیات درج کی ہیں۔ انہوں نے دوسرے پادریوں کی طرح کبھی اسلام کو برا بھلا نہیں کہا بلکہ اسلام کے بعض عقائد سے وہ پورے طور پر ہم آہنگ رہے۔ وہ اسلام کی حملہ اصلاحی کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے ذریعہ

اسلام نے بنی نوع انسان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اینڈریوز نے شملہ میں مولوی شمس الدین سے اردو پڑھی تھی اور بڑی حد تک انہی سے اسلام کی باتیں معلوم کی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ نے اسلام کو سمجھانے میں میری سب سے زیادہ امداد کی ہے اور انہی کی وجہ سے میں اس کی عظمت سے واقف ہو سکا ہوں۔

اینڈریوز کی آمدنی کا ذریعہ زیادہ تر ان کی کتابیں تھیں یا وہ مضامین تھے جو مختلف جرائد میں نکلتے تھے۔ وہ اپنی ذات پر بہت کم روپیہ صرف کرتے تھے۔ ممبئی میں وہ مختلف جگہ ٹھہرتے تھے۔ کبھی انڈین سٹی زن شپ ایسوسی ایشن کے سیکریٹری ایس۔ اے۔ واعظ کے یہاں، کبھی جے۔ بی۔ پیٹ کے یہاں اور کبھی ڈاکٹر کھمباٹا کے یہاں۔ وہ کہیں ٹھہریں سائل، ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ اینڈریوز ان سب کی امداد کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے اور جو لوگ ان کی اس کمزوری سے واقف تھے وہ پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ اینڈریوز بے حد بھولے انسان تھے۔

متحدہ ہندوستان کو آزادی دلانے میں اینڈریوز کا کچھ کم حصہ نہیں ہے۔ وہ ان انگریزوں میں سے تھے جنہوں نے ہندوستان کو آزادی سے ہم کنار کرنے میں اپنی ساری زندگی قربان کر دی۔ ایک طرف وہ انگریزی حکومت کو بتاتے تھے کہ اس کے نااہل افسر ہندوستانیوں پر کیا کیا ظلم ڈھا رہے ہیں اور دوسری طرف ہندوستانیوں کو تیار کرتے تھے کہ وہ جلد سے جلد غلامی کا جوا اتار پھینکیں اور مکمل آزادی حاصل کریں
انہوں نے جس تن دہی، انہماک اور خلوص سے ہندو پاکستان کی خدمت کی ہے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان کی ذات پر یہ بر اعظم صدا فخر کرے گا۔ انہوں نے ۳۶

برس تک متحدہ ہندوستان کی خدمت کی اور خدمت کرتے کرتے ان کا جسم تھک گیا اور آخر کار وہ ۵ اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ گئے۔ ان کی موت کلکتہ کے ایک ہسپتال میں جمعہ کے دن ہوئی اور ان کی آخری خواہش کے مطابق انہیں سینٹ پال کے گرجا میں دفن کیا گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(عظمت رفتہ۔ ضیاء الدین احمد برنی)

نوٹ: مولانا حامد جلالی مرحوم نے اپنی کتاب علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی ایک مضمون کے رد عمل کے طور پر نہایت ہی مختصر وقت میں ترتیب دی تھی اور اس میں مذکور بہت سی شخصیات کے تعارف کے بغیر قاری کو کتاب پڑھتے وقت کوئی خاص احساس نہیں ہوتا کہ وہ کن ناموں پر نگاہ ڈال رہا ہے۔ اینڈریوز کی شخصیت پر ایک مکمل کتاب انگریزی زبان میں موجود ہے اور اس کا ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی نے اردو میں کیا ہے۔ اینڈریوز کی شخصیت کے بارے میں پڑھ کر حق گوئی اور بے باکی کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔ انگریز مکاری اور عیاری کے پتلے نہیں ہوتے بلکہ حق گوئی کے میدان میں وہ مسلمانوں کے ہم پلہ ہیں ایسے عیسائی خال خال سہی ،اس خطہ ارض پر تدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے ہیں اور ان کے طلبا پر اثرات پڑے ہیں۔ ہمارے دور میں فرقہ واریت کا فتنہ ہماری ناپختہ تربیت کا آئینہ دار ہے اور جوں جوں تربیت پر توجہ دی جائے گی امن کی روشنی سے ہمارا معاشرہ منور ہوتا جائے گا۔

یہ خاکہ ضیاء الدین احمد کی کتاب عظمت رفتہ سے ماخوذ ہے۔ صاحب مضمون ایک ماہر اقبالیات کے علاوہ سروجنی نائیڈو اور علامہ اقبال سے ملے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی

قائم رکھا۔ عطیہ فیضی کی انگریزی کتاب اقبال کا ترجمہ اردو میں شائع کیا۔ سندھ اکیڈمی کے مالک علاؤالدین خالد، برنی صاحب کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد یہ خاندان نقل مکانی کر کے کراچی وارد ہوا اور یہیں برنی صاحب آسودہ خاک ہوئے۔ مشہور خطاط یوسف دہلوی، برنی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔

تقسیم ملک سے بہت پہلے ضیاء الدین احمد برنی کے والد محترم منشی محمد الدین سمبڑیال (سیالکوٹ) سے نقل مکانی کر کے دہلی پہنچے تھے اور پھر دہلی کے نامور لوگوں سے مراسم بڑھے اور ان کے فن خطاطی کے لوگ مداح تھے۔ منشی محمد الدین صاحب کی ایک صاحبزادی بھی خطاطہ تھی اور ۱۹۶۷ء میں عروس البلاد کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ برنی صاحب کے بھتیجے جناب علاؤالدین خالد صاحب نے سندھ اکیڈمی کی کتابوں کی تشہیر کے بسلسلے میں ایک ماہوار جریدے کتابی دنیا کا انہیں مدیر مقرر کیا تھا اور آخر دم تک وہ کتابی دنیا کی ادارت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آخر ۱۹۶۷ء میں ضیاء الدین احمد برنی اللہ کو پیارے ہوگئے اور کراچی میں آسودہ خاک ہوئے۔ ضیاء الدین احمد برنی کو اردو اور انگریزی پر کامل عبور حاصل تھا اور ترجمہ کے فن کے ایک ماہر مانے جاتے تھے۔ علامہ اقبال سے ان کی خط و کتابت تھی اور اپنی کتاب عظمت رفتہ میں علامہ اقبال کے خاکے میں بہت سی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ (رشیدہ بیگم)

"عرفان اردو" لندن میں منعقدہ ادبی محفل (جنوری 84ء) میں بیگم آفتاب اقبال علامہ کا کلام سنا رہی ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے شعراء بھی شریکِ محفل ہیں۔
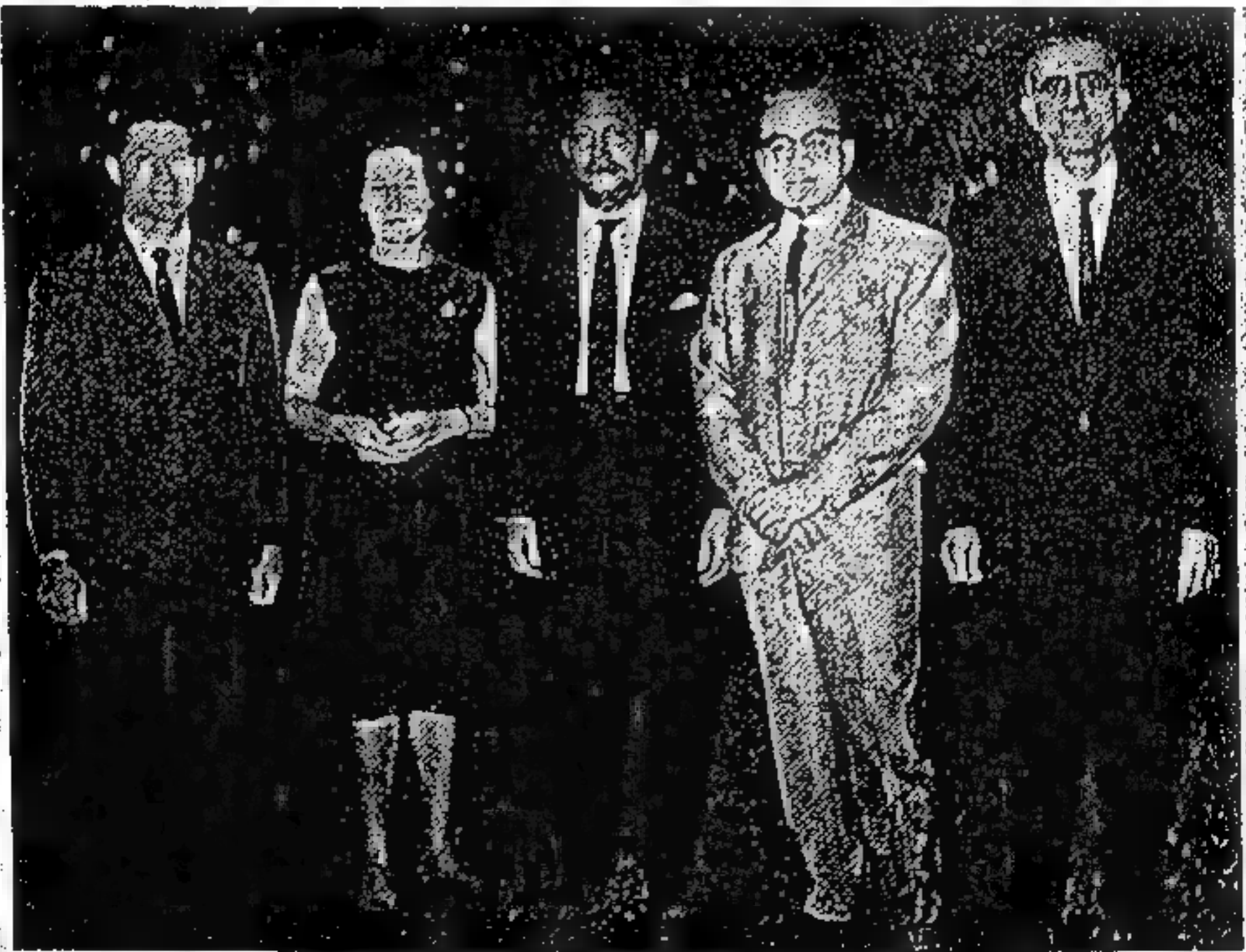
کراچی میں ایران کے قونصل جنرل کے ساتھ آفتاب اقبال صاحب کی تصویر (۷ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

یوم اقبال کی ایک تقریب میں شرکاء کا گروپ فوٹو
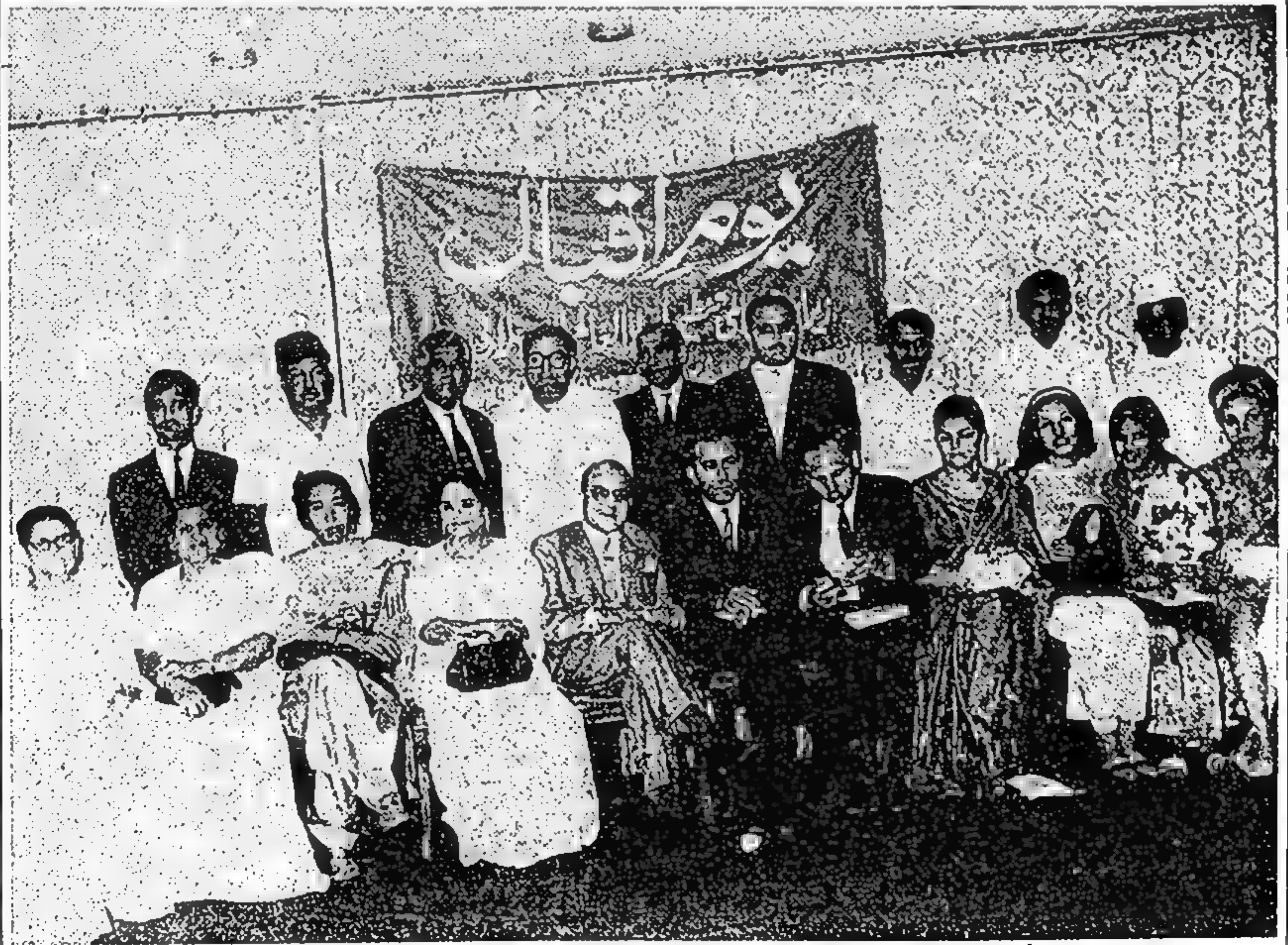
یوم اقبال کی ایک تقریب میں شرکاء کی تصویر

اظہار تشکر

کتاب کی تدوین کے سلسلے میں میرے معتمد ماسٹر محمدؐ اکرام صاحب نے انتہائی تن دہی اور انہماک سے مطلوبہ معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں ادارہ یادگار غالب۔ بہادر یار جنگ کتب خانہ، لیاقت نیشنل لائبریری اور نامور محققین سے استفادہ کرتے ہوئے معلومات فراہم کیں۔ بہر کیف ماسٹر صاحب کی ذاتی دلچسپی اور خاندان اقبال سے والہانہ محبت کی وجہ سے نایاب معلومات حاصل ہوئیں۔ کتاب کمپوزنگ کے آخری مراحل میں تھی اور چند اچھوتے مضامین سوجھے اور ماسٹر صاحب نے بلا تامل انہیں شامل کتاب کرنے کی ہامی بھر لی۔ میں ان کی پابندی اوقات اور ایفائے عہد اور کتاب کو وقیع بنانے کی مساعی سے تہہ دل سے مشکور ہوں۔

۱۹۹۷ء میں سیالکوٹ کے دورے میں انہوں نے چوہدری ریاست علی صاحب (لائبریرین سیرت سٹڈی سینٹر سیالکوٹ کینٹ و سابق لائبریرین علامہ اقبال لائبریری پیرس روڈ سیالکوٹ) سے متعارف کروایا۔ چوہدری صاحب نے اکابرین سیالکوٹ (علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور خان بہادر لام دین) اور آفتاب اقبال صاحب کے بچپن کے دوستوں کے بارے میں معلومات کا ایک خزینہ عطا کیا، تصاویر اور نایاب تحریریں الگ ہیں۔ مجھے چوہدری صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے اور ساتھ ہی یہ کہنا ہے کہ کتاب کے صفحات کو کم کرنے کے لئے ان کی بہت سی معلومات کو کتاب میں جگہ نہیں دے رہی۔ انشاء اللہ کسی دوسری کتاب میں ان سے استفادہ کیا جائے گا۔

سید نور محمد قادری کے فرزند ارجمند سید محمد عبداللہ قادری کے تاریخی خطوط، علامہ اقبال کے مرشد گرامی قاضی سلطان محمود قادری اور ایک مضمون بھیجنے کا شکریہ۔ کتاب کے صفحات کو کم کرنے کے سلسلے میں ان کا ذاتی قیمتی مضمون شامل کتاب نہیں۔
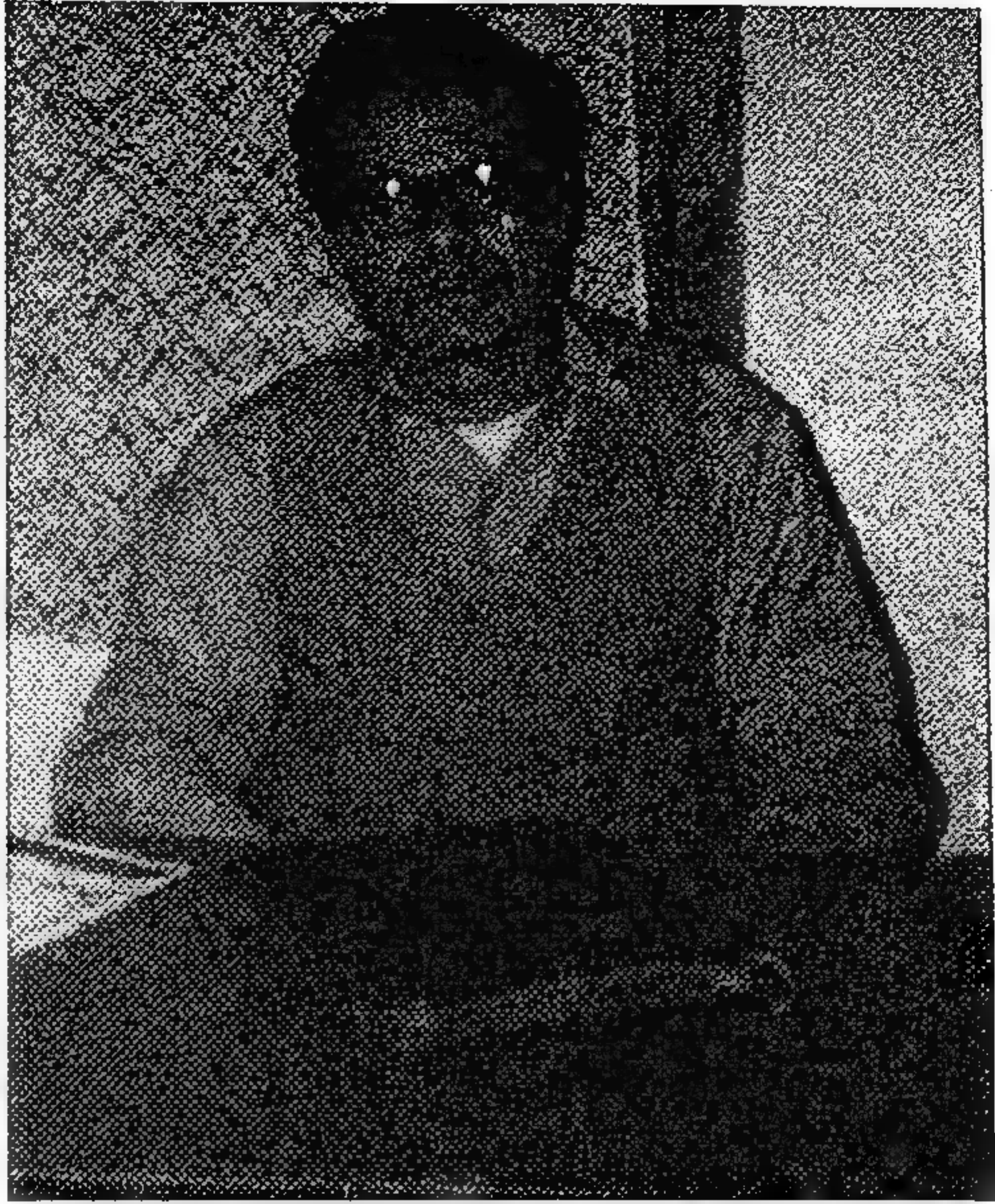
ماسٹر محمد اکرام کراچی۔
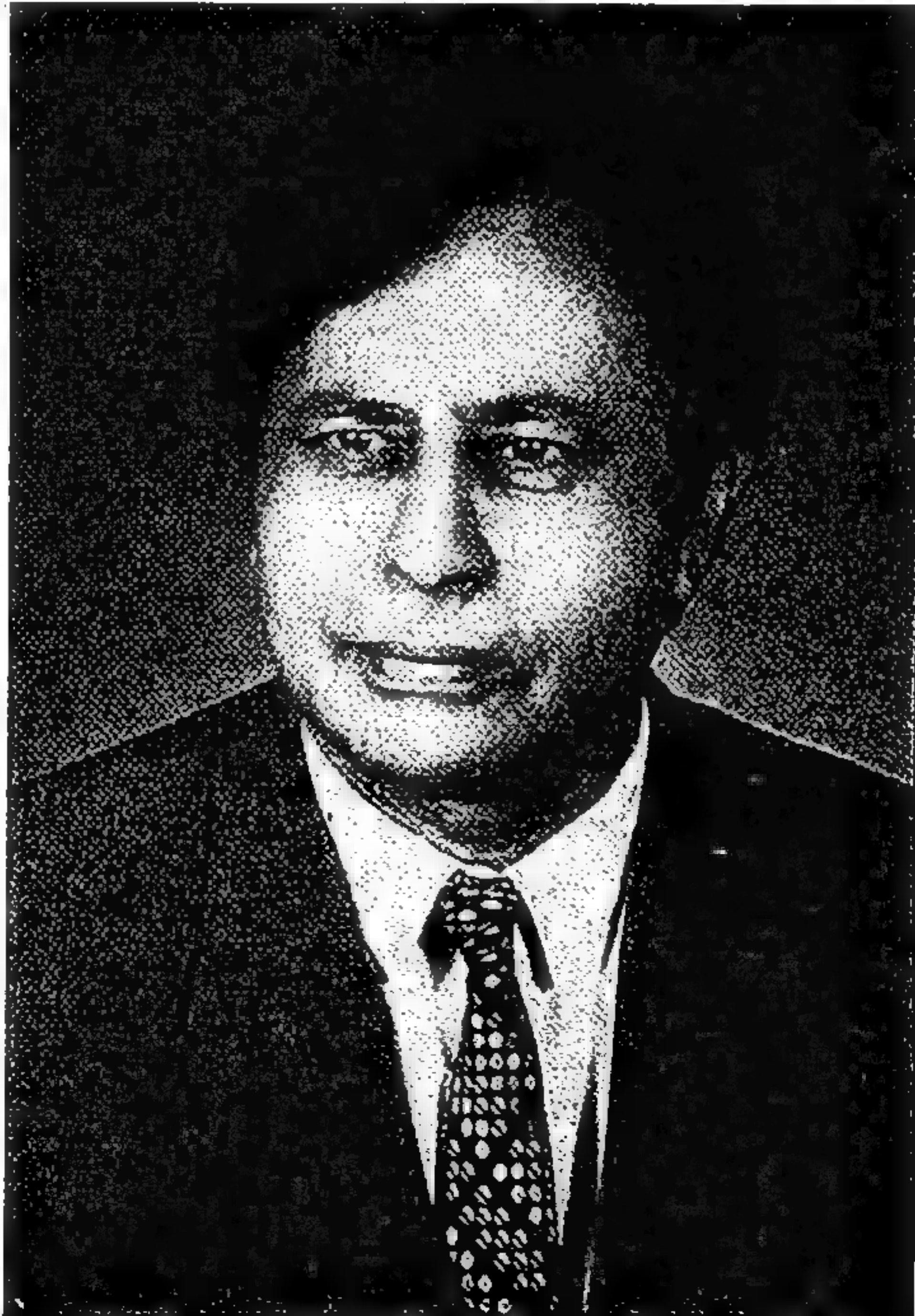
چوہدری ریاست علی صاحب لائبریرین سیرت سٹڈی سینٹر سیالکوٹ کینٹ

کتابیات

کتب

کتاب	مصنف
اقبال اور گجرات	ڈاکٹر منیر احمد سلیچ صاحب
اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندوی صاحب
اطراف اقبال	پروفیسر ملک حسن اختر صاحب
اوراق گم گشتہ	پروفیسر رحیم بخش شاہین صاحب
اقبال سب کے لئے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب
اقبال کے ہم نشیں	پروفیسر صابر کلوروی صاحب
حیات مستعار	جلیل احمد قدوائی صاحب
حیات شیخ سردار محمد	وحیدہ روشن صاحبہ
جمال زندگی	خواجہ بدرالاسلام فروغی صاحب
حیات اقبال	ایم۔ ایس۔ ناز صاحب
خدوخال اقبال	محمد امین زبیری صاحب
خواجہ پنجاب	مرزا امجد بیگ صاحب
خفتگان کراچی	پروفیسر محمد اسلم صاحب
خفتگان خاک لاہور	پروفیسر محمد اسلم صاحب
دائرہ معارف اقبال	پروفیسر ملک حسن اختر صاحب
دانائے راز	سید نذیر نیازی صاحب
ذکر اقبال	مولانا عبدالمجید سالک صاحب
روزگار فقیر	فقیر سید وحیدالدین صاحب
زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب
شاعر مشرق	بشیر فاروق صاحب
عکس اقبال	ڈاکٹر عبدالواحد صاحب
مظلوم اقبال	شیخ اعجاز احمد صاحب

مکالمات اقبال	پروفیسر سعید راشد صاحب
معاصرین اقبال کی نظر میں	محمد عبداللہ قریشی صاحب
مادر ہم درد	خواجہ حسن نظامی صاحب
تلاش اقبال	خالد حامدی صاحب

خطوط

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب	لاہور
ڈاکٹر وحید عشرت صاحب	لاہور
پروفیسر صابر کلوروی صاحب	پشاور
اکبر علی خان عرشی زادہ صاحب	رام پور۔ بھارت
کنور اعظم علی خان خسروی صاحب	کراچی
سید محمد فاروق القادری صاحب	رحیم یار خان
سروش عرفانی صاحب	اسلام آباد
خواجہ فاروق صاحب	لاہور

حواشی

سوانح آفتاب اقبال

باب اول

۱- حیات مستعار جلیل احمد قدوائی صفحہ ۱۱

۲- ریٹائرڈ ٹیچر جناب فضل حسین جنجوعہ صاحب ساکن اوڈھروال ضلع چکوال

۳- علاؤالدین خالد مرحوم مالک اردو اکیڈمی سندھ کراچی

۴- مانچسٹر ہاؤس کراچی کے مالک جناب محمد یوسف PECHS کے علاقے میں مقیم ہیں

۵- شیخ عطا محمد بنام آفتاب اقبال محررہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء

۶- میں نے انہیں پہلی بار ۱۹۴۳ء میں کلکتہ میں دیکھا ہے۔ کلکتہ میں وہ پامسٹ کی حیثیت سے اپنی روزی کماتے تھے۔ پاکستان کی تشکیل کے تھوڑے عرصہ بعد وہ انتقال فرما گئے۔

باب دوئم

۱- ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ میرے بیٹے پاشا اور بہو زرناز کو ناظرہ قرآن پاک کی تعلیم دینے پر مامور تھے۔ آفتاب اقبال صاحب کے بچپن کے دوست تھے اور ان کے احباب کے احوال میں ان کا حال دیا گیا ہے۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے۔

۲- آقا جی ایک روحانی شخصیت تھے۔ مدرستہ البنات جالندھر کے بانی تھے۔ اس مدرستہ البنات کے معائنے کے لئے ہندوستان کے مقتدر علماء کے علاوہ قائداعظم بھی

تشریف لائے تھے۔ دار البنات کے ترجمان رسالے مسلمہ کے عبدالحق عباس نمبر میں ان کے حالات زندگی ملاحظہ کیئے جاسکتے ہیں۔ آفتاب اقبال صاحب کا نکاح انہوں نے پڑھایا تھا۔

۳۔ آپ میرے خاندان کے مرشد گرامی ہیں اور ان کے حالات زندگی کے بارے میں میرے برادر بزرگ مرزا احمد بیگ صاحب نے خواجہ پنجاب کے نام سے کتاب ترتیب دی ہے اور اسے میں نے کراچی سے شائع کیا ہے۔

۴۔ مشہور ماہر اقبالیات جن کا تعلق گجرات ضلع سے تھا اور ان کے اجداد سیالکوٹ شہر میں بستے تھے۔ منڈی بہاؤالدین میں چک شمالی میں رہائش پذیر تھا۔ ۱۹۹۶ء میں مختصر علالت کے بعد واہ چھاؤنی میں وصال ہوا اور ان کے آبائی چک میں انہیں دفن کیا گیا ۔ان کے دادا سید چراغ علی صاحب اور علامہ اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد کے پیر بھائی تھے۔

۵۔ ضلع لدھیانہ کے قریب بھارت میں واقع ریاست۔ علامہ اقبال کے سسر ڈاکٹر عطا محمد خاب صاحب اس ریاست میں بطور میڈیکل آفیسر متعین تھے۔ اب بھی یہاں اقبال میموریل ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے اور محمد کفائت اللہ صاحب اس کے سیکرٹری ہیں۔ علامہ اقبال میموریل ٹرسٹ عصمت منزل مالیر کوٹلہ پتہ ہے۔

۶۔ علامہ اقبال کی پہلوٹھی بیٹی جو ۱۸۹۵ء میں پنڈ دادن خان میں پیدا ہوئیں اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں سیالکوٹ میں انتقال فرماگئیں۔ اور اپنی دادی کے پہلو میں امام صاحب قبرستان سیالکوٹ میں دفن ہیں۔

۷۔ علاؤالدین خالد مالک اردو اکیڈمی سندھ کے سگے چچا اور اردو ادب میں ایک مایہ ناز انشاء پرداز و مترجم۔ بیسیوں کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ عظمت رفتہ ان کی

ایک بہترین کتاب ہے وہ کتابی دنیا کے مدیر رہے ہیں اور ۱۹۶۷ء میں کراچی میں انتقال فرما گئے۔

۸- دہلی کا ایک معیاری ادارہ۔ جہاں فلسفہ کی تدریس کا اعلیٰ انتظام تھا اور عثمانیہ یونیورسٹی کے خلیفہ عبدالحکیم بھی اس ادارے کے فارغ التحصیل تھے۔

باب سوئم

۱- معاصرین علامہ اقبال کی نظر میں عبداللہ قریشی (وحشت لکھنوی کے حالات زندگی)۔

۲- لاہور میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے ریاضی کیا ہے۔ پہلے یونیورسٹی میں ۱۹۰۷ء میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ بعد ازں اسلامیہ کالج لاہور کے ۱۹۴۴ء تک پرنسپل رہے۔ شعروشاعری سے بھی شغف تھا۔ انہوں نے گیتا کا اردو ترجمہ کیا۔ اور اروح القرآن کے نام سے سورہ تفسیر کی تفسیر کی۔ اس کے علاوہ ریاضی کی درسی کتابوں کے مصنف تھے۔

۳- ضلع گورداسپور کے آخری حدود میں واقع ہے اور ہندوستان کے لئے کشمیر میں داخل ہونے کا واحد راستہ ہے۔ اگر گورداس پور کا ضلع پاکستان میں شامل ہو جاتا تو مسئلہ کشمیر خود بخود حل ہو جاتا۔ بہر حال اللہ کی مصلحت میں کون دخل دے سکتا ہے۔

۴- بیگم سلمٰی تصدق حسن (علامہ کے دوست کی بیٹی اور مشہور مسلم لیگی رہنما) کے میاں آفتاب اقبال کے گہرے دوست تھے۔ شادی سے پہلے آفتاب اقبال صاحب ان کی کرائے کی کوٹھی کے ایک حصے میں رہائش پذیر تھے اور انہی محترمہ کی تگ ودو سے میرا رشتہ طے پایا تھا۔

کرنل خواجہ عبدالرشید: ۱۹۱۲ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ کنگ ایڈورڈ کالج لاہور سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا اور ملٹری میں ملازمت اختیار کر لی اور کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ ملٹری اتاشی کے طور پر بھی خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانے میں جناح اسپتال کے ڈائریکٹر تھے اور مجھے ان کے ہاتھ سے نرسنگ کورس کی تکمیل کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ مشفق خواجہ صاحب کے تایازاد بھائی تھے اور ان کو ادب سے شغف تھا اور فارسی ادب کے اچھے چھناور تھے اور انہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ نہایت ہی علمی گھرانے سے واسطہ رکھتے تھے۔

حواشی

آفتاب اقبال اور ان کے برادران نسبتی و خواہران نسبتی

ڈاکٹر سی مارٹن: میرے والد گرامی کے گہرے دوست تھے۔ حبشہ سے بچپن میں ہندوستان آگئے اور ان کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔ اس زمانے میں ہندوستان کے سات صوبے تھے اور برما بھی ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔ حبشہ کے بادشاہ ہیل سلاسی سے ان کی قرابت داری تھی اور بادشاہ نے اپنے عزیز ڈاکٹر سی مارٹن کو وزیر اعظم کا عہدہ تفویض کرنے کے لئے حبشہ کے دارالحکومت عدیس ابابا بلا بھیجا۔ تھوڑے دنوں بعد ڈاکٹر صاحب نے والد گرامی کو بھی حبشہ میں آنے کی دعوت دی۔ حبشہ جانے کے بعد ہمارا گھرانہ اپنے وطن مالوف لوٹ آیا۔ حبشہ میں والد گرامی کو سلطان کے دربار میں شرف باریابی حاصل تھا اور والد گرامی کو ٹھیکوں سے کافی مال و دولت ہاتھ لگا لیکن اچانک

حبشہ پر لشکر کشی ہوئی اور افراتفری کے عالم میں اپنی دولت کا عشر عشیر بھی اپنے ہمراہ نہ لا سکے۔

احمد بیگ صاحب: میرے چھوٹے چچا تھے۔ محمود نظامی انہی کے فرزند ارجمند تھے۔ داداجان کے انتقال کے بعد میری والدہ محترمہ اور بھائی افضل کے ساتھ برما گئے اور پھر وہیں میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور کافی پیسہ کمایا لیکن اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد ان کا دل برما کی سرزمین سے اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس اپنے وطن مالوف لوٹ آگئے۔

چچا نے عقد ثانی کیا تو ان کی زوجہ ارشاد بیگم کے بطن سے مرزا مسعود بیگ پیدا ہوئے اور یوں مرزا مسعود بیگ، محمود نظامی کے چھوٹے بھائی اور میرے اکیلے بھوئی تھے۔

محمود نظامی: میرے چچازاد بھائی تھے۔ علامہ اقبال کے دوست سر مرزا جلال الدین کے نواسے تھے "ہمارے اہل قلم" کے مرتب کے مطابق ۱۹۱۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کے صحبت یافتہ نوجوان ادیب ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر کے چہیتے شاگرد تھے اور یوں انہیں اپنے استاد گرامی سے اقبال شناسی کا جوہر ہاتھ لگا اور انہوں نے اپنی مختصر ادبی زندگی میں تین کتابیں ترتیب دیں۔ ملفوظات اقبال، نظر نامہ اور خطوط بنام عزیزم۔

۱۹۴۵ء میں آل انڈیا ریڈیو سے ملازمت کا آغاز کیا اور پاکستان کی تشکیل کے بعد

ضیاء جالندھری: جالندھر کی مردم خیز سرزمین میں ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا اسم گرامی سید نثار احمد ہے اور سادات گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعروشاعری سے خاص لگاؤ تھا جناب حفیظ جالندھری بھی ان کے ہم عصر تھے۔ چونکہ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا لہذا انہیں اسی سال آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ ریڈیو کے شعبہ نشرواشاعت سے وابستہ رہے۔ پھر کئی کلیدی عہدوں پر کام کرتے رہے اور آخر ۱۹۸۵ء میں پاکستان ٹیلی ویژن سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کے تین مجموعہ کلام سر شام ،ناری اور خواب سراب منظر عام پر آچکے ہیں۔ آج کل لاہور میں مقیم ہیں اور ایک اردو جریدے کی ادارت فرما رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے یار غار حمید نسیم صاحب چل بسے۔ حمید نسیم صاحب سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی۔

مسعود بیگ: میرے چچازاد بھائی تھے اور بعدہ میری چھوٹی ہمشیرہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ہمارے خاندان میں یہ ایک مثالی جوڑا گردانا جاتا تھا اور یگانوں اور بیگانوں سے ان کے تعلقات بڑے ہی عمدہ تھے۔ وہ انتہائی ایمان دار اور شریف النفس انسان تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میری ہمشیرہ مجیدہ کو بہت صدمہ پہنچا اور وہ لاہور میں بالکل خاموش زندگی بسر کر رہی تھیں کہ ان کے اکلوتے بیٹے آصف مسعود نے انہیں اپنے پاس امریکہ بلا بھیجا۔ گزشتہ ایک سال سے وہ امریکہ میں مقیم ہیں۔

لوح مزار کا سامنا حصّہ

اِنّ مِنَ الشّعرِ الحِکمَۃَ
واِنّ مِنَ البیاَنِ بسِحرًا

نہ افغانیم ونہ ترک و تتاریم
چمن زادیم وازیک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام ست
دما پرور دہ یک نو بہاریم
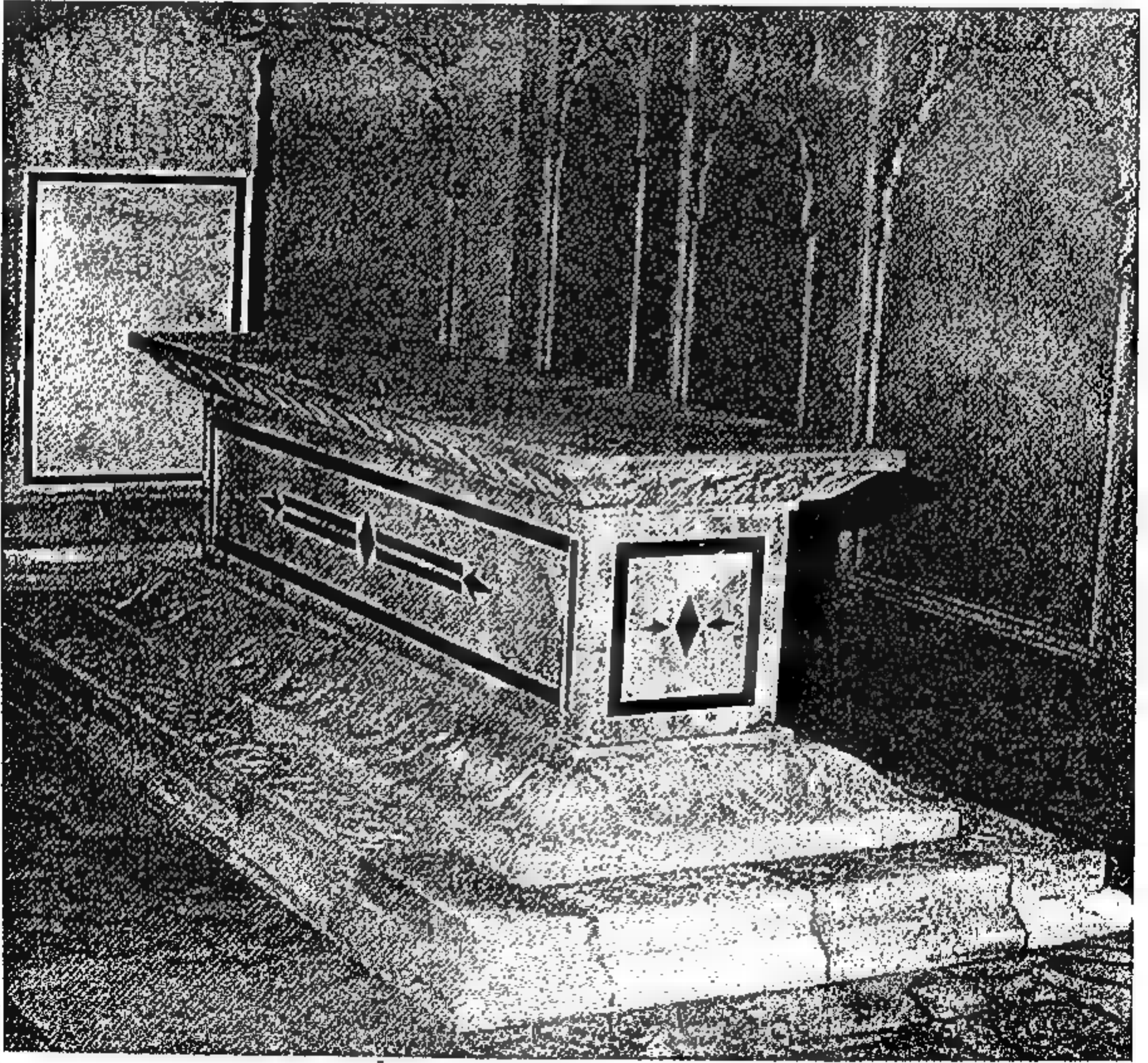
علامہؒ کے مزار کا کتبہ
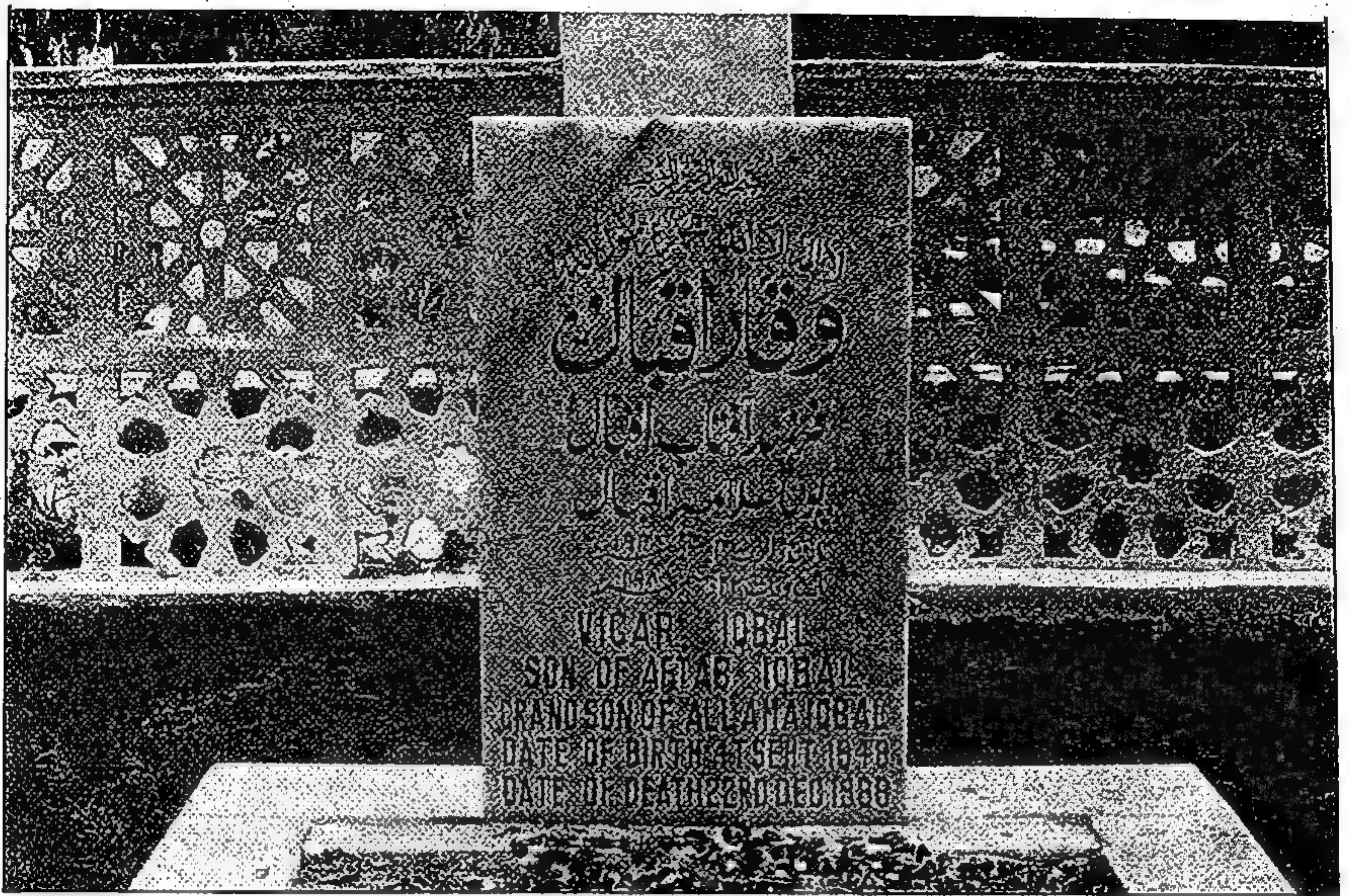
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَادْخُلِی فِی عِبَادِی ۝ وَادْخُلِی جَنَّتِی ۝

مرقد

کریم بی بی والدہ شیخ ظفر الحق

وفات

یکم جولائی ۱۹۵۸ بروز منگل ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط

پھوپھی کریم بی بی کی قبر کا کتبہ

علامہؒ کے والد کی قبر کا کتبہ
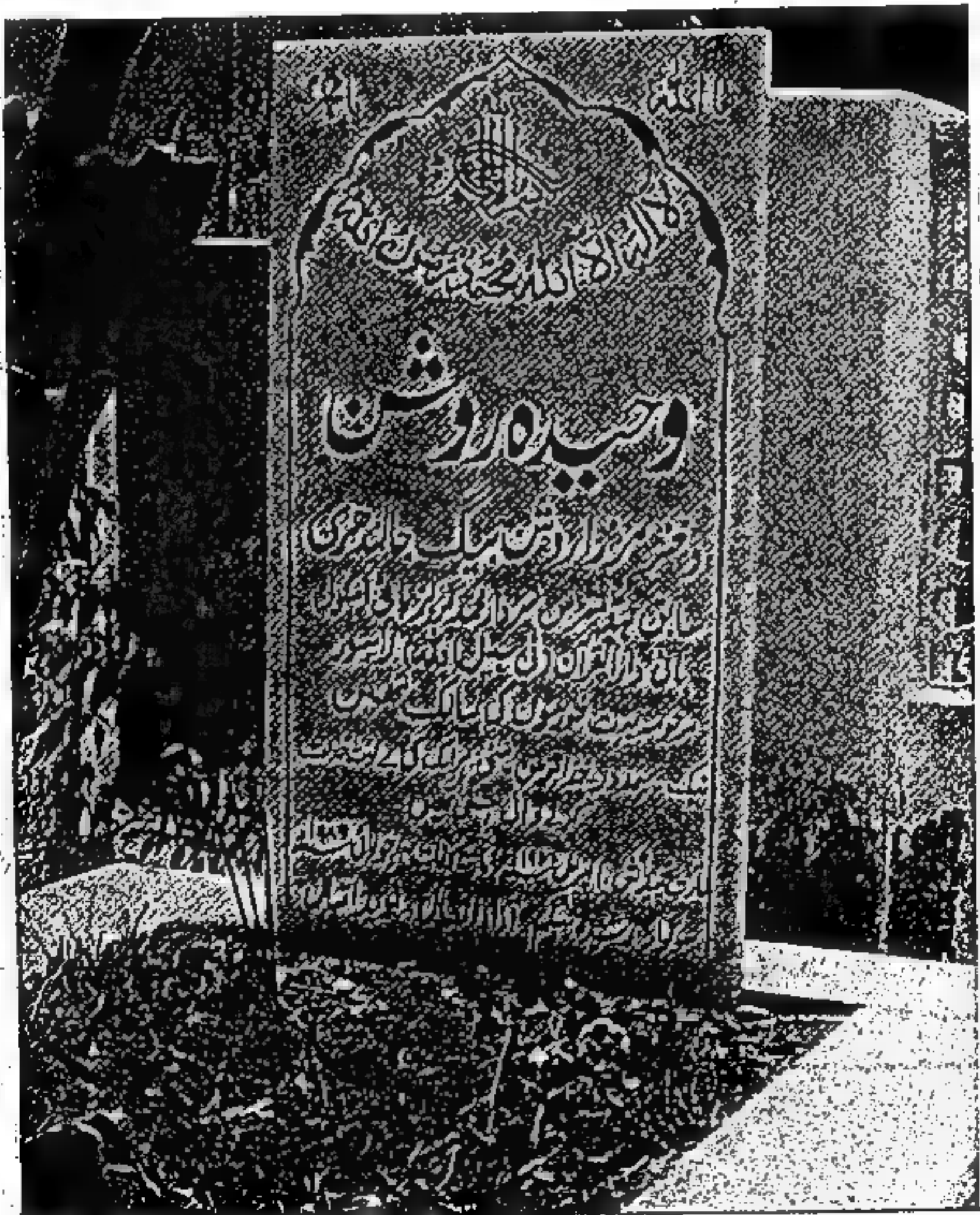
"یوم تکبیر"

دنیا کی تاریخ میں پاکستان غالباً واحد ملک ہے جسے نظریاتی بنیاد پر قائم کیا گیا۔ اہل ہنود کو اس کی تشکیل سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ بھارت نے تشکیل ملک کے پہلے مرحلہ پر ہی ایک بھرپور اقتصادی وار کیا جس کی کاری ضرب نوزائیدہ ملک سہہ نہیں سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے حیدرآباد کے نظام سابع حضرت میر عثمان علی خان صاحب کے بیس کروڑ کے گراں قدر عطیے سے اسے قائم رکھا ورنہ تین ماہ تک ملازمین کو تنخواہیں ادا نہ کی گئیں تو ملک کا وجود یقیناً خطرے میں پڑھ سکتا تھا۔ دشمن نے اس ملک کے ایک حصے کو توڑنے کی ناپاک کوشش کی اور آخر وہ کسی نہ کسی طرح اس مذموم منصوبے میں کامیاب رہا اور 1971ء میں مشرقی پاکستان کو جدا کردیا گیا۔

اب مئی 1998ء میں اس ملک کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے بھارت نے ایٹمی تجربات کرکے اپنے ملک کو جوہری توانائی کے میدان میں سبقت دلا کر اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہا لیکن پاکستانی سائنس دانوں کے بروقت جوابی ایٹمی تجربات سے بھارت اپنے منصوبے میں ناکام رہا۔

امسال 28 مئی 1999ء کو ہم "یوم تکبیر" کے نام سے منا رہے ہیں۔ میں نے اس بابرکت دن پر دشمنوں کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے ایک "قلمی ایٹمی دھماکہ" "علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال" کی صورت میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ علامہ اقبال کے خوابوں کے ملک کو زندہ و تابندہ رکھے۔ اور ایٹمی سائنسدانوں کے سامنے ملکی سلامتی کے لئے یہ شعر مشعل راہ ہو۔

کھلے ہیں سب کے لئے غریبوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!

دعاگو: بیگم رشیدہ آفتاب اقبال

یوم تکبیر

کے موقعہ پر لکھا

ملی ترانہ

دو کام اے عزیزو! کرنا وطن کی خاطر
جینا وطن کی خاطر مرنا وطن کی خاطر

جن سے ہو دل میں پیدا زندہ تمنا ایسی
باتوں پہ کان اپنے دھرنا وطن کی خاطر

نصرت خدا کی ہر دم ہمت کا ساتھ دے گی
ہرگز نہ دشمنوں سے ڈرنا وطن کی خاطر

اہل وطن! یہ رمزِ فیض وطن سمجھ لو
جو کچھ تمہیں ہو کرنا کرنا وطن کی خاطر

آسودگی تمہاری مرہون ہے وطن کی
دامن خوشی سے دل کا بھرنا وطن کی خاطر

دو کام اے عزیزو کرنا وطن کی خاطر
جینا وطن کی خاطر مرنا وطن کی خاطر

بیگم رشیدہ آفتاب اقبال

حرف آخر

اگر میں سید مظفر حسین برنی صاحب کی کتابوں کا خاص کر کلیات مکاتیب اقبال جلد اول و دوئم کا تذکرہ نہ کروں تو یہ بڑی بے انصافی ہو گی۔

مظفر حسین برنی صاحب نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اقبال پر بھی بہت کتابیں لکھی ہیں ایک کتاب "محب وطن اقبال" انہوں نے آزاد کو بھی بھیجی تھی۔

لیکن انہوں نے اپنی کتاب کلیات مکاتیب اقبال جس میں شاعر مشرق علامہ اقبال کے تمام اردو و انگریزی خطوط کا مجموعہ تاریخی ترتیب اور ضروری تعلیقات و حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ وہ قابل ستائش ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے قابل قدر ہے۔ جس سے ان کی اقبال سے گہری وابستگی اور اقبال کو سمجھنے کی قابلیت پائی جاتی ہے۔

"علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب" کی تحریر میں برنی صاحب کا بڑا ہاتھ ہے کیونکہ انہوں نے مجھے کتاب لکھنے کی تاکید کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے خاندان کے متعلق میں جو کچھ جانتی ہوں وہ اور لوگ نہیں جانتے کیونکہ اقبال کے انتقال کے وقت آفتاب کی عمر ۳۹ سال تھی اور جاوید کی ۱۲ سال۔ بچپن سے سیالکوٹ میں رہے۔ دادا، دادی، عزیز و اقارب، دوستوں و عزیزوں سے ملتے ملاتے تھے اور خاندان میں ددھیال میں پہلے پوتے اور ننھیال میں پہلے نواسے کی حیثیت ان کو حاصل تھی۔ دونوں خاندانوں کے نور نظر تھے۔

اب میں برنی صاحب سے ملاقات کا مختصر سا احوال بیان کرتی ہوں۔

۱۹ مارچ پیر ۱۹۹۰ء فون آیا۔ میں نے فون اٹھایا۔ کیونکہ ان دنوں میں بھی جدہ میں تھی اور آزاد فریدہ گھر پر نہیں تھے۔ آواز آئی۔ کیا یہ آزاد کا گھر ہے؟ میں نے جواب دیا جی ہاں۔ انہوں نے فرمایا میں آزاد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جواب دیا وہ دفتر

گئے ہوئے ہیں۔ آپ اپنا نام و فون نمبر بتا دیجئے۔ جب آزاد آئے گا بتا دوں گی انہوں نے سوال کیا آپ کون محترمہ بات کر رہی ہیں؟ میں نے بتایا کہ اس کی والدہ ہوں۔ یہ سننا تھا کہ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا پھر تو آپ کی زیارت بھی ہو جائے گی۔ پھر بتایا کہ میں مظفر حسین برنی بول رہا ہوں۔ ہم جدہ میں عمرہ کی غرض سے آئے ہیں۔ مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے اپنا فون نمبر مجھے لکھوا دیا۔

آزاد نے ان سے بات کی افطاری پر بلایا۔ اس دن تیسرا روزہ تھا۔ ۲۹ مارچ جمعرات ۱۹۹۰ء شام کو تشریف لائے۔ ان کی رفیقہ حیات اور ایک بیٹا بھی ساتھ تھے۔ ہم نے بھی دو چار ادبی شخصیات کو بلا لیا تھا۔

ہم سب بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملے۔ خوب باتیں ہوئیں۔ زیادہ تر اقبال اور آفتاب اور ان کے خاندان پر۔ مجھ سے انہوں نے بہت سے سوال کئے۔ مجھے بھی کافی معلومات تھیں۔ آفتاب اقبال مجھے سناتے رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی یادداشتوں کو محفوظ کر لوں۔ اگر لکھنے کی فرصت نہیں ہے تو کیسٹ پلیئر میں کیسٹ ڈال کر تیار رکھوں۔ جس وقت کچھ یاد آئے۔ فوراً کیسٹ میں بھر لوں۔ اس طرح سے ایک اثاثہ محفوظ ہو جائے گا۔ پھر کراچی آکر میں نے ایسا ہی کیا اور ۶ عدد کیسٹس میں نے اپنے لڑکوں کے لئے بھر دیں۔

وہ شام ایک یادگار شام تھی۔ انہوں نے بھی رخصت ہونے کے وقت کہا کہ یہ ہماری زندگی کی بہترین شام ہے ہم اس کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان کی بیگم صاحبہ سلجھی ہوئی شخصیت ہیں پھر انہوں نے فرمائش کی کہ آزاد انہیں شکوہ گا کر سنائے۔ ان کو معلوم تھا آزاد بڑے اچھے شاعر ہیں اور سنگیت سے بھی لگاؤ ہے۔ پھر آزاد نے چند بند سنائے۔ برنی صاحب نے آزاد کی گائیکی کو بہت سراہا۔

آخر میں ایک بات بتاتی چلوں کہ آزاد کی شاعری اور نظموں کو انہوں نے سب سے پہلے بھارت کے ادبی رسالوں میں شائع کروایا۔ شاعر رسالہ ۸۸ء اقبال نمبر میں آزاد کے متعلق بہت عمدہ مضمون لکھا اور چند ایک نظمیں بھی شائع کرائیں۔ اس کے بعد آزاد کو بھارت سے اکثر دعوت نامے آتے رہتے ہیں کہ وہ ان کے جلسوں میں شریک ہوں اور اپنا کلام سنائیں۔ آخر میں ان کے لئے دعا گو ہوں جہاں بھی ہوں خوش رہیں۔ جو کام انہوں نے اقبال پر کیا ہے انہیں ہدیہ تبریک پیش کرتی ہوں۔ بہت عرصے سے ہمارا ان سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے اور ہم ان کے حال سے بے خبر ہیں اور میں اب چراغ سحری ہوں۔ خدا حافظ ہی کہہ سکتی ہوں۔

جناب سید مظفر حسین برنی۔

جدہ میں جناب سید مظفر حسین برنی اور ان کی اہلیہ محترمہ آزاد اقبال کے گھر میں تشریف فرما ہیں۔

آفتاب اقبال صاحب اپنے اہل و عیال کے ہمراہ